

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

دلگداز تحریریں، زندگی کی تصویریں

READING SECTION
Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

پتی کہانیاں

September

2017

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆..... 'مسئلہ یہ ہے' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆..... سلسلے وارناول 'خانقاہ' اور 'نواب' بدیسی کہانی 'دی سنگل مین'

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

پتی کہانیاں

E-mail pearipublications@hotmail.com

بانس سپہام مرزا



مدیر اعلیٰ: منترہ سپہام

گروپ ایڈیٹر: ناصر رضا

مدیر: دانیال شیشی

رکن سال پاکستان نڈھو سپہام
رکن کلاس پاکستان نڈھو سپہام

MEMBER
APNS
CPNE

خط و کتابت کا پتہ: II-C-88 فرسٹ فلور گلخانہ جامی کراچی

ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے * جلد: 34 - شمارہ: 09 * ستمبر 2017

ایڈیٹر: پیلاشر: منترہ سپہام نے شی پریس سے چھپو آکر شائع کیا۔

ہر جلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے ہر جہاں ماہنامہ ڈیفنڈ اور جی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بین ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ڈراما، ڈرامائی ٹیلی ویژن اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے منجانب سے تحریر یا اشاعت کے لیے ہرگز کوئی معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

فیجر مارکیٹنگ

زین شی

0331-8221212

فیجر سرکولیشن

آفتاب عالم

0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر

منڈو اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

ایوب بن حبیب

20

منہ خ

احوال

08

ناصر رضا

پہلے تو لو پھر بولو

07

منزہ سہام

اپنی جاں نذاکروں

53

حامد حسین

گلزارِ ابراہیمی

47

محمد شریف

کھلا ہے بابِ رحمت

42

سید فراہان

وائے مقدر

78

ابو سعید آزاد

سسکتے ہے ارمان

73

حسین خواجہ

تفسیر آشیانہ

59

سید زہرا رضا

دیر آئے رست آئے

90

مستاز احمد

محبت جل گئی تھی

85

نوشتین آراء

نیلگون

82

سید عاتق کاشف

عذاب یوں آیا

108

مجید احمد جانی

انجا تو یہی ہونا تھا

104

عبدالغفار عابد

قسمت کی لکیریں

96

رضوانہ آفتاب



چار غلے اندھیرا

112

نازیہ بتول رضا

عبرت کا نشان

116

سمیر پرویز ہولو

129 کس سے فریاد کریں
123 کاہے کو دنیا میں آئی
119 رخصتی

141 وہ میری سہیلی
137 حاصل لا حاصل
132 روح کا انتقام

171 سر پرانز
164 کچا گھڑا
144 نواب

205 آپ کی ڈائری
182 خانقاہ
176 ڈسٹ بن

230 سفر کہانی
225 شعر کہانی
215 مسئلہ یہ ہے

248 سنگنل مین
236 شبانہ عظمی
234 سچی کہانیاں کی دنیا



’پہلے تو لو پھر بولو‘

زبان کا دارتلواری کے وار سے زیادہ کاٹ دار اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔

بڑوں سے سنا سمجھنے کی عمر سے پہلے پلو میں باندھا اور پھر ساری زندگی اس پر عمل کرنے کی کوشش کی کہ چاہے کسی کی کوئی بات کتنی بری لگے رویے کتنے دکھ دیں بس ایک چپ ہی سادھے رکھنی ہے اور اگر صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تب بھی الفاظ لہجہ اور زبان قابو میں ہی رکھتے ہیں کیونکہ اس کا حکم میرے نبی ﷺ نے بھی دیا..... پاکستان ایک مٹھی کی مانند ہے اور اس بند مٹھی کو گھونہ چھاروں صوبے مل کر بناتے ہیں۔ دشمن اسی لیے چاہنے کے باوجود بھی زبانی گولہ باری کے علاوہ کچھ نہیں کر سکا..... اس ملک میں بسنے والے چاہے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں سب پاکستانی ہیں اور کسی کو حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ ثابت کریں کہ آپ پاکستانی ہیں..... اور خاص کر ان لوگوں سے کہنا کہ بتاؤ کہ تم پاکستانی ہو بھی یا نہیں جن کی قربانیوں کی وجہ سے پاکستان معرض وجود میں آیا۔ بالکل ایسا ہی ہے جیسے باپ سے پوچھا جائے کہ ثابت کرو کہ گود میں بیٹھا یہ بچہ تمہاری ہی اولاد ہے..... شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ پہلے تو لو پھر بولو.....

عجب جنون مسافت میں گھر سے نکلا تھا
 خبر نہیں ہے کہ سورج کدھر سے نکلا تھا
 یہ کون پھر سے انہی راستوں میں چھوڑ گیا
 ابھی ابھی تو عذاب سفر سے نکلا تھا

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

محترم احوالی دوستو! سلامت باشد! آپ سے وعدے کے مطابق آپ کی آراء کی روشنی میں سچی کہانیاں کا شمارہ ستمبر 2017ء بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ آپ کے پیش خدمت ہے، سپام مرزا صاحب اور شمیم نوید مرحوم نے سچی کہانیاں کے آغاز میں کہانیوں کی سرخیوں کے ساتھ شعر والا جو ٹیکٹا اور منفرد انداز دیا تھا وہ دوبارہ اپنایا گیا ہے، تاریخی کہانی، سچی کہانیاں کا مقبول سلسلہ تھا، اس کا بھی دوبارہ آغاز ہو رہا ہے، ماضی میں آپ کا نہایت ہی پسندیدہ سلسلہ 'آپ کی ڈائری' بھی دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہماری پوری کوشش ہے کہ سچی کہانیاں آپ کی پسند آراء اور معیار کے مطابق مرتب کیا جائے ان تبدیلیوں کے ساتھ آپ کو شمارہ ستمبر کیسا لگا؟ آپ کے تبصرے اور آراء کا انتظار رہے گا۔ اور اب سچی کہانیاں کی دیرینہ دوست مقبول و معروف شاعرہ اور کہانی کا زور کا شکر کے اس نہایت ہی اعلیٰ شعر کے ساتھ آغاز احوال.....

مجھ کو دیارِ عشق میں رہنا ہے عمر بھر
صاحب یہ دشت تو مری اپنی خرید ہے

☆ یہ سب سے پہلا خط ہے کراچی سے، سچی کہانیاں کی بہت ہی بہترین لکھاری، مقبول و کامیاب ناول 'ناشون' جن کی شناخت بن گیا، شازی سعید معقل کا..... ناصر بھائی! آداب! آپ نے تو بتایا نہیں ہماری لکھاری دوست شمیم سکینہ صدف کے ذریعے آپ کی ادارہ سچی کہانیاں میں دوبارہ آمد کا علم ہوا، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی آپ کو بہت مبارک ہو، اس خوشی میں میں آپ کو اور سچی کہانیاں کو ایک بہت اچھا تحفہ دینا چاہ رہی ہوں، یہ تحفہ کیا ہے، اس کے لیے آپ کو مجھ سے رابطہ کرنا ہوگا، اب اجازت آئندہ ماہ شمارے پر عمل تبصرے کے ساتھ حاضری ہوگی۔

کے شازی بیٹا! تمہارا موبائل نمبر مس ہو گیا تھا، اس لیے ادارے میں واپسی کی اطلاع تمہیں نہ دے سکا، بہر حال، بہن شمیم سکینہ صدف کا بہت شکریہ کہ انہوں نے ہماری جہرم تک پہنچائی، اور رہی بات تمہارے گفٹ کی تو میں تم سے رابطہ کرنے سے پہلے یہ بات یقین سے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے اور سچی کہانیاں کے لیے تمہارا یہ گفٹ تمہاری کوئی نئی تحریر، کہانی یا ناول ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟

☆ یہ دوسرا خط ہے، حیدرآباد سے سید سرور ندیم کا ہے، لکھتے ہیں۔ آپ کا ارسال کیا شمارہ اگست موصول ہوا، اس نوازش کے لیے شکریہ، اس شمارے کی سب سے اچھی بات ماہ اگست یوم آزادی کے حوالے سے خصوصی تحریر کی اشاعت ہے، ایک زمانے میں خاص دنوں اور ماہ وغیرہ کے حوالے سے کہانیوں کی اشاعت سچی کہانیاں کا خاصا تھا، بعد میں نجانے کیوں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ سلیم اختر صاحب کی کہانی 'بازارِ عشق' کے کیا کہنے، واہ کہانی پڑھ کے حرا آ گیا، راجہ بازار کا جو انہوں نے لفظوں سے نقشہ بنایا ہے، اس کا

جواب نہیں آردی بہن کی زندگی کو بہت مختلف انداز میں تحریر کی شکل دی گئی ہے اچھی لگی۔ باقی تحریریں بہت اچھی اچھی، بہتر اور بس ٹھیک قسم کی رہیں۔ سائیں مولابخش چانڈیو کی زندگی کا خاکہ بھیجے میں کچھ تاخیر ہو رہی ہے معذرت خواہ ہوں اور وہ کہانی کی سرخی کے ساتھ شعر والی میری بات پر کچھ سوچا؟

بھائی سید سرور ندیم! آپ نے ہماری خاطر احوال کے لیے وقت نکال دیا کہ تمہاری باتیں، شکر یہ خاص دنوں کے حوالے سے خاص کہانی، سچی کہانیاں کا یہ خاصا سبب برقرار رہے گا بھائی سلیم نے واقعی کمال کہانی لکھی ہے چانڈیو صاحب کی زندگی والے خاکے کا انتظار رہے گا اور ہاں کہانی کی سرخی کے ساتھ شعر آپ کی بات پر صرف سوچا ہی نہیں زیر نظر شمارے سے عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ اور کوئی حکم؟

☆ سچی کہانیاں کے دیرینہ دوست لکھاری، فیضان حسین عثمانی حیدرآباد سے احوال میں شریک ہیں۔ محترم ناصر رضا بھائی السلام علیکم! آپ کی خیریت اپنے پروردگار سے نیک مطلوب چاہتا ہوں آپ کی سچی کہانیاں میں واپسی کی مبارکباد میں آپ کو سب سے پہلے بذریعہ فون دے چکا ہوں دوسرے فون پر آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں کہانی اور خط کے ساتھ فوراً حاضر ہو جاؤں تو میں آپ کے بلا دے پر حاضر خدمت ہوں۔ آپ کے آنے کے بعد بہت سے پرانے اور سینئر لکھاری بھی ضرور شامل احوال ہوں گے اور اپنی جاندار تحریروں سے سچی کہانیاں کو چار چاند لگائیں گے میں اپنی آمد کے ساتھ ساتھ اپنے پرانے لکھے والوں کو بھی کہہ رہا ہوں کہ وہ بھی ناصر بھائی کی آمد کے بعد خود بھی حاضر احوال ہو جائیں میرے بہت پیارے دوست اشعر جواد اور ہماری آپا صافیہ تو اگست کے شمارے میں انٹری دے چکے مگر ابھی اور بہت سوں کو آنا ہے۔ ارشد علی ارشد سرور شاد زویہ جہد عباس جاننا ز اور قابل قدر انکل فیہم (جو کہ نہ جانے کہاں پس منظر میں طے گئے ہیں) ناصر بھائی سچی کہانیاں سے میری بڑی طویل وابستگی ہے میں نے ہر دور کے ایڈیٹر کو دیکھا، ان کے لیے لکھا ان کی ادارت میں پرچہ پڑھا، چاہے وہ شیم نوید انکل ہوں یا دانش دیروی یا سلیم فاروقی یا سلیم آذر یا پھر پرویز بلگرامی ہوں۔ سب میرے لیے محترم اور قابل عزت ہیں میرے استاد ہیں۔

1989ء سے 2017ء بڑے طویل عرصہ سے دلی وابستگی ہے پرچے سے اور آپ سے آپ کی اپنائیت محبت اور چاہت کا احساس ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ آپ نے بھائیوں کی طرح جو میرا ہاتھ تھا ماما تو آج تک نہیں چھوڑا اور نہ کبھی چھوڑیں گے انشاء اللہ۔ آپ نے کہانی مانگی تھی میں کہانیاں لے کر آیا ہوں اب یہ آپ پر ہے کہ آپ ان کو کب اور کس طرح پرچے کی زینت بناتے ہیں۔ کیونکہ ہم تو پرچے کو اپنے مطالعہ میں مسلسل رکھے ہوئے ہیں۔ پرچے میں حاضر نہیں تھے تو کیا ہوا، پرچہ پڑھ ضرور رہے تھے، دکھ اس بات کا ہے کہ اس پرچے میں ایسے نام دہنہا لکھاری بھی شامل ہونے لگے ہیں جو اپنی ذاتی حسد، بغض اور جلن کو کہانیوں کا نام دے کر اپنے ہی لوگوں پر بہتان لگا کر ان کی کردار کشی کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے اور عقل دے آمین۔ ناصر بھائی! آج کل ہر کوئی ایک دوسرے پر پچھڑا اچھالنے میں ماہر ہو چکا ہے مگر یہ نہیں سوچ رہا کہ کہیں ایسا نہ کہ میری اچھالی ہوئی پچھڑا کر پلٹ کر میرے اوپر آگئی تو کیا ہوگا، آج کل ہر کوئی مظلوم بن کر دوسرے کو ظالم ظاہر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ جبکہ یہ سوچے بنا کہ اگر کسی مظلوم نے سچ میں مجھے ظالم بنا کر پیش کر دیا تو کیا ہوگا، جس کو دیکھو وہ کہہ رہا ہے کہ ہمارے معاملات اللہ دیکھ رہا ہے، ہم نے اللہ پر چھوڑ دیا ہے، عقل سے پیدل اور نادان لوگوں کو یہ نہیں پتہ اللہ تو سب کے معاملات دیکھ رہا ہے سب نے اللہ پر چھوڑ رکھا ہے ہر کام ہر معاملہ کون صحیح کون غلط یہ وہ ضرور دکھا دیتا ہے۔ آج کل لوگوں کو ان کے کیے کا صلہ اللہ پاک دنیا میں ہی دکھا کر دے دیتا ہے کہیں اولاد کا برا کیا، ماں باپ کے آگے آ رہا ہے کہیں ماں

باب کا کیا اولاد بھگت رہی ہے تو کہیں بہن بھائی کا برا دوسرے بہن بھائی کے ساتھ آ رہا ہے مگر لوگ آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہیں اللہ سے توبہ یا معافی نہیں مانگ رہے بس اللہ پاک سب کو ہدایت عطا کرے آمین۔

بھائی فیضان حسین عثمانی! آپ کی احوال میں آمد سے دل شاد ہوا! آپ نے اپنے خط میں جو لکھا ہے ہمیں اس سے سو فیصدی اتفاق ہے۔ ہم دل سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ سب کو نیک ہدایت دے سب پر اپنا کرم فرمائے۔

☆ معروف لکھاری سیمیں غزالہ نہاں! کراچی سے احوال میں شریک ہیں۔ ناصر صاحب! السلام علیکم! امید ہے خیریت ہوگی! پہلے تو میں آپ کو واپس آنے کی مبارکباد دے دوں! پھر آپ کا شکر یہ بھی ادا کروں کہ آپ نے مجھے اتنی اہمیت دی کہ میری جج کی دوداد کو شرف قبولیت بخش رہے ہیں۔ اس تحریر میں اپنی کچھ ذاتی باتیں بھی لکھی کہانیاں سے شیئر کی ہیں۔ اس لیے کہ سچی کہانیاں میں سب سچ ہی ہوتا ہے۔ اور تمام علم اور قارئین اپنے لگتے ہیں اور ویسے بھی میری کہانیاں سچی ہوتی ہیں۔ میری ایک اور کہانی قدرت کے فیصلے بھی سچی کہانیاں کو بھیجی تھی۔ وہ بھی بالکل سچی ہے اور میری دوست کے بھائی کی بیٹی کا واقعہ ہے۔ اس کو بھی دیکھ بیچے گا مہربانی ہوگی۔ پراسرار نمبر کے کہانی بھی جلدی شیئر دوں گی۔ یہ پراسرار تو ہے مگر خوفناک نہیں پسند آئے تو شائع کر دیجیے گا شکر یہ۔

☆ سیمیں غزالہ نہاں صاحبہ! آپ کو بھلا ہم اہمیت کیوں نہیں دیں گے! آپ ہماری بہت ہی اچھی لکھاری ہیں آپ نے جج کی روداد تو بہت ہی کمال لکھی ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ تمام قارئین کو بھی پسند آئے گی۔ البتہ ”قدرت کے فیصلے“ ہم تک نہیں پہنچی ہے ریکارڈ کے لیے اگر کاپی محفوظ کی ہو تو دوبارہ ارسال کر دیں! ہم دلی طور پر آپ کے شکر گزار ہوں گے۔

☆ ہماری سینئر لکھاری مسز نگہت غفار کراچی سے احوال میں شریک ہیں۔ قابل احترام محترم ناصر بھائی! السلام علیکم! سلامت رہیں بڑے دنوں کے بعد جب مجھے علم ہوا کہ آپ سچی کہانیاں میں لوٹ آئے ہیں بڑی خوشی ہوئی! میں نے ایک کہانی تیار کر لی تھی اب ارسال کر رہی ہوں اس امید و توقع کے ساتھ کہ ناامیدی نہیں ہوگی۔ اس ماہ کی سچی کہانیاں نہیں پڑھ سکی اس وجہ سے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں لیکن انشاء اللہ تعالیٰ اگلے ماہ میں زندگی باقی رہی تو ضرور شرکت کروں گی ورنہ آپ کو یہ خط میری بات یاد دلا دے گا۔ اس مختصر خط کے ساتھ اجازت چاہوں گی اگلے ماہ آپ کا زیادہ وقت لوں گی۔

☆ میری اچھی بہن مسز نگہت غفار صاحبہ! اللہ آپ کو صحت کے ساتھ زندگی دے! آپ کی تحریر جلد سچی کہانیاں کی زینت ہوگی۔ آئندہ ماہ کہانیاں پرتبصرے کے ساتھ احوال میں آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

☆ شیخ معظم الہی لاہور سے شامل احوال ہوئے ہیں۔ ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! پراسرار نمبر کے لیے دو کہانیاں ارسال کر رہا ہوں۔ ان میں سے جو بھی زیادہ اچھی کہانی ہو اسے شائع کرادیں۔ اگر ان میں کوئی غلطی وغیرہ ہو تو آپ ان کی نوک پلک کر سکتے ہیں۔ اللہ پاک آپ کا حامی و ناصر ہو۔ اس کے علاوہ میرے حوالے سے یہ دوددکھی خبریں بھی ہیں برائے کرم انہیں احوال میں شائع کر دیں۔ بہت افسوس ناک خبر یہ ہے کہ میرے بڑے بھائی جناب شیخ شوکت الہی طویل علالت کے بعد گزشتہ دنوں وفات پا گئے ہیں۔ میں سب لکھاریوں اور احوالیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے بڑے بھائی کے لیے دعائے مغفرت کر دیں۔

’سچی کہانیاں‘ میں ایک نہایت ہی مقبول کامیاب

ترین سلسلے وار ناول **تاشن** کے بعد

معروف و مقبول کہانی کار شازلی سعید مغل ایک نیا

تہلکہ خیز سلسلے وار ناول لے کر آ رہی ہیں۔

”**التاس**“ سحر و اسرار کا ایک ایسا نوکھا

سلسلہ جو آپ نے آج تک پڑھا نہیں ہوگا۔ یہ

ہمارا صرف ایک دعویٰ ہی نہیں یقین بھی ہے.....!

بس ذرا انتظار کیجیے

’سچی کہانیاں‘ کے پُر اسرار نمبر شمارہ اکتوبر

2017ء سے ”**التاس**“ کا آغاز ہوگا.....!

ایک بہت ہی خاص، منفرد موضوع پر سلسلے وار ناول، معروف لکھاری
 ”روشنائے سبعین مہاروی“ کے ہفت رنگ قلم سے



نام اور دیگر تفصیلات کے لیے

پس ذرا سا انتظار کر لیں جیسے.....!

میرے بہنوئی جناب شیخ غضنفر علی بہت طویل ہیں اُن کے شانے کا آپریشن ہونے والا ہے۔ اُن کے لیے دعائے صحت کی درخواست ہے۔
 کچھ بھائی شیخ معظم الہی! ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور آپ کے بڑے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کے ساتھ آپ کے بہنوئی کی مکمل صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔
 ☆ بارش علی شریک چوہے والا سے احوال میں تشریف لائے ہیں۔ ناصر صاحب! آداب! اچھ اگرست کی صبح کچی کہانیاں ملا جسے دیکھ کر دل غنچے کی طرح کھلا سرورق والی حسینہ تو جان لیوے۔ پانچ منٹ تو مجھے سرورق پر ہی لگ گئے کیونکہ چہرا بھی تو ایک مکمل کتاب ہوتا ہے نا بھی مطالعے پر نا تم تو لگتا ہے میڈم منہ صاحبہ کا ادارہ یہ شکر اُن سے یہ احساس دلوا یا کہ میں تو بہت ہی نا شکر ابدہ ہوں۔ ضمیر نے تھوڑی ملامت تو کی پر اب تھوڑی ملامت سے اپنا کچھ نہیں بنتا۔ جب احوال میں پہنچا تو پتا چلا اس بار تو بہت سے بار دوست غائب ہیں صفیہ سلطانہ آپ کوچ کی سعادت بہت بہت مبارک ہو عبد الغفار عابد نے لا جواب شعر لکھا ہے افضل خان کی پسند گزار جی کی آزاد نظم بھی اچھی تھی۔ باقی تمبرے مختصر تھے، بر خوب رہے۔ کہانیاں ویسے تو سبھی اچھی تھیں۔ پر مجھے نوہرہ جرت بہت پسند آئی ہے اس کے علاوہ بازار عشق اور تم میری ہوز بردست رہیں ویسے تمبرہ تو مجھے بالکل بھی نہیں کرنا آتا بس چند لائنیں لکھ کر ارسال کر رہا ہوں امید ہے کہ احوال کی رونق کو دو بالا کریں گی۔

کچھ بارش علی شریک صاحب! سرورق آپ کو پسند آیا، شکر یہ اور آپ جیسا ضمیر اگر ہمارے

سیاستدانوں کا بھی ہو جائے تو پاکستان واقعی پاکستان بن جائے آئندہ بھی احوال میں آپ کا چند کے ساتھ نہیں، کافی زیادہ لائٹوں کے ساتھ انتظار رہے گا۔

☆ علی اصغر الانصاری احوال کے لیے لکھتے ہیں۔ ناصر صاحب! پہلے تو ویلکم بیک، سر ہنستے مسکراتے رہیں، جناب عبدالغفار عابد صاحب سے آپ کی علالت کا پتا چلا، میں آپ کی کامل صحت کے لیے دعا گو ہوں، شمارہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی لیٹ ملا، آپ نے صفحہ نمبر تیرہ پر رائے مانگی ہے جس جی اگر ماضی والے پرانے سلسلے شروع ہو جائیں تو اچھا ہے۔ مثلاً تاریخ کہانی آپ کی ڈائری اس ماہ کا شاعر وغیرہ ناصر صاحب مجھے پتا ہے کہ آپ جو بھی سلسلہ شروع کریں گے وہ یقیناً اچھا ہی ہوگا واپس میرا ذاتی ووٹ خیال آرائی کے لیے ہے، کیونکہ یہ ماضی کا بہت مقبول سلسلہ تھا اور کوئی اور جریدہ یہ موقع فراہم نہیں کر رہا، جس میں قاری اپنی سوچ کا اظہار کر سکے، اس سے لوگوں کی منفرد سوچ کا پتا چلتا ہے، تمام بہن بھائیوں کے تمبرے بہت اعلیٰ تھے۔ سلطانہ آ پاکوج کی بہت بہت مبارکباد افضل خان کی منتخب کی گئی، نظم دل کو بھاگی، کہانیاں ابھی بڑھی نہیں لہذا تمبرہ ابھی نہیں کر سکتا، مسئلہ یہ ہے والے بابا جی کے لیے بہت سی دعائیں اور ان سے دعا کے لیے پڑھو اور اپیل بابا جی بہت اچھا کام سرانجام دے رہے ہیں۔

☆ بھائی علی اصغر الانصاری ازیر نظر شمارے سے بہت سی تہدیلیاں کی جا رہی ہیں، ان میں آپ کی ڈائری بھی شامل ہے۔ جس کا حصہ 'خیال آرائی' بھی ہوگی۔ بابا جی واقعی بہت اچھا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ کے لیے دعا کا پیغام ان تک پہنچ گیا ہے، ویسے تو وہ تمام قارئین کے لیے ہمیشہ ہی دعا گو رہتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر فرمان علی، بمبئی، منڈی صادق منج سے احوال میں تشریف لائے ہیں۔ محترم بھائی ناصر رضا شکر اللہ، کہ آپ سچی کہانیاں میں واپس آ گئے ہیں۔ یہ کہاں ہماری قسمت کے وصال یار ہوتا، اگر اور جیتے تو یہی انتظار ہوتا۔ سرورق لاجواب ہے۔ شمارہ اگست کا ماہ آزادی سب کو مبارک ہو، شکرانہ پر منظرہ صاحبہ کا شکر، یہ سید سرور ندیم کے خاکے کا مجھے انتظار رہے گا، صفیہ سلطانہ صاحبہ کو ج مبارک ہو، ناصر بھائی کی کامل صحت کے لیے آپ نے وہاں ضرور دعا کرنی ہے، روضانے سبحین، پرویز احمد دولو، اسما غفور، اور افضل خان آپ سب احباب کے خطوط پسند آئے، عبدالغفار عابد کا شعر لاجواب تھا زندگی رہی تو آئندہ ماہ کہانیوں پر تفصیلی تمبرہ کروں گا اس شعر کے ساتھ اجازت دیں۔

☆ ڈاکٹر صاحب! اتنی زیادہ تعریف بندے کا دماغ خراب کر دیتی ہے، سو ناچیز پر رحم کریں۔ آئندہ ماہ شمارے پر آپ کے تفصیلی تمبرے کا انتظار رہے گا۔ شعر کا خیال اچھا ہے، یہ ہے کس کا؟

☆ رفعت شبنم کی احوال میں بہاولپور سے آمد ہوئی ہے۔ ناصر انکل آداب، کیا حال ہے آپ کا مزاج کیسا ہے امید کرتی ہوں سب ٹھیک ٹھاک اور خیر و عافیت سے چل رہا ہوگا، ایک لمبے عرصے بعد اچانک آپ کی واپسی کسی سر پرانے سے کم نہیں، مجھے تو جیسے ہی آپ کی واپسی کا پتا چلا فوراً قلم اٹھالیا، ویسے تو میں خود ہی ایک لمبے عرصے سے احوال میں غیر حاضر ہوں، لیکن پھر بھی اس بار مجھے محفل میں حاضر ہونے سے روکا گیا پتا نہیں کیوں؟ آپ کی واپسی کے بعد سچی کہانیاں کا پہلا شمارہ دیکھا، احوال میں اہل ادب کے خطوط محفل کو چار چاند لگا رہے تھے، آپ صفیہ سلطانہ کو ج کی بہت بہت مبارکباد یاد روضانے سبحین اب تو ناصر انکل واپس آ گئے ہیں، آپ کی حاضری یقینی ہوگی ناہر ماہ؟ بھائی عبدالغفار

جادو آپ کے شعر نے بہت کچھ کہہ دیا، آپ اتنے باغی کیوں ہو؟ آپ کے جواب کی منتظر ہوں گی، افضل خان، اشعر جو اسید سرور ندیم کے خطوط بہت اچھے تھے، کہانی نوبہ جو حیرت انگیز آزادی کے موعظ پر بہترین رہی، روپ، بہرہ، موجودہ دور پر مبنی مٹی، ایسا بھی ہوتا ہے آج کے دور پر سو فیصد سچی کہانی ہے ایسا اکثر جگہ پر دیکھا گیا ہے۔ تم مقدر ٹھہرے ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جب مان ٹوٹتا ہے تو انسان اندر سے مرجاتا ہے، اٹکل سچی کہانیاں میں تحریر شائع ہونے کے لیے اب کیا شرائط ہیں کیونکہ پہلے تو نون لیگ کی طرح اپنے بندوں کو ہی نواز جاتا تھا، اس سے پہلے میں نے ادارے کو کہانی ارسال کی تھی شائع کرنا تو دور کی بات مجھے تو کسی نے یہ بھی بتانا ضرور نہیں سمجھا کہ یہ قابل اشاعت ہے یا پھر ناقابل اشاعت، اٹکل اگر آپ عجیب واقعات کے نام سے کوئی سلسلہ شروع کر دیں تو کیا یہ بات ہو، آپ کے کہنے پر میں نے اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے اب آپ کے جواب کی طالب ہوں۔

مکہ رفعت شبنم! ہمارے مزاج ٹھیک ہیں اور سچی کہانیاں کا کام خیر و عافیت سے چل رہا ہے۔ پلیز ذرا یہ تو بتاؤ، آپ کو احوال کی محفل میں آنے سے کس نے روکا؟ سچی کہانیاں میں تحریر شائع ہونے کی صرف ایک شرط ہے، اچھی تحریر اپنی کہانی دوبارہ ارسال کر دو، عجیب واقعات کے حوالے سے تمہاری تجویز اچھی ہے۔ اس سلسلے میں پہلی تحریر آپ خود روانہ کر دو تو اچھا رہے گا۔

☆ خواجہ حسین مبین آباد سے تشریف لائے مگر می ناصر رضا صاحب السلام علیکم ایہ 2007ء کی بات ہے ایک روز مشہور لکھاری سرور شاز صاحب کی لائبریری پر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں میری نظر سچی کہانیاں پر پڑی تو لفظ سچی کہانیاں نے بہت متاثر کیا، اور میں نے فوراً شمارہ خرید لیا، اس رسالے کے ساتھ یہ میرا پہلا تعارف تھا، اس سے پہلے میں نے اپنی والدہ صاحبہ (جو کہ حال ہی میں وفات پا گئی ہیں) کو رسالے پڑھتے دیکھا تھا، میری والدہ صاحبہ کو مطالعے کا بہت شوق تھا، خیر تو میں عرض کر رہا تھا کہ زندگی میں پہلی بار میں نے رسالہ خریدا، جب رسالے کا مطالعہ شروع کیا تو اس امر کا اندازہ ہوا کہ سچی کہانیاں اپنی نوعیت کا انتہائی منفرد رسالہ ہے اور یہ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا، اس میں ہر وہ تحریر ہے جس کا مطالعہ ضروری ہے۔ خیر گزرتے وقت کے ساتھ سچی کہانیاں میں لکھنے کا بہت سُن چاہا، لیکن یہ ممکن نہ تھا، پھر ایک دن میں نے پسند اپنی اپنی میں ایک شعر بھیجا اور وہ رسالے کی زینت بنا، لیکن سوال تو خود کچھ لکھنے کا تھا اور شعر انتخاب کیا ہوا تھا۔ اور ظاہری سی بات ہے کہ پہلی مرتبہ بندہ قلم اٹھائے اور کہانی لکھ دے، تو کسی طور بھی ممکن نہیں، اور پھر پہلی بار لکھنے کا موقع بھی مجھے سچی کہانیاں نے ہی دیا اور میں نے 2011ء شمارہ ستمبر میں خیال آرائی سلسلے میں اپنی سوچ کو قلم بند کیا۔ اور پھر وقت کے ساتھ سچی کہانیاں کا یہ سفر جاری رہا، پھر بیچ میں ایسا دور بھی آیا کہ رسالے کا معیار کم ہو گیا بعض اوقات کچھ کہانیاں ایسی بھی شائع ہوئیں جن کا ادب کے ساتھ تعلق کم اور انٹرنیٹ کے ساتھ زیادہ ہوتا تھا، قابل احترام مائیں بہنیں اس ماہنامے کو بہت ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتی ہیں، اخلاقیات کو ملحوظ خاطر رکھنا ایڈیٹر صاحب کا کام ہے، خیر ماضی کو اب کیا یاد کرنا، یکم جنوری 2016ء سے میں مستقل محفل میں حاضر ہو رہا ہوں کئی دفعہ میری حوصلہ شکنی بھی ہوئی، لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری، چلیں گلے شکوے بہت ہونے مالک کا لاکھ کرم ہے کہ اب آپ لوٹ آئے ہیں، ماہ آزادی کا شمارہ بہت خوبصورت ہے۔ ناصر صاحب جو سلسلے آپ نے بند کر دیے ہیں بہت اچھا کیا، اور جو سلسلے آپ شروع کرنے جا رہے ہیں

مجھے اُن کا بہت انتظار ہے۔ خیال آرائی اگر دوبارہ شروع ہو جائے تو بات بن جائے۔ اور جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ نے احوال کا فونٹ ساز بڑھا دیا ہے جو کہ کمال ہی کر دیا ہے۔ ماہ آزادی کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے ادارہ ہی شکرانہ منزہ سپہام صاحبہ نے بہت گہرا نقطہ اٹھایا ہے یہاں ساری بات اپنی ذات کی تو آ جاتی ہے اس موقع پر مجھے رفیع الدین راز صاحب کا یہ شعر یاد آ رہا ہے

ہمارے عہد کے لوگوں کی آنکھیں غور سے دیکھو
ہجوم آرزو اتنا نہیں دہشت زیادہ ہے

سید سرور ندیم مختصر احوال کے ساتھ محفل میں پہلی نشست پر براجمان تھے۔ کہانی کی سرفی کے ساتھ شعر والی بات دل کو لگی، محترمہ پروفیسر صفیہ سلطانہ صاحبہ آپ کوچ کی بہت بہت مبارک باد جب تک آپ کو تبرک کا شمارہ ملے گا یقیناً آپ حج کی سعادت حاصل کر کے واپس آ چکی ہوں گی، میری والدہ صاحبہ کے لیے دعائے مغفرت کر دیں آپ کی شاعری کے مجموعے کا مجھے انتظار رہے گا، بھائی اشعر جواد آپ کا تبصرہ بہت شاندار ہے سلسلہ آپ کی ڈائری سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں، بہن روشانہ سبحان مہاروی آپ کے مختصر تبصرے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ابھی تک مصروف ہیں۔ بھائی پرویز احمد دولو، بہن اسماء غفور صاحبہ اور عثمان علی صاحب آپ احباب کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ بھائی عبدالغفار عابد صاحب آپ کا تبصرہ اپنی جگہ لیکن منتخب شعر کا جواب نہیں۔ احوال میں آخری خط بھائی افضل خان کا تھا مختصر تبصرہ پر خوب رہا۔ ناصر صاحب میں شروع سے ہی اختلافی باتوں سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن اس بار تو حد ہی ہو گئی بہت سے اہل ادب نے مجھے کچی کہانیاں سے بائیکاٹ کا حکم دیا وجہ صرف آپ ہیں کچھ لوگوں کو آپ کی آمد ہضم نہیں ہو رہی۔ کہانیوں میں پہلی کہانی نوریہ نو حیرت کدے بہت اچھی ہے۔ شاہدہ ذاکر کی تحریر عروج و زوال آج کے دور کا عکس لا جواب تحریر ہے۔ محترم بھائی شفاعت علی آپ نے آرڈی ممبران کے تعارف کو کہانی کی صورت میں بہت ہی اچھا رنگ دے دیا، جناب نجیب عمر صاحب بارش بہت عمدہ ترجمہ ہے۔ جن احباب کی کہانیوں پر تبصرہ نہیں کر سکا ان سے معذرت میں نے آپ کو ایک کہانی بنام سکتے ارمان ارسال کی تھی۔ اگر آپ اُس کی نوک پلک سنوار کر قابل اشاعت بنا دیں گے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ بس آخر میں دعا ہے مالک دو جہاں امت سلسلہ کا حامی و ناصر ہو، زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر حاضری ہوگی۔

بھائی عبدالغفار عابد چیچہ وطنی سے احوال میں شریک ہیں، محترم ناصر رضا السلام علیکم امید ہے آپ اور محفل احوال کے تمام ممبران خیریت سے ہوں گے۔ اُسٹ کا آزاد پچی کہانیاں پڑھا، پہلے کی نسبت فرق واضح تھا۔ معیار اور میرٹ کو اہمیت دی گئی اور اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا گیا۔ باجی منزہ سپہام بتا رہی تھیں کہ ہمیں ہر حال میں اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ایک نعمت کا شکر دوسری نعمت کا ذریعہ بنتا ہے۔ احوال میں پرانے ساتھیوں کی آمد شروع ہو چکی ہے۔ اس بار احوالیوں کی تعداد کم تھی پر تھی اصلی..... اشعر جواد سید سرور ندیم اور بھائی عثمان کی رائے سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ آپ کی ڈائری کا سلسلہ جلد شروع کیا جائے۔ مہر پرویز احمد دولو! آپ ادب سے بے خبر لوگوں کی منفی تنقید پر دل چھوٹا نہ کریں۔ شور کھلاڑی نہیں تماشائی کرتے ہیں۔ پروفیسر صفیہ سلطانہ فریضہ حج کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ سسٹرا اسماء غفور! آپ اس محفل میں اپنی حاضری یقینی بنائیں۔ پرچہ انشاء اللہ آپ کو معیاری ملے گا۔ ہر دلجو پر رائٹر محترم سلیم اختر کی تحریر بازار عشق لا جواب تحریر تھی اس شعر سے اس کی

وضاحت کرتا ہوں۔

آدی اک بار ہی محبت کرتا ہے
باقی ہوتی ہیں سب اس کو بھلانے کے لیے

مترجمہ باجی راحت و فراعچوت کی 'مجرم کون' پڑھی ایسے زاویے اور ایسے کردار ہی انسانیت کی توہین کرتے ہیں۔ جب انسان ہی شیطان بن جائے تو پھر شیطانیت جیت جاتی ہے۔ مرد عورت کو وہ حقوق دینے کے لیے تیار نہیں جو اسلام نے اُسے دیے ہیں۔ مکمل ناہید کی دھکوں کے سائے، جہانہ آفتاب کی 'غیرت کے نام پر' اُم عادل کی 'مظلوم کی آہ' اور عائشہ نور عا شاکی 'مہرباں یہ کیا کیا ٹوٹے پڑھ کر یقین ہو گیا کہ مرد کے اس معاشرے میں عورت کی ہر جگہ تذلیل ہوتی ہے۔ کوثر پروین اور عظمیٰ نسیم نے اپنی تحریروں میں ماں کی محبت کو موضوع بنایا۔ حساب دو اور دو چار کا نام ہے لیکن ماں کی مانتا ہر حساب مات کھا جاتا ہے۔ سلسلے وار ناول 'خافقہ' اور 'نواب' سسٹنس برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ امید کرتا ہوں نئی کہانیاں میں نئے شروع ہونے والے سلسلے اس کی مقبولیت میں اضافہ کریں گے اور میں یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ یہاں قارئین کی رائے کو بھی اہمیت دی جائے گی۔ ناصر بھائی میں ادارے کی پالیسی سے اختلاف تو نہیں کر سکتا لیکن یہاں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ نے میرے خط کا آپریشن بہت خوبصورت انداز میں کیا۔ اس کی وضاحت کے لیے اپنی غزل کا دوسرا شعر حاضر خدمت ہے

لب کشی یہاں جرم کے ڈمرے میں گئی جاتی ہے
اگر یہ وقت شہادت ہے تو پھر سوچتے ہیں

اس دعا کے ساتھ اجازت اللہ رحیم و کریم آپ کی زندگی میں اطمینان قلب کے ایسے دیے روشن کرے جن کی روشنی بھی مدہم نہ ہو آئین۔

بھائی عبدالغفار عابد! آپ کا 'کچی کہانیاں' پریسر حاصل تبصرہ اور 'بامعنی' فقروں سے آباد خط بہت اچھا لگا۔ آئندہ بھی ایسے ہی تبصرے اور 'فقروں' کا انتظار ہے گا۔ آپ کی تمام ترجمت اور شکایت کے حوالے سے ایک شعر پیش خدمت ہے۔

میری بساط شب و روز کا تھا حال عجب
بیادہ اچھی طرح تھا نہ شاہ اچھی طرح

☆ اساء غفور چیچہ وطنی سے احوال میں شریک ہیں۔ اچھے انکل ناصر رضا! السلام علیکم! اگست کا کچی کہانیاں پڑھا احوال میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی حوصلہ افزائی سے ہی میں دوبارہ قلم اٹھا رہی ہوں۔ احوال میں اگرچہ احوالیوں کی تعداد کم تھی پر سب کی رائے اور باتیں بامقصد تھیں۔ امید ہے نئے شروع ہونے والے سلسلے کچی کہانیاں کی مقبولیت میں اضافہ کریں گے۔ جس سے احوالیوں اور قارئین کی تعداد میں یقینی اضافہ ہوگا۔ باجی پروفیسر صفیہ سلطانہ اللہ تعالیٰ آپ کا حج اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے آئین۔ آپ کی منزہ پروردگار نے انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے ہمیں چاہیے کہ ان نعمتوں کا ہر وقت شکر ادا کرتے رہیں۔ آپ کی راحت و وفا کی تحریر 'مجرم کون' پڑھی۔ مرد کے اس معاشرے میں مجرم بھی مرد ہی ہوتے ہیں۔ نینا خان کی روپ بہروپ پڑھ لی آپ کو میری بات کا یقین کرنا پڑے گا۔ مرد کے اس معاشرے میں بھی کچھ لوگ عورت ذات پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ عائشہ نور عا شا نے بھی اپنی تحریر 'مہرباں یہ کیا کیا ٹوٹے' میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس معاشرے میں اگر جینے کا حق ہے تو

صرف مرد کو ہے۔ مرد کی خواہشیں لے لگام ہوتی ہیں۔ عورت ان خواہشوں کو پورا کرنے پر مجبور ہوتی ہے اگر نہیں کرتی تو اس کو ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے، میری رائے سے کسی کو اختلاف ہے تو جہانہ آفتاب کی تحریر غیرت کے نام پر پڑھیں، یقین کریں ہر جگہ عورت کی توہین ہوتی ہے۔ اس کے باوجود عورت مرد کی عزت کرتی ہے۔ اس کا ہر حکم ماننا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں اس کو وہ مرد کے معاشرے میں حاصل نہیں۔ ماں کا پیار دیکھنا ہے تو کوثر پروین کی 'کاش وہ لوٹ آتے' کا مطالعہ ضرور کریں۔ انکل سلیم اختر نے حسب معمول ایک اچھی تحریر پڑھنے کو دی۔ اس کے علاوہ نسرین اختر نینا کی 'تم میری ہو' نسیبہ سعد کی 'کنوئیں والی عفریت' اور شاہدہ ذاکر کی عروج و زوال بھی اچھی تحریریں تھیں۔ چھتا پڑھا اس پر اپنی رائے دے دی۔ انکل ناصر رضا کی محبت کو 21 توپوں کی سلامی جنہوں نے میرے خط کا پوسٹ مارٹم کیا۔ خیر اللہ آپ کو صحت والی لمبی زندگی دے آمین۔

کچھ بیٹا اسماء غفور! آپ نے احوال بہت ہی اچھا خط تحریر کیا ہے۔ آپ جیو بیٹا..... آئندہ بھی ایسے ہی خط کا انتظار رہے گا۔ آپ کی خط کے پوسٹ مارٹم والی بات کے حوالے سے بس اتنا ہی کہوں گا۔

ہاں! حساب غم دوراں تو بہت مشکل ہے

اور پھر اس کا اعادہ ہو ضروری تو نہیں

کچھ بھائی خواجہ حسین! آپ کا تبصرہ اچھا ہے، لیکن آپ سے ایک شکایت بھی ہے آپ نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے اہل ادب بھائی ہیں جنہوں نے آپ کو ہماری وجہ سے سچی کہانیاں کے بائیکاٹ کا حکم دیا، امید ہے آئندہ خط میں آپ ان کی نشاندہی ضرور کر دیں گے..... اور ہاں! زیر نظر شمارے میں آپ کی کہانی موجود ہے، آپ اچھا لکھتے ہیں آئندہ بھی آپ کی تحاریر کا انتظار رہے گا..... اور ذرا یہ تو بتائیں کہ ہمارے دوست جیسے بھائی سرور شاز کہاں ہیں؟ اور کس حال میں ہیں، ملیں تو انہیں ہمارا محبت بھر اسلام ضرور دیتے جے گا۔

☆ احوال کی محفل میں اس بار بھی یہ آخری خط کراچی سے محمد افضل خان کا ہی ہے، لکھتے ہیں محترم ناصر بھائی، آپ کا خلوص اور محبت ایک بار پھر مجھے احوال میں لے آئی ہے امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ اگست کا شمارہ جب دیکھا تو سرورق سے اندازہ ہو گیا کہ تحریریں بھی جاندار ہوں گی۔ مگر میر حسن اور نسیم سلیمہ صدف کی تحاریر تو ناقابل یقین ہی رہیں، ہاں البتہ کوثر پروین نے اپنی تحریر کاش وہ لوٹ آئیں سے آنکھوں کو نم کر دیا۔ باقی سب تو حسب روایت رہا، لیکن نینا خان کی روپ بہروپ، جب نظر سے گزری تو ایک شعری خیال ذہن میں گردش کرتا رہا کہ.....

یہ کب کہا تھا کہ بہاروں سے خوف آتا ہے

مجھے تو چاند ستاروں سے خوف آتا ہے

میں دشمن کے کسی وار سے نہیں ڈرتا

مجھے تو اپنے ہی یاروں سے خوف آتا ہے

کچھ محمد افضل خان صاحب! آپ احوال میں آئے شکر یہ، مگر آپ کا مختصر سا خط تبصرہ ہمارے لیے تشنگی

کا باعث ہے اگر آئندہ ایسا نہ ہو تو کیا ہی اچھا ہو!

اور اب احوال کے آخر میں اپنے ان تمام قارئین اور لکھاری دوستوں سے، جو ایک عرصہ دراز سے یا پھر گزشتہ ایک دو ماہ سے رابطہ توڑے بیٹھے ہیں، خصوصاً احمد سجاد باہر، افتخار چوہدری، ارم ناز، شیماء عبدالقیوم

ایڈیسن اور لیس مسج، عبدالعزیز جی آ، بلال فیاض، افتخار انی، وقاص حسین، عمران مظہر، نعمان اسحاق، جاوید راہی، رحمانہ آفتاب، نسیم نیازی، فصیحہ آصف، فریدہ خانم، فریدہ جاوید، فری بشری، سعید احمد، عطیہ ہدایت اللہ، ضرقام محمود، نادیرہ ملک، ملک صفدر عباس اعوان، سیدہ عطیہ زہرہ، ریاض حسین، شامہ زہت، جمیں ضیاء، فوزیہ احسان، رانا، صداقت حسین، ساجد عاطر شاہین، نیر شفق، شمیمہ طاہرہ، سہاس گل، محفوظ عطاری، رائیل محفوظ عطاری، محمد نسیم (اور باقی تمام دوست جو سچی کہانیاں سے کسی صورت بھی وابستہ رہے ہیں) بہت محبت اور احترام بھری گزارش ہے کہ آ جاؤ پلیز آ جاؤ..... تو پھر آپ آ رہے ہونا.....!

دل کا دروازہ کھلا رکھا ہے

وقت مل جائے تو زحمت کرنا

اجازت سے پہلے ڈاکٹروں کی آغا کی ایک طویل نظم 'اک کٹھا انوکھی' سے اقتباس 'آپ کی بصارتوں کے رزق کی صورت حاضر ہے۔ اسے پڑھیے اور آئندہ ماہ اپنے خطوط میں یہ ضرور بتائیے گا کہ..... آپ نے اس نظم کے اقتباس کے حوالے سے خاص طور پر کیا محسوس کیا؟

جب دھرتی پر

آوازوں کا شور اٹھا تھا اور فولاد کا راج ہوا تھا

انسان سارے لوہے کے روباٹ بنے تھے

بے چہرہ بے نام ہوئے تھے

کالے پیلے ہند سے بن کر

لفظوں کے آنکھوں پر جیسے ٹوٹ پڑے تھے

اک اک لفظ پہ مثبت ہوئے تھے

اور اب ہند سے ہی ہند سے ہیں

جمع کرو تو دگنے بگنے ہو جاتے ہیں

لاکھوں کا اک لشکر بن کر، آگ اور خون کے کھیل کا منظر دکھلاتے ہیں

ضرب لگے تو ہمنور سا بن کر تیز ہوا کا پاگل بھوتوں کے

وحشی گرداب کی صورت

ایک ہی بل میں دھرتی اور آکاش سے اونچے اٹھ جاتے ہیں

کرواگر تفریق، صفر ہو جاتے ہیں!

تو کہتا ہے

چپ کی تہہ در تہہ سلوٹ میں انسانوں پر کیا بنتی ہے

کس نے ان کی رکھشا کی ہے؟

میں کہتا ہوں ان کو رکھشا کی حاجت ہی کیا ہے

یہ سب نسلی پاگل پن کی رکھشا میں ہیں!

پھر ملیں گے گر خدا لایا

ناصر رضا

تاخیر سے ملنے والے خطوط جو احوال میں شامل نہ ہو سکے۔

ایم حسن نظامی، قبولہ شریف، اشتر جواد کراچی، ارشد اقبال، چوہان

فیصل آباد، سید ضیاء شاہ کراچی اور روشنائے سبحین فیصل آباد۔

پُر اسرار کہانی نمبر

’سچی کہانیاں‘ کا شمارہ اکتوبر 2017ء پُر اسرار کہانی نمبر ہوگا۔ اس یادگار نمبر میں نامور لکھاریوں کی ایسی کہانیاں شامل ہوں گی، جنہیں آپ عرصہ دراز تک فراموش نہیں کر سکیں گے۔

جناتی کہانیاں، ارواح کہانیاں، خوف اور دہشت سے بھری ڈراؤنی کہانیاں ہی اس پُر اسرار نمبر کا حصہ نہیں ہوں گی، روحانیت کے اسرار اور تصوف سے جڑی نہایت ہی اعلیٰ اور خصوصی کہانیاں بھی اس کا حصہ ہوں گی۔

ایجنٹ حضرات سے درخواست

برائے کرم اپنے آرڈر سے ادارہ سرکولیشن کو فوری طور پر آگاہ کریں

دن کے گھروں سے جہانگلم سے آباد ایک زندہ جزیر

الایوب بن حبیب

حضرت سہانی کا خیال

اسے زہد عشق تیری ہدایت کے واسطے
سوغات عشق لا رہے ہیں کوئے تہاں سے ہم

م-ن-خ

کشاہدہ بنیں پر شکستیں نمایاں تھیں اور آنکھیں فکرو تردد
میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے امیر کے ساتھ ساتھ
گھوڑا دوڑاتے ہوئے دوسری جانب فضل بن عمرو کو
دیکھا اور فضل بن عمرو نے بھی ایوب بن حبیب کو
دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک
دوسرے سے کچھ کہا۔ اس کے کچھ دیر بعد ایوب بن
حبیب نے قدرے احترام کے ساتھ امیر عبدالعزیز کو
مخاطب کیا۔

”مہترم امیر! اشبیلیہ کی جانب سفر کا مقصد القصر
کا قصد تو نہیں ہے؟“

امیر عبدالعزیز نے گردن کونم دے کر ایوب بن
حبیب کو دیکھا اور بولا۔

”کیا ہم نے روانگی سے قبل یہ وضاحت نہیں کی
تھی کہ ہم شاہ گزین کی بیوہ سے ملاقات کرنا چاہتے
ہیں؟“

”نہیں۔“ ایوب بن حبیب نے دھمکے لکھے
میں کہا۔ ”آپ نے یہ وقت روانگی کچھ نہیں فرمایا تھا
لیکن اب اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں؟“
امیر عبدالعزیز نے تعجب سے اسے دیکھا اور
بولا۔

”اے مومنو! مشرک عورتوں سے جب تک وہ
ایمان نہ لائیں، نکاح صحت کرنا کیوں کہ مشرک عورت
خواہ تم کو کسی ہی پہلی لگے، اس سے مومن کوئی بہتر
سپہ اور اسی طرح مشرک مرد جب تک کہ ایمان نہ
لائیں، مومن عورتوں کو ان کی زوجیت میں نہ لیتا
کیوں کہ مشرک مرد سے خواہ وہ تم کو کیسا ہی چمکا لگے
مومن غلام بہتر ہے۔ یہ مشرک تم کو دوزخ کی طرف
بلاتے ہیں۔“ (سورۃ البقرہ: ۲۳)

انٹس کا نیا امیر عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر اپنے
خاص گھوڑے پر سوار دارالاستقر اشبیلیہ کی جانب
تیزی سے سفر کر رہا تھا۔ اس کے ہم رکاب شیر ایوب
بن حبیب اور فضل بن عمرو تھے۔ یہ دونوں موسیٰ بن
نصیر کے قریبی رشتے دار اور بچپن کے دوست تھے اور
اب اس کے ساتھی اور مشیر بھی مگر اس وقت وہ دونوں
خاموش تھے۔ عبدالعزیز بن موسیٰ نے اچانک ہی اس
سفر کا پروگرام بنایا تھا اور ان دونوں کو کچھ بھی نہیں بتایا
تھا۔ اس وقت یہ نوجوان خوب رو اور توانا امیر کچھ اس
طرح خاموش تھا کہ خاصا سنبٹے ہو جانے کے باوجود
بھی دونوں مشیروں میں سے کوئی بھی کچھ دریافت
کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ایوب بن حبیب کی

دولت تقسیم فرمائی تھی تو ایوب بن حبیب کو بے اندازہ عطا فرمائی گئی۔ کس قدر چمچے دار باتیں کرتے ہو۔ ہم نے ایک چھوٹا سا سوال کیا تھا اس کا اتنا طویل جواب مگر جس بات پر ہمیں اعتراض تھا اس کا جواب اب بھی تم نے نہیں دیا۔ اچھا بتاؤ ہمیں تمہاری کس بات پر اعتراض تھا؟“

”آپ کو یہی اعتراض ہے تاکہ میں نے ایک دم سے بچپن کے دوستوں کی طرح بات چیت ختم کر کے آپ کا احترام کرنا شروع کر دیا ہے؟“

امیر عبدالعزیز نے اس کی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے دیکھا اور بولا۔ ”اگر میں کہوں کہ واقعی مجھے یہی اعتراض ہے تو.....؟“

”تو میں یہی عرض کروں گا کہ بچپن کی دوستی قائم ہے اور رشتے داری بھی مگر میں امیر اور شیر کے فرق کو خوب سمجھتا ہوں۔“ ایوب بن حبیب نے دیر سے کہا۔

”ایوب! ہم تمہارے جذبات کی قدر کرتے

”کچھ بھی دریافت کرنے سے قبل ذرا یہ وضاحت کرو کہ ہم تینوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟“

ایوب بن حبیب اور فضل بن عمرو مسکرائے اور امیر کی نظیر میں ٹھوڑوں کی رفتار قدرے سست کر لی۔ امیر کے سوال کا جواب دینا ضروری تھا لہذا ایوب بن حبیب بولا۔

”جناب امیر! میری والدہ آپ کی چھوٹی اور میرے والد آپ کے چچا تھے۔ اس طرح میں دونوں رشتوں سے آپ کا بھائی ہوں۔ اس کے علاوہ میرے رشتے کے چچا اور سگے ماموں جناب موسیٰ بن شیر مجھے آپ کا مشیر خاص مقرر فرما کر انیس سے گئے ہیں۔ اب میرا فرض ہے کہ حق دوستی بھی نبھائوں صاحب مشورے بھی دوں اور ایک مشیر کی حیثیت سے امیر کی عزت بھی کروں۔ ان ہی تمام فراموشی کے پیش نظر میں نے آپ سے یہ سوال کیا تھا۔“ یہ سن کر امیر عبدالعزیز کھلکھلا کر ہنس دیا اور بولا۔

”خدا کی قسم! جب تقاسم ازل نے گویائی کی



عبدالعزیز بن موسیٰ کو اندلس کا امیر مقرر کر کے اسے امن وامان قائم رکھنے انصاف کرنے اور عیش و عشرت سے بچنے کی ہدایت کر کے یہاں سے چلے گئے۔ مسلمانوں سے قبل اندلس پر گاتھ قوم حکومت کرتی تھی۔ اس کی بدولت رومیوں میں کئی برائیاں رواج پا چکی تھیں جن میں سے دو برائیوں نے متعدد خرابیوں کو جنم دیا تھا، اول یہ کہ ان کا دستور تھا کہ رعایا تو بغاوت کی جرأت کر سکتی تھی اور نہ ہی لب کشائی کی دوسرے غلام خریدے جاتے اور وہ نسل در نسل آقاؤں کی بے دام خدمت انجام دیتے۔ ان دو باتوں سے عیسائیوں میں تشدد پسندی عام تھی۔ کاشت کاروں اور غلاموں کی زندگیاں سب سے زیادہ تلخ تھیں۔ شروع میں امراء نے ان ہی کو ہتھیار بنا کر بغاوت پر اکسایا مگر موسیٰ بن نصیر اور ان کے چلے جانے کے بعد اب امیر عبدالعزیز کا ہر فیصلہ جو اسلام کے عین مطابق تھا ان مظلوموں کو اپنی حمایت میں نظر آیا۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ اطاعت کرتے اور اسلام سے متاثر ہوتے گئے۔ اس اطاعت کی بدولت

نوجوان امیر کے نصف مسائل حل ہو گئے۔ ان حالات سے سب ہی واقف تھے۔ فرمت کے اوقات میں یہ حالات امیر و مشیر کے موضوع بھی بنتے تھے۔ وہ اس وقت بھی اسی بحث میں الجھ جاتے کہ اچانک سفر کرتے ہوئے نوجوان امیر نے اپنے مشیر کی طرف دیکھا اور دریافت کیا۔

”ایوب بن حبیب ہمیں یاد آیا۔ تھوڑی دیر قبل تم نے ہم سے کچھ دریافت کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ تم کیا کہنا چاہتے تھے؟“ یہ سن کر ایوب بن حبیب ہنس دیا اور ندرے تو نف کے بعد بولا۔

”حقیقت میں تو صرف یہی دریافت کرنا چاہتا تھا کہ یہ اچانک القصر کا پروگرام کیسے بن گیا؟“ ”بس ہم نے سوچا کہ جب دیگر مسائل حل ہو چکے ہیں تو کیوں نہ القصر میں داخل ہو کر وہاں کے ان افراد سے گفتگو کی جائے جنہیں ہم نے ابھی تک نہیں دیکھا اور نہ ہی انہوں نے اسلام کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ شاید کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ یہ

ہیں۔“ امیر عبدالعزیز نے تعریفی انداز سے اسے دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”ساتھ ہی ہم خدائے واحد کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے ہمیں تم جیسا دوست، ساتھی اور مشیر عطا فرمایا۔ ہم نے تمہاری بدولت بہت سی مشکلات پر قابو پایا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بابا جان کے اندلس سے چلے جانے کے بعد اسے بہت سے شہروں کو اطاعت کے لیے مجبور کر دینا خاصا دشوار کام تھا۔ اس موقع پر تم نے اور فضل بن عمرو نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔ ہم اس کا اعتراف بار بار کریں گے۔“ امیر عبدالعزیز اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

فضل بن عمرو جو خاموش تھا، اس مرحلے پر بولا۔ ”امیر محترم! ہم اندلس کے تمام شہروں کو بہت پہلے اطاعت کے لیے مجبور کر دیتے مگر دشواری محض اتنی تھی کہ یہاں کے علاقوں میں ہمہ مارے حکمرانوں کے پاس اسلحے کی کمی تھی۔ اسی وجہ سے ان علاقوں کے باشندے انہیں کم قوت تصور کرتے ہوئے باغی ہونے لگے۔“

”ہوں.....“ امیر عبدالعزیز نے تائید کی۔ ”دراصل کسی قوم کو اپنے اخلاق میں ڈھالنے اور اسے اعتماد میں لینے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ ہمیں بھی اگرچہ وقت لگا مگر خدا کا شکر ہے کہ یہاں کے باشندے بہت جلد تک مطیع ہو گئے ہیں۔“

”محترم امیر!“ فضل بن عمرو نے کہا۔ ”اس کی بھی دو وجہ ہیں، اول تو مسلسل ناکامی کے بعد اب ان لوگوں کو یقین ہو گیا ہے کہ مسلمان اندلس کو چھوڑنے والے نہیں دوسرے اب یہ لوگ دل کی گہرائیوں سے اسلامی حکومت کو اپنی پرانی گاتھ حکومت سے بہتر سمجھنے لگے ہیں۔“

امیر عبدالعزیز نے تائیدی انداز میں فضل کی بات سنی اور خاموش ہو گیا۔ اسے خاموش دیکھ کر یہ دونوں بھی کچھ نہ بولے اور اپنے متعدد ساتھیوں سے آگے سفر کرتے رہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب موسیٰ بن نصیر اندلس کی فتح کے بعد دربار خلافت سے اچانک طلبی پر اپنے فرزند

قصر کی جانب سے بلند ہو رہی تھیں۔ امیر نے تعجب سے اپنی جماعت کے کچھ داناؤں کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ ان کے چہرے کا تحیر اور نظروں کی حیرت اس صورت حال کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر حبیب القہدی جو عرصہ دراز سے اس علاقے میں رہ رہا تھا اور ان لوگوں کی عادت و اطوار سے واقف تھا ڈھیرے سے بولا۔

”محترم امیر! یہ اندلس کے وہ سبھی ہیں جو آپ کے استقبال کے لیے راگ رنگ کی مٹھلیں سجا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔“

”کیا یہ لوگ واقعی اتنے خوش ہیں؟“ امیر عبدالعزیز نے دریافت کیا۔

”ہمارا مطلب ہے کہ کل تک یہ لوگ اپنی تمام قوت آزما کر نہیں اندلس سے دھکیل دینا اور ہمیں پسپا کر دینا چاہتے تھے لیکن آج یہی لوگ ہدیہ تہنیت پیش کر رہے ہیں۔“

”یہ سب آپ کے والد محترم موسیٰ بن نصیر کے عزت آمیز سلوک کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے ان لوگوں کو عزت دی جنہیں ان کے سابق حکمران ذلیل تصور کرتے تھے۔ آج یہ لوگ اسلامی حکومت میں اپنے جان و مال کو محفوظ تصور کرتے ہوئے ہار جانے کے باوجود فتح و نصرت کے شادیاں بجا رہے ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں شکست انہوں نے نہیں ان کے آقاؤں کھائی ہے۔ ان کے تو آقا بدل گئے ہیں۔ پہلے ظلم و ستم کرنے اور ذلیل گردانے والے آقا تھے اب عزت دینے والے آقا آ گئے ہیں۔“ حبیب القہدی کی بات اگرچہ طویل تھی مگر حقیقت پر مبنی تھی لہذا سب نے اس کی تائید کی۔

سفر ختم ہوا اور وہ القصر کے دروازے پر پہنچ گئے یہاں انسانوں کا ہجوم تھا۔ نوجوان امیر اور مسلمان انہیں دیکھ کر رک گئے۔ انہیں دیکھتے ہی ایک جیسی وضع قطع کے لباس پہنے ہوئے سبھی لڑکیوں نے گھنٹیوں اور باجوں کی آواز کے ساتھ اس گیت کی آواز بلند کی جو امیر کی شان میں ایک قصیدہ تھا۔ اس قصیدے میں اس کے حسن و وجاہت دلیری اور

لوگ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں۔“ ایوب بن حبیب نے تعریفی نظروں سے امیر کی طرف دیکھا اور کہا۔

”خدا کرے کہ امیر محترم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اور خداوند عالم آپ کو ان لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے جو دوتی کے پردے میں مخالفت کرتے ہیں۔“

ابھی گفتگو یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے معنی تھے کہ ان کے دوسرے تمام ساتھی جو کافی پیچھے تھے اب سفر کرتے ہوئے قریب آ گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر وہ لوگ تھے جو موسیٰ بن نصیر کے زمانے سے ہی خیر خواہ اور دوست تصور کیے جاتے تھے اور آج بھی اس نوجوان امیر کے دوست تھے۔ ان میں جنرل القہدی محمد بن حنیف زیاد بن بدر اسح بن مالک اور اسمعیل بن عبیدہ شامل تھے۔ ان کو دیکھتے ہی امیر نے کہا۔

”ہم نے یہاں پہنچ کر رفتار سست کر دی تھی اور تمہاری آمد کے منتظر تھے۔“

”امیر کی عزت افزائی ہے۔“ جنرل حبیب القہدی نے کہا۔ ”یہ ہی سڑک آگے جا کر القصر کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ہمیں یہاں سے ساتھ ساتھ سفر کرنا ہے۔“

امیر عبدالعزیز بن موسیٰ نے قدرے مسکرا کر یہ بات سنی اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اب مسلمان جماعت اور ان کا نوجوان امیر آہستہ آہستہ القصر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگرچہ ابھی فاصلہ کافی تھا مگر القصر کی بلند و بالا عمارتیں اور اونچے اونچے کنگرے دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ صبح کی روشنی اس کی عظمت اور حسن کو نمایاں کر رہی تھی۔ کچھ لوگ اس منظر کو عقیدت سے دیکھ رہے تھے اور کچھ اس کی عظمت سے مرعوب تھے۔

تھوڑی دیر بعد یہ جماعت القصر جانے والی سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ جونہی وہ اس سڑک پر آئے تو باجے اور گیتوں کے شور نے انہیں اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ نصیاری اندلس کے نغموں کی صداؤں سے فضا گونج رہی تھی۔ گیتوں اور سازوں کی یہ مترنم آوازیں

یہ نوجوان امیر اس کام کی آرزو کر رہا تھا تو سب احترام و عقیدت اور خوشی کے عجیب انداز سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

امیر عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر نے نماز شکرانہ ادا کرنے کا حکم دیا تو اچانک رقا صاؤں کے قدم عقیدوں کی بلند ہوئی ہوئی آوازیں اور سازندوں کے ساز رک گئے، آوازیں مدہم ہوئیں اور لاتعداد افراد کی موجودگی کے باوجود خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد اندلس کے لاکھوں مفتوحین خداوند عالم کے زور و جھکے ہوئے اُن فاتحین کو دیکھ رہے تھے جن کے اتفاق و اتحاد اور دلیری نے اندلس میں انقلاب بنایا کر دیا تھا مگر اپنی اس عظیم فتح کے بعد بھی وہ مغرور نہ تھے۔ اُس وقت یہ لوگ اپنے ملک میں ہر انقلاب کے بعد کی تباہیوں کو یاد کر رہے تھے جو ان پر نازل ہوتی رہتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے حکمران بھی حاوی آجاتے تو نہ مال و دولت محفوظ رہتا نہ عزت و آبرو ہی بچتی مگر مسلمان فاتحین تو کچھ اور ہی تھے۔ نہ ظلم و تشدد تھا نہ غرور و تکبر بلکہ وہ خود سر جھکائے خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کر رہے تھے۔ جب تک وہ نماز پڑھتے رہے یہ لوگ تعجب سے دیکھتے رہے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد امیر عبدالعزیز بن موسیٰ نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر ان سب کو مخاطب کیا اور کہا۔

”میرے دوستو! تمام تعریف اور ستائش اس خدائے بزرگ و برتر کو زیبا ہے جس نے ایک لفظ ”کن“ سے تمام موجودات کو شرف و جود عطا فرمایا پھر ہزاروں ڈرود اس ہستی پر جو شیخ رہبری لائے اور آدم کی کم کردہ راہ اولاً کو صراطِ مستقیم سے آشنا کیا۔ اس ربِّ عظیم کے کرم سے آج تمام بغاوتیں فرو ہو گئیں۔ بغاوت کرنے والے مطیع اور مظلوم نجات پا گئے۔ میرے دوستو! تم لوگ جو مدتوں سے غلط رسموں کا شکار تھے آج سب مصائب سے چھکارہ پا گئے۔ اب تم لوگ خواہ کسی بھی طبقے اور کسی بھی عقیدے سے تعلق رکھتے ہو مذہبی طور پر بالکل آزاد ہو۔ تم مجھے اندلس کا فاتح یا امیر نہیں بلکہ اپنا دوست سمجھو۔ تمہاری عزت و دولت، مال و جان اور دین کی

بلند اخلاقی کی تعریف کی گئی تھی۔ اس وقت حسین رقا صائیں بڑے بڑے طشت اپنے سروں پر رکھے رقص کر رہی تھیں۔ رقص کا یہ انداز عجیب و غریب تھا۔ گیت کے ہر جملے کے ساتھ رقص کرنی لڑکیاں طشت سے پھول نکال نکال کر امیر پر نچھاور کر رہی تھیں۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ رقا صائیں اور گانے والیاں اپنا اپنا کمال دکھانی رہیں یہاں تک کہ امیر عبدالعزیز نے ہاتھوں کے اشارے سے انہیں روکا تو یک لخت خاموشی چھا گئی۔

اس استقبال کے بعد سلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ غریب مزدور، کاشت کار، غلام اور دیگر لوگ آتے جھک کر امیر کو سلام کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اس وقت یہاں موجود ہر نفس اس کوشش میں تھا کہ امیر کی قربت حاصل کر سکے۔ امیر خود بھی ان سب کے سلام کا جواب بڑی شفقت سے دے رہا تھا۔ یہ سلسلہ بھی کافی دیر تک چلتا رہا یہاں تک کہ القصر کے اندرونی حصے سے آنے والے ملکہ کے خاص دستے کے سپاہی نے امیر کے قریب آ کر سلام کیا اور کہا۔

”جناب! ملکہ عالیہ نے کہا ہے کہ ہم فاتحین کے منتظر ہیں۔“

یہ پیغام گویا القصر میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ امیر کو یہ سمجھے میں نہ دیر لگی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس وقت مجاہدین منتظر تھے کہ امیر قدم بڑھائیں تو وہ بھی آگے بڑھیں لیکن امیر عبدالعزیز بن موسیٰ نے قصر کی جانب قدم بڑھانے کی بجائے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ہم القصر داخل ہونے سے قبل نماز شکرانہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔“ یہ سن کر ساتھیوں نے عقیدت سے سر جھکا دیئے۔ یہ وہی کام تھا جو مدتوں قبل رخ ایران کے موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاص نے کیا تھا اور اُن میں سے بہت سے لوگوں نے یہ چشم خود اس عظیم فتح کو دیکھا تھا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے یہ سب واقعات اپنے بزرگوں سے سنے تھے اور اُن کے دل عقیدت کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے۔ اسی جذبے اور عقیدت کے ساتھ جب

شاہ لڑزین کے محل میں داخل کروایا۔

اُس وقت سورج کی شعاعیں قصر کے بلند دروازوں اور اونچے کنگوروں پر نثار ہو کر بڑا حسین منظر پیش کر رہی تھیں مگر اس کی طرف توجہ دینے بغیر سینکڑوں کی تعداد میں مسیحی اس جواں بخت امیر کے استقبال کے لیے جمع تھے۔ القصر کی کشادہ سڑک پر دور تک دورو یہ قطار میں کھڑے ہوئے لوگ اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے اور ان میں سے کسی کو بھی یہ علم نہ تھا کہ آج کے دن ملکہ یہ منظر کہاں سے دیکھ رہی ہے۔ اس وقت ہجوم مختلف جذبات کے ساتھ اس فاحش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انہوں نے جسے دیکھا تھا اس کی باتیں سنی تھیں، ان کے دل عقیدت سے معمور تھے اور جو صرف فاحش سمجھ رہے تھے، ان کے دل نفرت سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں عقیدت رکھنے والے محض وہی تھے جو اب تک صرف خدمت اور ذلت کے قابل سمجھے جاتے تھے اور نفرت ان کے دلوں میں بھی جو اپنے غلاموں کو مسلمان ہوتا دیکھ کر اپنی توہین تصور کر رہے تھے۔ وہ سب اب تک بیش پرست امراء تھے جو آج کے بعد خود کو اس لشکر کا ایک عام آدمی سمجھنے پر مجبور تھے۔ یہ سب امیر عبدالعزیز بن موسیٰ کو اپنا مخالف سمجھتے ہوئے اسی انداز میں سوچ رہے تھے جس انداز میں مفتوحین اپنے فاتحین کے لیے سوچتے ہیں لیکن کسی کو بھی لب ہلانے کی مجال نہ تھی بلکہ وہ بھی دلوں میں نفرت چھپائے دوسروں کے ساتھ اس آنے والے امیر کو عزت دینے پر مجبور تھے۔

ادھر امیر جواب میں خلوص و محبت کا اظہار کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ ایسے میں اندلس کے بوڑھے بادشاہ لڑزین کی نو عمر بیوہ ملکہ انجیلونہ بالائی منزل سے اپنے مخصوص کمرے کی ایک کھڑکی کے مہین پر دے کے عقب سے مسلمانوں کی قصر میں آمد کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے قبل اس نے تقریر بھی سنی تھی اور اہل اندلس کا قبول اسلام بھی دیکھا تھا۔ اسلام کے اصول بھی سنے تھے اور امیر اندلس کو نماز، شکر ادا کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا، اب اس نے اپنی لوٹدی

حفاظت میرا اولین فرض ہے۔“ امیر عبدالعزیز بن موسیٰ نے یہ کہتے ہوئے اُن سب پر نظر ڈالی اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اسلام کے رُز وں اصولوں کو اس سے قبل بھی تمہارے سامنے کی بارپیش کیا جا چکا ہے لیکن آج پھر ایک مرتبہ میں تمہیں اس کی دعوت دیتا اور اس کے ساتھ ہی اندلس کے امیر کی حیثیت سے یہ آئین نافذ کرتا ہوں جو غریب کاشت کاریاں خرید غلام اسلام کے دامن میں آئے گا، وہ خود کو اپنے غیر مسلم آقا کی غلامی سے آزاد سمجھے پھر نہ اس پر اس آقا کی خدمت واجب رہے گی نہ آقا کا اس پر کوئی حق باقی رہے گا اور اسے وہی حق دیا جائے گا جو میرے لشکر کے ہر فرد کو حاصل ہے۔ میرے عزیزو.....! یہ بات سب جانتے ہیں کہ اسلام نے آقا اور غلام امیر غریب اور گورے کالے کے تمام فرق مٹا کر صرف تقویٰ کو عزت و بڑائی کا منبع قرار دیا ہے۔ ہم سب پر فرض ہے کہ خود کو اسی بنا پر بڑا ثابت کریں لہذا آج کے بعد اندلس کے جس گوشے میں کوئی کٹر شخص بھی اسلام قبول کرے گا، وہ میری نظر میں صاحب عزت سمجھا جائے گا۔ دنیا اور دین میں اس کے حقوق میرے برابر ہی ہوں گے۔“

اس تقریر کے بعد امیر نے جامع مگر مختصر الفاظ میں اُن سب کے سامنے اسلام پیش کیا جس نے کرم جمع میں ایک کھلبلی سیج گئی۔ ہر فرد دوسرے سے پہلے آگے بڑھ کر دین حق قبول کرنا چاہتا تھا۔ اُس دن سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نے صدیوں سے ظلم و ستم کی زنجیروں میں بندھے ہوئے خدا کے اُن بندوں نے جنہیں ذلت کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا تھا، خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت کا اور رسول اللہ کی رسالت کا اعتراف کر کے غلامی کی زنجیریں توڑ دیں اور مسلمان انہیں مبارک باد دینے اور خوشی کے اظہار کے لیے ”اللہ اکبر“ کے نعرے لگانے لگے اور فضا اُن آوازوں سے گونج اٹھی پھر امیر اندلس نے محفل برخواست کرتے ہوئے کہا۔

”اب ہم القصر میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔“ یہ سنتے ہی ملکہ کے خاص محافظ دستے نے اس جماعت کو

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ایڈفرس لنکس ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
 ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
 ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔
 اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



نے سفید پرچم لگا دیا ہے۔ آج ہر طرف انہی کے نعرے گونج رہے ہیں۔ یہ لوگ ہماری محفلوں میں گھس کر اپنے دین کی دعوت دے رہے ہیں اور مسیحیوں کو مسلمان بنا رہے ہیں اور ہم خوش ہو رہے ہیں، کیا ہم میں سے کسی میں انہیں پسپا کرنے کی قوت نہیں؟“

”نقوت ہے نہ صلاحیت، بس اب تو خاموش رہ.....“ ملکہ نے کینز کو جھڑکا۔ ”تیرا خیال ہے کہ مجھے ان باتوں کا احساس نہیں ہے؟“

”اسی احساس کو سمجھتے ہوئے تو میں نے اپنے جذبات بیان کیے ہیں۔“ روزیکا روپائی ہو کر بولی۔ ”آیا کوئی ایسی تدبیر نہیں کہ ہم اس قوم کو نچا دکھاسکیں؟“

بے باک کینز خاموش ہو گئی مگر ملکہ کے خوابیدہ احساسات کو جگا گئی۔ کل تک وہ ملکہ تھی مگر اب انڈس کے تمام شہر غارت خانہ، قرطبہ، ناقہ، طریطلہ اور ماروہ سب ہی ہاتھ سے چاچکے تھے۔ اب وہ ملکہ نہیں، بوڑھے بادشاہ کی نو عمر بیوہ تھی۔ بیوہ..... وہ مضطرب ہو گئی۔

یہ ایک نچے شور بلند ہوا۔ امیر عبدالعزیز کی تقریر سن کر لوگ جوش و خروش کے ساتھ تعریفی جملے کہتے ہوئے تالیاں بجا رہے تھے پھر ملکہ نے دیکھا، نو جوان امیر کی پیشانی چمک رہی تھی۔ دراز قد، مضبوط اور خوب صورت جسم والا یہ نو جوان کسی کو بھی متوجہ کر سکتا تھا اور انجیلو نہ متوجہ ہو چکی تھی۔ جوں ہی امیر عبدالعزیز نے القصر میں داخل ہونے کا اعلان کیا، ملکہ نے حکم دیا۔ ”امیر پر بالائی منزل سے پھول برسائے جائیں۔“

اس حکم کے پس پردہ کون سے جذبات کا فرما، تھے کوئی نہ جان سکا۔ روزیکا بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی مگر نو جوان ملکہ کے چہرے پر اس وقت وہ خاص چمک اور آنکھوں میں وہ روشنی تھی جو روزیکا نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس نے پھول برسائے کا حکم دے کر پلٹتے ہوئے کہا۔ ”ہم خود امیر کو خوش آمدید کہنا چاہتے ہیں۔“

اس وقت امیر عبدالعزیز پر بالائی منزل سے پھول نثار ہو کر قدموں میں ڈھیر ہو رہے تھے۔ وہ اور

سے پوچھا تھا۔

”کیا تقریر کرنے والا یہی جوان موسیٰ بن نصیر ہے؟“

”نہیں ملکہ عالیہ.....!“ لونڈی نے کہا۔ ”یہ جوان موسیٰ بن نصیر نہیں بلکہ اس کا فرزند عبدالعزیز بن موسیٰ ہے۔ موسیٰ بن نصیر تو اس فوج کا سپہ سالار تھا جس نے انڈس کو فتح کیا ہے اور وہ واپس چلا گیا۔ سنا ہے کہ ان کے خلیفہ نے ایک دم ہی انہیں واپس بلا لیا ہے لہذا یہاں سے رخصت ہونے سے قبل انہوں نے اپنے بیٹے کو انڈس کا امیر مقرر کر دیا تھا لیکن لوگ کہتے ہیں یہ جوان امیر بہت دلیر اور صاحب علم ہے۔“

”تو نے اتنی بہت سی معلومات کیسے جمع کر لیں؟“ ملکہ نے بدستور نیچے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس سوال پر لونڈی جھینپ سی گئی۔ دراصل اسے یہ خبریں اپنے محبوب میکائیل سے معلوم ہوئی تھیں۔

اس وقت نیچے کا منظر کچھ عجیب تھا۔ غریب مسیحی اب بھی دوڑ دوڑ کر اسلام قبول کر رہے تھے اور ملکہ انجیلو نہ کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ اس کے دائیں بائیں دست بستہ کینزیں اور لونڈیاں بھی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ ملکہ کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے اس کی منہ چڑھی لونڈی اور ہر دم ساتھ رہنے والی کینز نے کہا۔

”ملکہ عالیہ.....! حضور نے القصر کے تمام باشندوں کو نئے امیر کا استقبال کرنے کی اجازت کیوں دی؟“

ملکہ نے ایک نگاہ اپنی اس بے باک کینز روزیکا کی طرف ڈالی اور بولی۔

”امیر عبدالعزیز انڈس کا امیر اور فاتح ہے۔ ہم استقبال نہ بھی کرتے تو بھی وہ قصر میں داخل ہونے کا حق رکھتا ہے۔“

”لیکن حضور.....!“ روزیکا نے کہا۔ ”اس استقبال میں مجبور ہی نہیں خوشی شامل ہے۔ کیا انڈس کے لوگ اتنے بے غیرت ہیں کہ لوٹنے والوں کو محافظ گردان رہے ہیں؟ غور کیجئے آج انڈس پر صلیب کی جگہ ہلال لہرا رہا ہے۔ ان غوانی پرچم اتار کر مسلمانوں

نظروں میں ہمدردی بھی تھی، شوق بھی، چاہت بھی اور حیرت بھی۔

ان تمام جذبوں کو سمجھنے میں ملکہ کو ذرا بھی دیر نہ لگی۔ ابھی ان جذبوں کا اثر کم نہ ہوا تھا اور اس کے بے پناہ حسن کا تاثر ٹوٹا بھی نہ تھا کہ ملکہ نے گہرا سانس لیا۔ امیر اندلس ایک دم سے سنبھلا اور بڑے ہی احترام کے انداز سے بولا۔

”معزز ملکہ! مزاج یہ خیر.....!“

ملکہ نے بڑے سوگوار انداز سے اسے دیکھا اور دل سے نکلنے والی آہ نے لبوں پر دم توڑ دیا۔ وہ قدرے توقف کے بعد دھیمے اور شاکستہ لہجے میں بولی۔

”اندلس کے نئے شہنشاہ.....! ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں۔“

امیر عبدالعزیز تعجب سے دیکھتا رہ گیا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اپنی کامیابی پر ملکہ سے مبارک باد لے یا اس کی تباہی پر اظہارِ افسوس کرے۔ شاید اس کے پاس وہ الفاظ نہیں تھے کہ ان متضاد جذبوں کا اظہار کر سکتا مگر ملکہ بڑے اہتمام اور تیاری کے بعد اسے خوش آمدید کہنے کے لیے آئی تھی۔ وہ جذبات کی ملکہ تھی اور اس کے خزانے میں خوب صورت الفاظ کی بھی کمی نہ تھی لہذا اس نے تمام جذبات جمع کرتے ہوئے اس موقع پر بڑے پراثر الفاظ کا سہارا لیا۔

”اندلس کے امیر.....!“ وہ گویا ہوئی۔ ”ہمیں اپنی بربادی پر آپ سے کوئی گلہ نہیں، نہ ہم ایسا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ جس قصر میں ملکہ بن کر حکمرانی کریں، اس کے دروازے پر ایک لوٹڑی کی حیثیت سے فاتح شہنشاہ کو خوش آمدید کہیں۔ ہم آپ کو اس عظیم فتح پر مبارک باد دیتے ہیں۔“

امیر عبدالعزیز ویسے بھی ایک بامروت اور رحم دل انسان تھا اور اس وقت اس کا دل حسن کی افسردگی اور بے بسی سے کچھ اور ملول ہو گیا تھا لہذا ملکہ کی بات سن کر وہ بے قرار ہو گیا اور شاکستہ سے بولا۔

”معزز ملکہ.....! آپ ہمیں شہنشاہ یا امیر کہہ کر

اس کے ساتھی ان پھولوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس راہ میں قطار در قطار کھڑے ہوئے نصاریٰ امیر کی خدمت میں سلام پیش کر رہے تھے۔ امیر ان نعروں کے جواب دیتا اور خوب صورت معنیوں کی آوازوں میں نغمہ ہائے نشاط سنتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ ابھی تک اس کی نظریں قصر کے حسن اور ارد گردِ جمع ان استقبال کرنے والوں پر نہیں جن میں سے بہت سے واقعی خلوص دل سے خوش آمدید کہتے ہوئے مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ گردان رہے تھے۔

امیر عبدالعزیز کے خیال میں یہ سب مدتوں عظیم سہنے والے مظلوم تھے جنہوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی تھی۔ وہ ان سب کو محبت و خلوص سے دیکھتا ہوا اور ان کے مسلمانوں کا جواب دیتا ہوا قصر کی عمارت میں داخل ہوا۔ چند قدم کے فاصلے پر بیڑھیوں پر ایک تجسس سے رو برو پہنچ کر جیسے وہ ٹھٹک گیا۔ آخری بیڑھی پر رکھے ہوئے اس تجسس کو دیکھ کر وہ یوں کھڑا رہ گیا جیسے زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے ہوں یا اس میں خود حرکت کرنے کی سکت باقی نہ رہی ہو۔ یہ سفید سنگ مرمر کا مجسمہ تھا یا کوئی جینتا جاگتا سراپا؟ پہلی نظر میں تو وہ فیصلہ ہی نہ کر سکا مگر دوسری نگاہ پڑتے ہی اسے محسوس ہوا کہ یہ انسانی کمال نہیں بلکہ قدرت کا حسین شاہکار ہے جو نگاہوں کے راستے دل میں سا چکا ہے۔ سیاہ پاتلی لباس میں ملبوس، کھلے ہوئے گیسو گلے میں چھوٹی سی صلیب اور صبح کی روشنی سے زیادہ روشن چہرہ، یہ کون تھی؟ امیر اندلس کو اس کا علم نہ تھا مگر اس کی حسین آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ ایک نگاہ میں اس مکمل حسن کا جائزہ لینا ممکن نہ تھا یا پھر اس امیر کی شرافت کا تقاضا تھا کہ اس حسن عالم تاب سے نظریں چرائی جائیں۔ اسی وقت ایک مستحی سردار آگے بڑھا اور بولا۔

”امیر اندلس.....! یہ شہنشاہ لرزینق کی بیوہ ملکہ انجیلو نہ ہیں۔“

”بوڑھے شہنشاہ کی تو عمر ملکہ.....!“ امیر اندلس نے تعجب سے یہ الفاظ دہرائے۔ ملکہ کو دیکھ کر اس کی نظریں حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہیں۔ اس کی

نہ کیا ہوگا اس کے ساتھی ضرور محسوس کر گئے تھے۔ اسی احساس کے تحت ایوب بن حبیب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور شائستہ مگر تنبیہی لہجے میں بولا۔ ”امیر محترم..... اقدم آگے بڑھائیے.....“

یہ آواز امیر عبدالعزیز کو ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی۔ ایوب بن حبیب کی آواز نے اسے بروقت چونکا دیا تھا۔ اس نے سوچا، کاش چند لمحے اور وہ مداخلت نہ کرتا۔ اس سوچ میں ناگواری بھی تھی اور عجیب سی جھجھلاہٹ بھی۔ اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور ساتھیوں کی معیت میں آگے بڑھ گیا، اس طرح جیسے وہ اپنی ہر سوچ یہاں چھوڑ گیا ہو۔

واپسی میں حبیب القہدی اور ایوب بن حبیب اس کے دائیں بائیں چلتے ہوئے اس دن پیش آنے والے ہر واقعے پر بحث کر رہے تھے مگر امیر عبدالعزیز موٹی کھوئے ہوئے انداز میں یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ جنرل حبیب القہدی کی نظروں سے یہ انقلاب پوشیدہ نہ تھا۔

دوسری طرف اس رات اپنی خواب گاہ میں کروٹیں بدلتی ہوئی ملکہ انجلو نے کو اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ وہ چشم تصور سے ایک شہزادی کو دیکھ رہی تھی جو ایک صبح سیر کے لیے نکلی تھی۔ اس وقت موسم بہت خوشگوار تھا۔ شہزادی نے محسوس کیا کہ سمندر میں تھوڑے تھوڑے سے بہت کم ہے لہذا اس نے کئی رانی کا فیصلہ کیا اور اپنی کنیزوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر ملاحوں کو بادبان کھولنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تعمیل حکم کی اور دیکھتے ہی دیکھتے شاہی کشتی روانہ ہو گئی۔ اس وقت اس کشتی کا رخ بحیرہ روم کی جانب تھا۔ کشتی سطح آب پر موجوں سے چھیر چھاڑ کرئی آگے بڑھ رہی تھی۔ شہزادی کا خیال تھا کہ چند گھنٹے سیر کرنے کے بعد محل میں واپس لوٹ آئے گی لیکن سیر کرتے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اچانک خوشگوار ہواؤں میں شدت پیدا ہونے لگی۔ یہ ہوا میں آنے والے طوفان کی خبر دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بوند باندنی نے اس کو مزید خطرے سے آگاہ کیا۔ شہزادی بری طرح کھبرا گئی۔ اس نے ملاحوں کو کشتی کا رخ محل کی جانب

مخاطب نہ کیجیے۔ مسلمانوں میں حاکم وقت عوام کا خادم ہوتا ہے۔ وہ جس ملک یا قوم کو راج کرتا ہے اس کا فرار نہیں، محافظ ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں مفتوح قوم کا ہر فرد باعزت اور باوقار ہوتا ہے۔ ہم بھی اندلس کے ہر فرد کو ایسا ہی سمجھتے ہیں اور آپ ہماری نظر میں لوٹنے کی نہیں شاہ لرزیق کی بیوہ ہیں اور محترم و لائق تعظیم ہیں۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ آپ ہمیشہ اس قصر میں اپنی سابقہ شان اور اعزاز کے ساتھ رہیں گی۔ تمام خدام بدستور آپ کی وہی خدمت انجام دیں گے جو اب تک دیتے رہے ہیں۔“

امیر کا جواب اور تمام تر مہربانیاں قطعی غیر متوقع تھیں۔ سب نے ہی حیران ہو کر دیکھا، واقعی امیر عبدالعزیز نے ضرورت سے زیادہ ہی فراخ دلی برتی تھی۔ ملکہ انجلو نے اسے محسوس کیا اور چونک کر عبدالعزیز کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی سوگوار نظریں عبدالعزیز بن موٹی کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو امیر کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس کے حواس پر ایک نشہ سا چھا گیا ایسا نشہ جو صرف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ جنگ کے تمام عرصے میں عبدالعزیز نے ہر محاذ پر دلیری کا مظاہرہ کیا تھا اور اب موٹی بن نصیر کے اندس سے چلے جانے کے بعد وہ ایک امیر کی حیثیت سے ہر جگہ گیا تھا۔ اس نے حسین بھی کئی دیکھے تھے اور جوانیاں بھی مگر ایسا نشہ کبھی نہ محسوس کیا تھا، گلتا تھا کہ خون کی گردش بڑھ گئی ہے لہذا یہ لمحہ زندگی کا احساس دلارہی ہے، نظروں کے تصادم نے اسے کیا سے کیا کر دیا تھا۔ وہ حواس باختہ سا، کیف و مستی میں ڈوبا یہ اندازہ نہ کر سکا کہ ملکہ کا یہ سوگ یہ دکھ اور یہ افسردگی دکھاوا ہے یا حقیقت؟ نہ جانے کتنے لمحے اس کیفیت کی نذر ہو گئے نہ ملکہ نے کچھ کہا نہ امیر ہی بولنے کی جرأت کر سکا۔

یہ صورت حال جنرل حبیب القہدی، ایوب بن حبیب اور دیگر مجاہدین سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ امیر عبدالعزیز بن موٹی کے قدم شاید زندگی میں پہلی بار لڑکھڑائے تھے جن کی لغزش کو اس نے محسوس کیا ہو یا

کے ساتھ رہنے لگی پھر آہستہ آہستہ برائی زندگی کو فراموش کر کے نئی زندگی کی عادی ہو گئی لیکن زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ مسلمانوں سے فیصلہ کن جنگ کے لیے شاہ لرزق کو خود میدان میں جانا پڑا اور ملکہ تہارہ گئی پھر واپسی بادشاہ کا مقدر نہ تھی۔ وہ جنگ میں کام آیا اور اسی محل میں اسی ملکہ کو امیر عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کا استقبال کرنا پڑا۔

اپنے ماضی کو یاد کرتے کرتے انجیلونہ پھر بے حال ہو گئی۔ امیر سے ملاقات کے بعد سے اس کا دل کچھ عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ وہ غم کے احساس کے ساتھ ساتھ نئی کیفیت کو بھی اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔ انڈس کے نئے امیر کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی ہی انداز میں والہانہ پن تھا جو اسے مسرور کئے دے رہا تھا۔ بوڑھے بادشاہ لرزق کے انداز میں بھی یہ سب کچھ ہوتا تھا لیکن انجیلونہ کو یہ خوشی کبھی حاصل نہ ہوئی جو اسے آج محسوس ہو رہی تھی۔

ان دونوں کے درمیان خاموشی کی زبان میں ایک طویل گفتگو ہوئی تھی جو بڑی ہی بامعنی تھی۔ وہ جوں جوں غور کرتی گئی اس والہانہ پن اور نظروں کی وارفتگی کے معنی اس پر واضح ہوتے چلے گئے۔ اس کا دل کہتا: 'امیر ضرور آئے گا' اور عقل بار بار مشورہ دیتی: 'انجیلونہ! اس موقع کو ضائع مت کر، تو بڑی آسانی سے انڈس کی ملکہ بن سکتی ہے۔ اس مشورے پر غور کرتے ہوئے وہ خود کو یقین دلاتی: 'انجیلونہ! امیر عبدالعزیز بن موسیٰ میں اور صفات ہوں یا نہ ہوں مگر وہ انڈس کا امیر ضرور ہے اور یہی بہت بڑی صفت ہے۔ اس کے بعد وہ عقل کی آواز پر توجہ دیتے دیتے گم ہوتی گئی اور اپنے مستقبل کے بارے میں اہم فیصلہ کر کے پوری طرح سے مطمئن ہو گئی۔

.....

امیر انڈس عبدالعزیز بن موسیٰ کئی دن کی بے قراری کے بعد کوئی خاص فیصلہ کر کے یوں تیار ہوا جیسے کسی مہم پر جا رہا ہو لیکن ان چند دنوں میں وہ ذہنی طور پر بڑے ہی انتشار کا شکار رہا تھا۔ انجیلونہ کا بے

موڑ لینے کا حکم دیا۔ ملاحوں نے کشتی کا رخ موڑنے کی کوشش کی مگر بارش اور ہوا نے تیزی اختیار کر لی۔ سمندر میں تلاطم بپا ہو گیا۔ اب واپسی کی کوشش کے لیے ملاحوں نے مستول و بادبان سنبھالے مگر ہر کوشش ناکام ہوتی چلی گئی۔ ہوا اور بارش نے ہر چیز کو بے کار کر دیا تھا۔ رسیاں ٹوٹ گئیں، بادبان گر گئے، لہریں بلند ہو کر کشتی میں آنے لگیں۔ شہزادی اور کنیریں بری طرح چلا رہی تھیں، فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ہر چند کہ خدام کشتی کا پانی نکال نکال کر اسے ہلکا کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر طوفان کے زور کے سامنے ہر زور بے کار تھا۔ کشتی کبھی ادھر کا رخ کر رہی تھی تو کبھی ادھر کا۔ اس میں سوار ہر شخص کو موت اپنے سامنے نظر آ رہی تھی۔ یوں تمام دن گزر گیا، نہ انہیں واپسی کا راستہ ملا اور نہ ہی طوفان کم ہوا۔ شام ہوتے ہوتے کشتی دانیہ کے ساحل تک جا پہنچی۔ یہاں طوفان کے زور سے پاش پاش ہو جانے والی کچھ اور کشتیاں بڑی ہوئی تھیں۔

ساحلی علاقے کو طوفان نے تباہ کر دیا تھا۔ شہزادی کے اپنے کئی ساتھی قیدمہ اجل بن چکے تھے مگر وہ خود معجزانہ طور پر زندہ تھی اور اپنی تباہ حالی پر زار و تظار رو رہی تھی۔ شام کے وقت جب تمام علاقہ سیلاب کے پانی سے بھرا ہوا تھا اور امدادی جماعت ساحل کے قریب مصروف تھی، ایسے میں شہزادی کی کشتی بندرگاہ دانیہ سے جا کرائی۔ لوگ سمجھے کہ شاید عرب آگئے لہذا وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگے۔ کچھ نے تلواریں کھینچ لیں مگر اس علاقے کے قائد نے ان سب کو روکا، صورت حال معلوم کی پھر یہ جان کر کہ یہ تباہ شدہ کشتی دراصل شاہی کشتی ہے اور اس میں مغرب اقصیٰ کی شہزادی سوار ہے، اسے بطور مہمان خوش آمدید کہا اور انڈس کے بادشاہ لرزق کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ لرزق نے یہ اطلاع پا کر ان مصیبت زدہ لوگوں کو اپنے دربار میں طلب کیا اور شہزادی کے بے پناہ حسن سے متاثر ہو کر اس سے شادی کر لی۔ اس طرح سے یہ نوجوان شہزادی بوڑھے بادشاہ سے وابستہ ہو کر انڈس کی ملکہ بن گئی اور ہر لمحہ سرفروغ میں بادشاہ

اندلس کے عیسائیوں کو اپنی تقریروں کے ذریعے اسلام کی طرف مائل کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔“
یہ سنتے سنتے امیر اندلس کے چہرے پر ستائش آمیز جذبات ہو پیدا ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے سوچیں بدل گئیں اور وہ غلام سے بولا۔ ”ہمارے جانے کے بعد ایوب بن حبیب آئیں تو بس اتنا کہنا کہ ہم موجود نہیں ہیں۔“

پھر امیر کمرے سے نکلا۔ دیکھنے والوں کی نظروں سے بے خبر وہ القصر کی راہ پر جا رہا تھا۔ یہ راہ صحیحی یا غلط اسے کچھ خبر نہ تھی بس ایک حسین تصور تھا جو اسے کھینچنے لپے چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر سفر کرنے کے بعد وہ وہاں پہنچ گیا۔ موسم بہت حسین تھا۔ القصر کے طویل و عریض باغ میں حد نظر تک پھلے ہوئے پھولوں کے تختے دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ ان تختوں کے درمیان سنگ مرمر کے بڑے بھنی حوض میں فوارے چھوٹ رہے تھے اور ان کی ننھی ننھی بوندوں کا اچھا بڑا ہی رُوح پرور تھا۔ امیر اندلس کو یہ منظر بہت ہی بھلا لگا۔ چند دن قبل ہی وہ یہاں آیا تھا مگر اس حیثیت میں نہیں آج تو اس کے انداز ہی کچھ اور تھے۔ وہ اس فوارے کے قریب کھڑا اس حسین نظارے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ خدام اسے پہچان کر اراد کر دیں گئے ہیں اور کسی کو رو برد آنے کی اجازت نہیں۔ اگر وہ یہ سب محسوس کر لیتا تو اپنے مقام کا خیال اسے لوٹ جانے پر مجبور کر دیتا مگر اس وقت وہ سب کچھ بھلا کر یہاں تک آچکا تھا۔ اب انجیلوند سے ملے بغیر لوٹ جانا اس کے لیے آسان نہ تھا۔ ابھی وہ اپنے تصورات میں ہی گم تھا کہ اچانک ایک مترجم آواز نے اسے چونکا دیا۔

”کنیز امیر اندلس کی خدمت میں سلام پیش کرتی ہے۔“

عبدالعزیز نے گردن موڑ کر دیکھا یہ انجیلوند تھی۔ عبدالعزیز نے آج اسے دوسرے لباس اور دوسرے انداز میں دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا مگر فوراً ہی اس کے نکھرے نکھرے حسن سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ”ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم آپ کو لونڈی نہیں سمجھتے

پناہ حسن اور نظروں کا پیغام اسے دیوانہ کیے دے رہا تھا۔ جوں جوں وہ سوچتا ایک نشہ سا طاری ہو جاتا تھا۔ دل چاہتا کہ بھر جائے اور دل بھر کر اسے دیکھے جو کچھ وہ نظروں سے کہہ گئی وہ سب زبان سے کہے۔ اس تمام وقت میں اس نے خود کو بری طرح گھائل محسوس کیا۔ دوسری طرف جنرل حبیب القہدی اور ایوب بن حبیب کی تجربے کار نظریں اس سے پوشیدہ نہ تھیں۔ جس انداز میں ایوب بن حبیب نے اس وقت تنبیہی انداز میں اس سے آگے بڑھنے کی گزارش کی تھی وہ اس نے اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد جب سے اب تک اس نے جس طرح اسے اس کے مقام سے آگاہ کر کے اس کی ذمے داریوں کا احساس دلایا تھا وہ اپنے اس مشیر سے گریز کرنے لگا تھا۔ اب وہ پوری طرح تیار ہو کر کچھ اضطراب کے ساتھ کمرے میں بل رہا تھا۔ یہ کمرہ ایسی مجاہد یا مستعد امیر کا کمرہ نظر آ رہا تھا۔ دیواروں پر آویزاں اسلحہ تلوار ڈھال، نیزے، تیر و کمان اور خوب صورت ترش اپنے مالک کے سپاہیانہ ذوق کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ اپنے ماحول سے بے خبر بل رہا تھا کہ غلام نے دروازے پر کراہت طلب کی۔

”امیر محترم..... کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“

”آ جاؤ ہم تمہارے ہی منتظر ہیں۔“

امیر کی اجازت پا کر غلام اندر آ گیا اور عرض کیا۔ ”بے سوچ حکمِ اعلیٰ آپ کا گھوڑا باغ کی چھلی جانب تیار ہے۔“

”ایوب بن حبیب اس وقت کہاں ہیں؟“ امیر عبدالعزیز نے سوال کیا۔

”وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔“ غلام نے جواب دیا۔

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت وہ کہاں ہیں؟“

امیر نے دوسرا سوال کیا۔

”جناب.....“ غلام نے دست بستہ عرض کیا۔ ”میری معلومات کے مطابق اس وقت ایوب بن حبیب نصاریٰ کے ایک محلے میں تقریر کر رہے ہیں جو ابھی تک اسلام کی طرف مائل نہیں ہوا۔ ان دنوں

اس بات کو پسند نہ کرتا تھا مگر اس وقت وہ اسے ٹوکے یا شانے سے ہٹا دینے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کے خیال میں یہ حرکت انجیلونہ کی نہیں، اس کی تہذیب کی گراؤٹ تھی، یہ خطا اس کی نہیں، اس کے دین اور اصولوں کی تھی مگر وہ قابلِ رحم تھی۔ اصل چیز اس کے وہ جذبات تھے جن کے تحت وہ یہ سب کچھ کر رہی تھی لہذا اس نے آہستہ سے اس کا سر جھپایا اور دھیمی لہجے میں بولا۔ ”انجیلونہ روؤ مت، تم جس مقام کی مستحق ہو، ہم تمہیں وہی مقام دیں گے۔“ وہ دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا اور انجیلونہ روئی رہی یہاں تک کہ اس کی سسکیاں معدوم ہو گئیں۔

اس شام عبدالعزیز بن موسیٰ کا گھوڑا القصر سے نکل کر اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو رہا تھا تو انجیلونہ خوشی اور مسرت سے بھر پور انداز میں اسے رخصت کرتے ہوئے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ جب اس کا گھوڑا درختوں کے جھنڈ میں نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ٹاپوں کی آواز فضا میں معدوم ہو گئی تو انجیلونہ دوسرے دن کے انتظار کا تصور لیے واپس پلٹ آئی۔

پھر یہ ملاقاتیں ہر روز ہونے لگیں۔ عبدالعزیز بن موسیٰ جب بھی اپنی قیام گاہ سے نکلتا، اس کی سواری کا رخ القصر کی جانب مڑ جاتا۔ یہ ملاقات دو چار گھنٹوں سے کم نہ ہوتی۔ یوں بہت سے ضروری کام کل پرٹل جاتے۔ ایشبلیہ کے گوشے گوشے میں یہ خبر تیزی سے پھیلنے لگی کہ امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ ملکہ انجیلونہ کو بہت وقت دیتے ہیں۔

کچھ وقت ان حالات کی نذر ہو گیا۔ آخر ایک دن غیر متوقع طور پر چند نکلھوں نے ملاقات کے لیے اچانک ہی عبدالعزیز کو گھیر لیا۔ جزل حبیب القہدی نے کہا۔ ”امیر محترم.....! میں چند دن سے ملاقات کے وقت کا منتظر تھا مگر آپ ان دنوں بہت مصروف رہے۔ کیا آج آپ کچھ وقت دے سکیں گے؟“ یہ وہ وقت تھا جب عبدالعزیز بن موسیٰ القصر کی طرف جانے والا تھا۔ اس کا دل چاہا، ٹال دے مگر مجبوری تھی کہ آنے والے آچکے تھے۔ اس وقت ایوب بن حبیب اس کی بے قراری کو یہ غور دیکھ رہا تھا۔ یہی

اور خود آپ بھی اپنے لیے ایسا تصور نہ کیجیے۔“
”آپ کی ذرہ نوازی ہے امیر اندلس.....!“
انجیلونہ نے خاص انداز سے کہا۔ ”ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اس کے سوا کچھ نہیں ہیں۔“

اس وقت وہ کس جذبے کے تحت یہ کہہ رہی تھی، امیر اندلس سمجھ نہ سکا مگر اس کی نظروں کی باریک دلیلی کی افسردگی نے اسے مضطرب کر دیا۔ اس کا دل چاہا کہ اس کے دکھ سمیٹ لے اور اس کے دامن کو خوشیوں سے بھر دے۔ اس دن امیر اندلس اور ملکہ انجیلونہ نے اپنا ماضی دہرایا۔ اس دوران وہ کئی بار طول ہوئی کئی بار اس کی آنکھوں میں ستارے چمکے اور کئی بار اس کی آواز بھرائی۔ ہر بار امیر اندلس خود اس سے زیادہ افسردہ ہو گیا۔ اپنے تمام حالات سنانے کے بعد انجیلونہ خاموش ہو گئی۔

”آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، ہمیں اس کا بے حد رنج ہے۔“ امیر اندلس نے کہا۔ انجیلونہ نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور غمگین لہجے میں بولی۔ ”امیر اندلس.....! حقیقت تو یہ ہے کہ ان تمام حالات نے ہم سے زندہ رہنے کی خواہش بھی چھین لی ہے۔ شاہ کی موت نے ہمیں کہیں کا بھی نہ رکھا۔ اب یہ سب آپ کی مہربانی ہے کہ ہمیں قصر میں اتنی شان کے ساتھ رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے ورنہ نہ جانے آج ہم کہاں ہوتے؟“

”نہیں، نہیں۔“ عبدالعزیز بن موسیٰ جیسے بے چین ہو گیا اور بے ساختہ اس کا نام لیتے ہوئے بولا۔ ”انجیلونہ، یہ آپ کا حق ہے کہ آپ اسی شان کے ساتھ رہیں، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اسی طرح آپ کی دلجوئی کرتے رہیں گے۔“

یہ سن کر انجیلونہ ممنونیت اور خوشی سے بے قابو ہو گئی۔ اسے احساس ہی نہ رہا کہ وہ کیا کر رہی ہے، بس اس نے غیر احتیاری طور پر عبدالعزیز کے شانے پر سر رکھا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ عبدالعزیز بن موسیٰ جس کا دل اس قرب سے زور زور سے دھڑک رہا تھا، حواس باختہ ہو گیا۔ ملکہ انجیلونہ کی یہ حرکت اسلامی تہذیب کے خلاف تھی اور عبدالعزیز خود بھی

مگر اس وقت بڑے ہی تخیل سے بولا۔

”ایوب.....! تم کیا سمجھ رہے ہو؟ یقین کرو، ہم کوئی ناجائز بات نہیں کریں گے۔ ہم سب کچھ اسلام کے تحت کریں گے۔ کیا تمہیں ہم پر یقین نہیں ہے؟“

”مجھے آپ پر کمال بھروسہ ہے امیر!“ ایوب نے دکھ سے کہا۔ ”لیکن آپ صرف اتنا سوچ لیجئے کہ جو ملکہ بے پناہ آسائش دیکھ چکی ہے، کیا وہ آئندہ آپ کے ساتھ سادہ زندگی بسر کر سکتی ہے؟ اگر آپ نے اپنی زندگی کے انداز بدل دینے تو اس کا انجام جانتے ہیں؟ امیر کو دکھ کر اور بہت سے افراد وہی زندگی اختیار کر لیں گے جو امیر کی ہوگی۔ عوام تو بادشاہوں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور یہ بھی نہ بھولے کہ اندلس میں آپ کے مخالف زیادہ ہیں اور دوست کم۔ ان حالات میں ملکہ کی طرف رفاقت کا ہاتھ بڑھا کر آپ اپنے مسائل میں اضافہ کریں گے۔“

”ہم نے ہر پہلو سے غور کر لیا ہے ہر رخ سے انجیلوں کو ایک بے ضرر اور مضمون عورت پایا ہے لہذا تمہیں تردد کی ضرورت نہیں ہے۔“ امیر اندلس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور کھڑا ہو گیا۔

اس دن کے بعد سے ایوب بن حبیب میں اس موضوع پر گفتگو کا حوصلہ پیدا ہو گیا پھر وقت گزرتا رہا، ملکہ انجیلوں، امیر عبدالعزیز کے قریب آتی گئی۔ امیر عبدالعزیز عشق کے تیرے گھائل اور ملکہ اس کے منصب اور مردانہ وجاہت سے محو، اندھا دھند ایک دوسرے کی طرف بڑھتے گئے۔ اب وہی حرکتیں جو اسلام کے سنائی تھیں، غیر اختیاری طور پر سرزد ہونے لگیں۔ عبدالعزیز اپنی دلیلوں سے انہیں تہذیب گردانتا رہا۔ ایسے میں موقع بہ موقع ایوب بن حبیب سے مختلف انداز میں سمجھاتا رہا کہ امیر محترم.....! آپ اس راہ پر جا رہے ہیں جہاں خرابی ہی خرابی ہے۔“ ایسی باتوں پر عبدالعزیز بن موسیٰ چڑ جاتا۔ ”ہم نہیں سمجھ سکتے کہ آخر ایسا کرنے میں کون سی خرابی ہے؟ محبت یا شادی ہمارا ذاتی معاملہ ہے، اس سے ایسی کون سی برائی پیدا ہو سکتی ہے جسے تم غلط راہ سے تعبیر کر رہے ہو؟“

انداز عبدالعزیز کو اس سے گریز پر مجبور کر دیتا تھا، تاہم اس وقت گریز ممکن نہ تھا۔ اس نے اخلاق سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں کو اپنی نشست گاہ میں آنے کی دعوت دی۔ دیر تک اندلس کے مختلف حصوں کے حالات پر بحث ہوتی رہی۔ اس مصروفیت میں بھی امیر بار بار وقت کا احساس کرتا رہا۔ ٹھوڑی دیر بعد جب سب ملنے والے رخصت ہو گئے تو ایوب بن حبیب نے کچھ دیر قیام کی اجازت طلب کی اور بولا۔ ”امیر محترم.....! آپ نے مجھے ہمیشہ اپنا مخلص اور مشیر کہا ہے۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں؟“

اگرچہ اس انداز نے امیر عبدالعزیز کو مضطرب کر دیا مگر اس نے تخیل سے کہا۔ ”ایوب.....! تم کیا چاہتے ہو؟“

”مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے امیر محترم.....! کہ آپ نے اپنے جذبات اپنا وقت اور اپنی چاہت بڑے ہی غلط انسان کے لیے وقف کی ہے۔ ان حالات میں میرا کچھ کہنا خلاف ادب تصور کیا جائے گا اور خاموش رہنا دوستی اور وفاداری کے خلاف ہے۔“ ایوب بن حبیب نے کہا۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو، وضاحت کرو۔“

امیر عبدالعزیز انجان بیٹے ہوئے بولا۔

”میں کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جناب جس داستان سے متاثر اور جس حسن سے مرعوب ہیں وہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ ان دنوں غلی کوچوں میں مسلمان امیر کے بارے میں جو خبر گشت کر رہی ہے، اگر وہ صحیح ہے تو امیر اندلس کی توین کے سوا کچھ نہیں معاف کیجئے شاہ رزق کی بیوہ آپ کے لیے نہ شاہانہ ٹھاٹھ ترک کر سکتی ہے اور نہ اسلام قبول کر کے ایک سادہ عورت بن سکتی ہے۔ اس صورت میں اس کہانی کا انجام کیا ہوگا؟“

لمحہ بھر کے لیے امیر عبدالعزیز کو محسوس ہوا کہ ایوب بن حبیب، امیر اندلس کا مصاحب و مشیر نہیں ہے بلکہ اس کے بیچن کا وہی دوست اور ساتھی ہے جو غلط بات کو غلط کہنے میں ذرا بھی لحاظ نہ کرتا تھا۔ اگر یہ سوال کوئی اور کرتا تو شاید عبدالعزیز برداشت نہ کر سکتا

پہنایا اور صحابہ کرام نے ان کی تقلید کی پھر وہ کون سی بات تھی جو ایسا کرنے میں ان کے لیے رکاوٹ کا باعث تھی؟“

اس سوال پر عبدالعزیز بن موسیٰ لا جواب رہ گیا مگر چند لمحے سکوت کے بعد بڑی ہی بے بسی سے بولا۔ ”ایوب! خدا کی قسم یہ ہماری پسند کا معاملہ ہے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“

”امیر محترم!“ ایوب نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”آپ کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ آپ صرف ایک مرد ہی نہیں ہیں بلکہ اندلس کے مسلمانوں کے امیر بھی ہیں۔ آپ جو قدم بھی اٹھائیں گے سب مسلمان آپ کی تقلید کریں گے۔ سوچ لیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ عرصے بعد مسلمان اور نصاریٰ یوں گڈمڈ ہو جائیں کہ دوست اور دشمن کی پہچان ہی باقی نہ رہے۔ مسلمانوں میں بھی ہمارے مخالف کچھ کم نہیں ہیں۔ اس پر آپ غیر مسلموں کی طرف دست رفاقت بڑھا رہے ہیں۔ کل اگر ہر مسلمان کے گھر میں مسیحی بیوی ہوگی تو کیا یہ مسلمان وہ کارنامے انجام دے سکیں گے جو ان کے آباؤ اجداد نے انجام دیئے ہیں؟ میرے دوست! میرے امیر! جو عظیم کام خلفائے راشدین نے کئے وہ نبی امیہ کے خلیفہ انجام نہیں دے سکے جو کچھ دمشق میں رہتے ہوئے کر رہے ہیں وہ ہم سرزمین اندلس میں آکر نہیں کر سکتے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری چھوٹی سی لغزش ہماری آجندہ نسلوں کو غلط راہ پر ڈال دے۔ میرا فرض ہے کہ ایک مشیر کی حیثیت سے آپ کو یہ سب سمجھا دوں۔“

جب تک ایوب بن حبیب بولتا رہا، امیر عبدالعزیز یہ غور ستارہا مگر اس کا تصور اب بھی نہیں اور بھگ رہا تھا۔ آخر وہ اس خیال میں کھوئے ہوئے بولا۔ ”ایوب! بخدا تم تقریر خوب کرتے ہو اسی لیے بابا جان نے تمہیں ہمارا مشیر مقرر کیا تھا۔ ہم ان کے انتخاب کی داد دیتے ہیں اور تمہیں اندلس کے سب سے بڑے خطیب کا خطاب دیتے ہیں۔“

اس جملے پر ایوب بن حبیب اپنی ہنسی برداشت نہ کر سکا اور بولا۔ ”اسی لیے اندلس کے اس بڑے

”آپ کا فعل اندلس کے مسلمانوں پر برا اثر ڈالے گا۔“

امیر عبدالعزیز نے ایک دن پوچھا۔ ”تم جس خرابی کا بار بار ذکر کرتے ہو اس کی وضاحت کرو۔“

”آپ کے سوال کا جواب دینے سے قبل میں خود آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی فوج کا ہر سپاہی مسیحی لڑکیوں سے عشق کرنے لگے تو آپ کیا کریں گے؟“ سوال بڑا عجیب تھا مگر امیر اندلس نے فوری جواب دیا۔ ”ہم انہیں شادی کی اجازت دے دیں گے۔“ اس جواب پر ایوب بن حبیب تاسف کے انداز میں اس کا منہ دھکتا رہ گیا پھر طنز یہ لہجے میں بولا۔ ”آپ اپنی فوج کے ہر سپاہی کو شادی کی اجازت دے دیں گے تاکہ آپ کی آئندہ نسلیں مسیحی عورتوں کا دودھ پی کر ان کی آغوش میں تربیت پا کر اسلام سے دور ہو جائیں اور کچھ عرصے کے بعد اس قوم میں غداروں کی اکثریت ہو جائے.....؟“

لہجہ بھی تلخ تھا اور بات بھی اس وقت امیر اندلس کو امیر اور مشیر کے فرق کا احساس پیدا ہوا۔ دل چاہا ایوب بن حبیب کا منہ بند کر دے مگر آج ایوب بھی منصب کے فرق کو بھلا کر اسے برائی کا احساس دلانا چاہتا تھا اسی لیے اس نے یہ بات کہی تھی مگر امیر اندلس نے قدرے سنج ہو کر ٹوکا۔ ”ایوب! یہ مت بھولو کہ اسلام میں اہل کتاب سے شادی جائز ہے اور.....“

لیکن اندلس کے امیر کو یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اہل کتاب سے شادی کی اجازت دینے کے باوجود قرآن پاک میں خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ مشرک آزاد عورت سے مسلمان کثیر بہتر ہے اور مشرک آزاد مرد سے مسلمان غلام بہتر ہے۔ یہ بھی مت بھولیے کہ اس وقت مسیحی قوم کے عقائد مشرکانہ ہیں لہذا ایسے میں یہ شادی جائز نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھیے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی غیر مذہب عورت کو نکاح کا شرف عطا نہیں کیا۔ اس کے بعد کسی صحابی نے بھی ایسی مثال قائم نہیں کی جبکہ قرآن پاک کے ہر حکم کو نبی کریم ﷺ نے عملی جامہ

اسلامی اصولوں سے دور ہوتے گئے، مسلمانوں کے درمیان اختلاف رائے بڑھتا گیا۔ ایوب بن حبیب ان سب کو اپنی تقریروں کے ذریعے ان کی حیثیتوں کا احساس دلاتا رہا مگر یہ سب اپنی حیثیت سے گرتے گئے۔ ملکہ کی خوشی امیر اندلس کی خوشی تھی۔ ملکہ ہر وہ عیش طلب کرنی جس کی وہ عادی تھی اور امیر ان سب باتوں کو اس کی معصوم ضد اور محبوبانہ ادا میں تصور کر کے پوری کر دیتا۔ اس طرح جوں جوں وقت گزرتا گیا، انجیلونہ اس کے مزاج پر غالب آتی گئی۔ زندگی کا ایک برس چپ چاپ گزر گیا اور انجیلونہ عبدالعزیز بن موسیٰ کے بیٹے کی ماں بن گئی۔

عاصم بن عبدالعزیز ایک بہت بڑی قوت تھا، بہت بڑا ابط تھا۔ اب انجیلونہ نہ صرف ملکہ یا امیر اندلس کی بیوی ہی نہیں بلکہ ام عاصم بھی تھی۔ اب امیر اندلس کے ساتھ اس کا بھی نام لیا جانے لگا تھا۔ ادھر سلطنت اور دیگر مہمات میں اس کا بھی مشورہ ضروری ہو گیا تھا۔ ان سب کے باوجود وہ مضطرب رہتی۔ اس نے اندلس کے شاندار جشن دیکھے تھے اور وہ دلدادہ عیش اپنی سابقہ زندگی سے کچھ اس طرح محسوس تھی کہ اب امیر عبدالعزیز بن موسیٰ کی مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی اسے بہت ہی سادہ نظر آتی۔

یہ مسلمان بوریا نیشن عرب، فاتحانہ اندلس آج بھی تکلف اور بناوٹ سے پاک تھے۔ عبدالعزیز اپنے باپ موسیٰ بن نصیر کی طرح انتھک کام کرنے والا سادہ غذا اور لباس کا عادی تھا اسی لیے ایوان شاہی میں ہر عیش و آرام کے باوجود ملکہ کو طبیعتوں کی دوری اور مزاجوں کا فرق بری طرح محسوس ہوتا پھر ارد گرد سے آنے والی آوازیں اس فرق کو کچھ اور نمایاں کر دیتیں۔ انجیلونہ عبدالعزیز سے وہ کچھ طلب کرنی کہ وہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔

اس دن بھی نبی ہوا، اس صبح آفتاب کی کرنیں ایوان شاہی پر نثار ہو کر دن کے طلوع ہونے کا پیغام دے رہی تھیں۔ عبدالعزیز بن موسیٰ اپنے سپاہیانہ لباس میں ایوان سے باہر جانے کے لیے تیار تھا۔ کثیر اس کے بیٹے عاصم کو تیار کر رہی تھی۔ عبدالعزیز بن

خطیب کی تقریر اور اقی پریشاں کی طرح طاق نسیاں میں جگہ پائی ہے۔“

یہ محفل مذاق کی نذر ہو گئی مگر اس کے بعد بھی ہر نصیحت یوں ہی نظر انداز کی جاتی رہی۔ ایوب بن حبیب جس قدر انجیلونہ کے عشق کے برے پہلو نمایاں کرتا عبدالعزیز کا عشق اتنا ہی بڑھتا۔ آخر ایک دن اہل اندلس نے حیران ہو کر یہ خبر سنی کہ امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ نے شاہ لرزق کی بیوہ انجیلونہ سے نکاح کر لیا۔ اس واقعے کے دو اثرات ہوئے وہ جو مسلمانوں کو بہ زور قوت زیر کرنا چاہتے تھے، اب مطمئن ہو کر بیٹھ گئے، وہ نوجوان مسلمان سپاہی جو سبھی لڑکیوں کے عشق میں گرفتار تھے، اب ان کے ساتھ کھلے عام زندگی بسر کرنے کے عہد و پیمانہ باندھ رہے تھے۔ امیر اندلس نے انہیں خود ہی نئی راہ دکھائی تھی جس پر وہ چل پڑے تھے۔

.....

اس شادی نے عام زندگی پر جو اثر ڈالا وہ تو ڈالا ہی مگر عبدالعزیز بن موسیٰ کی زندگی بھی بدل دی۔ انجیلونہ کی محبت شادی کے بعد جیسے دیوانگی میں بدل گئی تھی، کوئی لہجہ ایسا نہ جاتا تھا کہ امیر اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف نہ رہا ہو۔ سب سے پہلے اس نے قرطبہ کے باہر انجیلونہ کے لیے نیا قصر تعمیر کروایا۔ اس کے طویل و عریض باغ میں ایک خانقاہ بنوائی جہاں بیٹھ کر انجیلونہ عبادت کرنی۔ ایک عیسائی راہب عیسائیت کی تلقین کر کے اس تعلیم کو عام کرتا۔ جب تک ملکہ عبادت میں مصروف رہتی، امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ اس کی عبادت گاہ کے باہر گھڑا رہتا۔ الغرض دیگر تمام عیش و آرام کے ساتھ امیر اندلس نے انجیلونہ کو مذہبی آزادی بھی اس قدر دی کہ وہ عیسائیت کی اشاعت اور پرچار بھی کرتی تو اسے کوئی اعتراض نہ تھا، دوسری طرف ہر روز ایک یا دو سپاہی سبھی لڑکیوں سے نکاح کی اجازت طلب کرتے۔ ملکہ و امیر کی جانب سے انہیں اجازت مل جاتی، یوں وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سبھی بیویوں میں اضافہ ہوتا گیا جن کی بدولت یہ مسلمان

”کیا مطلب؟“ عبدالعزیز بن موسیٰ نے تعجب سے دیکھا۔ ”کیا یہ عالی شان محل یہ سیکڑوں کنیریں اور خدام تمہاری شان کے مطابق نہیں ہیں؟“

”ہم رہن بہن کی بات تو نہیں کر رہے۔“ ملکہ نے اٹھلا کر کہا۔ ”ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ امیر اندلس سابقہ شاہان اندلس کی طرح قابا اور تاج استعمال نہیں کرتے بلکہ جو لباس خود زیب تن کرتے ہیں وہی ان کے خادم پہنتے ہیں۔ آخر ایک عام آدمی میں اور حاکم میں کوئی نمایاں فرق ہونا چاہیے۔ آپ ایک فاتح ہیں فرماں روائے اندلس ہیں اس حیثیت سے قبائے ارغوانی اور تاج شاہی.....“

”ام عاصم.....!“ عبدالعزیز بن موسیٰ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ اسلام میں آقا اور غلام کے لباس میں کوئی فرق نہیں صرف ذمے داریوں کا فرق ہے۔ غلام کی ذمے داری محدود اور آقا کی لامحدود ہے۔ جہاں تک تاج اور قابا تعلق ہے، خلفائے بنو امیہ تاج یا ٹوپی نہیں پہنتے بلکہ سر پر صرف عمامہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں ہمارا تاج پہننا ایک جرم ہے۔ ہم ان سب سے ہٹ کر تو نہیں ہیں۔“

”لیکن آپ اندلس کے امیر ہیں اور قدیم شاہان اندلس کے رعب و داب کا تازہ کرنا اور ان کے دساتیر کو اپنانا آپ پر لازم ہے۔“ انجیلونہ نے بحث شروع کی۔ ”نہیں۔“ عبدالعزیز بن موسیٰ جھنجھلا گیا۔ ”مسلمان جہاں جاتے ہیں اپنے ہی دستور رائج کرتے ہیں کیوں کہ ان کے دستور اسلامی اصول ہیں اور ہم بھی اسلامی اصولوں اور بزرگوں کے طریقوں سے نہیں ہٹ سکتے۔ ہم کہے دیتے ہیں کہ آئندہ ایسا فضول خیال دل میں کبھی مت لانا۔“

اس دو ٹوک جواب پر انجیلونہ کی آنکھیں بھر آئیں اور عبدالعزیز بن موسیٰ کو محسوس ہوا کہ وہ دریائے وادی الکبیر کے کنارے کھڑا ہے اور زیر آب کشتیاں ڈوب رہی ہیں۔ وہ ان آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی ملول ہوا اور قدرے دھیمے لہجے میں بولا۔ ”ہم سمجھ نہیں سکتے کہ تم

موسیٰ تیار ہوتے ہوئے بے قراری سے انجیلونہ کا منتظر تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب بوڑھے راہب کے ہاتھ پر تو یہ استغفار کر کے انجیلونہ محل میں واپس آئی تھی اور عبدالعزیز اسے الوداع کہہ کر دیوان خانے میں چلا جاتا تھا۔ آج بھی اسے بہت دیر انتظار کرنا نہیں پڑا۔ اس نے دیکھا، چست و عریاں لباس میں ملبوس، گھلے ہوئے بال اور گیلے میں پھوٹی سی صلیب ڈالے انجیلونہ چلی آ رہی تھی۔ یہ دونوں چیزیں اسلام کے منافی تھیں مگر وہ مذہب کے معاملے میں سخت گیر نہ تھا۔ دوسرے یہ لباس جس قدر ناپسندیدہ محسوس ہوتا، انجیلونہ کے حسن کو اتنا ہی محسوس کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی اس نے دیکھا کہ عبدالعزیز بن موسیٰ حسب معمول اپنے سپاہیانہ لباس میں تھا۔ یہ لباس اس کے قد اور جسم پر بچتا تھا مگر اسی وضع قطع کا لباس امیر کا خادم بھی پہنتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے انجیلونہ کے چہرے سے مسرت اور فخر کا رنگ اڑ گیا اور وہ افسردہ ہو گئی۔ عبدالعزیز بن موسیٰ نے رنگ کے اس تغیر کو بخورد دیکھا اور محبت پاش لہجے میں بولا۔

”ام عاصم! ہم تمہیں افسردہ محسوس کر رہے ہیں کیا بات ہے؟“

”صد شکر کہ غم ہمیں ایک برس سے رنجیدہ کر رہا ہے، اسے امیر اندلس نے محسوس تو کیا۔“ انجیلونہ نے قدرے غظبی سے کہا۔

عبدالعزیز اس انداز تخاطب سے حیران رہ گیا اور بولا۔ ”ام عاصم! ہم سمجھ نہیں سکتے کہ تمہیں کون سا غم ہے؟ ہم نے تمہارے لیے ایسا قصر تعمیر کرایا جو اندلس کے کسی شہنشاہ نے اپنی ملکہ کے لیے نہ کرایا ہوگا۔ اس قصر میں تمہارے لیے پیش و آرام کا ہر سامان مہیا کیا۔ اس کے باوجود بھی تم تمکین ہو آ خر کیوں؟“

یہ سنتے ہی انجیلونہ نے عبدالعزیز بن موسیٰ کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں اور بڑے انداز سے بولی۔ ”کیا ہمیں افسردہ کرنے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہمارا قابل فخر شوہر اپنے مرتبے اور شان کے اعتبار سے زندگی نہیں گزارتا جس کے باعث ہم بھی متاثر ہوتے ہیں؟“

ساعت نے اس کی سوچوں کے رخ موڑ دیئے۔ بڑے ہی عزم کے ساتھ طویل راہوں کو چلتے قدموں سے طے کرنے والے مسافر کے قدم ایک دم سے ڈگمگائے اور ایک نئی راہ کی جانب اٹھ گئے۔ عبدالعزیز بن موسیٰ اسلامی اُخت، سادگی اور صحیحہ کرامت و خلفائے راشدین کے مسلک کو چشم زدن سے فراموش کر بیٹھا۔ اسے کوئی احساس تھا تو صرف اتنا کہ اس کی بیوی اس کے رو برو جھگی ہوئی فریاد کر رہی ہے۔ اس نے بڑی ہی نرمی اور لطافت کے ساتھ اسے چچہ شانوں کے سہارے اونچا کیا اور شرارت کے سحر ز میں بولا۔ ”فریادی“ کیا چاہتے ہو اپنی خواہش بیان کرو۔“ اس جیلے پر انجیلونہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس کا حسن امیر کو اسی راہ پر لے آیا تھا جہاں وہ لانا چاہتی تھی مگر اپنی بے پناہ خوشی کو چھپاتے ہوئے وہ بڑی ادا سے بولی۔ ”فریادی یہ ہے، اے اندلس کے باشندوں سے انصاف کرنے والے اے شجاعت و سخاوت کے پیکر، صرف آج ہماری خاطر اپنے سر سے یہ عمامہ یہ عربی صاف اتار کر اس عظیم تاج شاہی کو سر پر رکھ لیں اور دیکھیں کہ آپ کیسے گلتے ہیں مان لیجئے، آپ کو ہماری محبت کی قسم.....“

عبدالعزیز بن موسیٰ کا دل اس ادا پر لوث گیا۔ اظہار خواہش کے اس انوکھے انداز پر اس نے وابہ نہ انداز میں اسے دیکھا اور بولا۔ ”اے خوب صورت ساحرہ، تو روم، الکبریٰ اور القصر کے نعمت یافتہ امیر کی صدائے بازگشت سن چکی ہے۔ خدا کی قسم تیرا انداز جتنا بھی حسین ہو، کم ہے۔“

”کینز امیر سے اپنی بات کا جواب چاہتی ہے۔“ انجیلونہ نے لوبا گرم دیکھا تو آخری ضرب لگائی۔ عبدالعزیز بھول گیا کہ مدتوں سے جس بات وہ رد کر رہا ہے، ملکہ ہی بات اس سے منوار ہی ہے۔ اس نے کہا۔ ”ہم ملکہ کو اس کی آرزو پوری کرنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن یاد رہے کہ یہ کام ان حسین ہاتھوں سے ہی تکمیل پائے۔“ یہ کہتے ہوئے عبدالعزیز نے اس کے دونوں ہاتھوں کو لیے مگر اس وقت وہ اس کی محبت سے زیادہ اپنی بات منوالینے پر خوش نظر آ رہی

اتنی چھوٹی باتوں پر کیوں اداس ہو جاتی ہو؟ ہم نے شادی کے وقت وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہارے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دیں گے تم اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ ہم اسلامی اُخت اور سادگی ترک نہیں کر سکتے۔ ہم تو اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہیں مگر تم اس بات کو فراموش کر نہیں۔“

انجیلونہ لاجواب ہو گئی مگر اعتراف کرنے کی عادی نہ تھی، کوئی اور صورت نہ پا کر وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اس وقت عبدالعزیز بن موسیٰ پریشان سا کھڑا تھا۔ ملکہ روتے ہوئے بولی۔

”امیر! اپنے غلاموں سے برادرانہ سلوک کرتے ہیں، عام لوگوں جیسا لباس زیب تن کرتے ہیں، ان سب کو اپنے قریب بٹھا کر باتیں کرتے ہیں۔ ہم یہ سب کچھ گوارا نہیں کر سکتے مگر برداشت کرتے ہیں، محض آپ کے لیے، آپ کی خوشی کے لیے، ملکہ ہو کر بھی ہم عامیاناہ باتیں برداشت کرتے ہیں تو کیا آپ ہماری خوشی کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ صرف تاج سر پر رکھ لیں؟“

محبوب بیوی کی اس خواہش پر عبدالعزیز بن موسیٰ کی حالت قابل دید تھی۔ اس نے اس فتنہ روزگار دلدادہ عیش عورت کو لاجاری کے انداز میں یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”تم کیا جانو انجیلونہ، ہم تمہارا یل بے کیا کیا کر سکتے ہیں مگر تمہیں ہماری محبت کی قدر کرنا نہیں آتی۔ مگر اس نے یہ سب نہ کہا اور انجیلونہ اس کے جذبات سے بے خبر امید و بیم کی حالت میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

امیر عبدالعزیز نے کہا۔ ”ام عاصم! اس بوریائیں عرب کی بیوی بن کر بھی تمہارے ذہن سے بونے سلطنت نہ گئی؟“ اس کے انداز میں تشبیہ بھی تھی اور محبت بھی۔ انجیلونہ نے برجستہ کہا۔ ”ہم بوریائیں عرب کی بیوی نہیں، امیر اندلس کی ملکہ ہیں، لیکن آج صرف ایک لوٹری بن کر فریاد کرنا چاہتے ہیں۔“ یہ فقرہ کہتے کہتے وہ جھک گئی، حسن کا یہ انداز بڑا ہی عجیب تھا۔ عبدالعزیز کو محسوس ہوا کہ اس کی بیوی نہیں بلکہ ماہِ کامل قدموں میں جھک آیا ہے۔ اسی لمحے ایک

مسلمان امیر نے شہنشاہ کا روپ دھارا ہو۔ اس سے قبل ہر چند کہ ہوامیہ میں امارت کی شان آگئی تھی مگر شہنشاہیت کے انداز نہ تھے لہذا مسلمانوں کی اکثریت چراغ پا ہو رہی تھی۔ اس وقت اندلس کے مسلمانوں کی اکثریت دگرگو ہوں میں تقسیم ہو کر گلی کوچوں میں بخت و مباحثہ کر رہی تھی۔ ایک وہ طبقہ تھا جو ہرم کے نضغ اور بناوٹ سے پاک اندلس میں اسلام کی اشاعت کو اپنا فرض سمجھ رہا تھا۔ ان کے ذہنوں میں امیر کے نام کے ساتھ ہی صدیق اکبر اور فاروق اعظم کا تصور لہرا جاتا تھا۔ ان کے باپ دادا نے خلفائے راشدین کا زمانہ دیکھا تھا لہذا ان کے لیے یہ صورت حال تشویش ناک تھی۔ مسلمانوں کا دوسرا طبقہ وہ تھا جنہوں نے امیر اندلس کی تقلید میں مسیحی لڑکیوں سے شادیاں کر لی تھیں۔ وہ ان تبدیلیوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے لہذا جگہ جگہ بحث و تکرار سنائی دینے لگی۔ کسی نے کہا: امیر اندلس نے اس کام کی ابتدا کر کے اچھا نہیں کیا۔ یہ مسیحی ملکہ چور دروازے سے حکم عدولی اور عیش پرستی کی بری رسوم کو امیر کے گھر میں داخل کر کے اسے غلط راہ پر ڈال رہی ہے۔ قبائے ارغوانی اور تاج شاہی کا استعمال نامناسب ہے۔ یہ سن کر ایک نصرانی بیوی کے مسلمان شوہر نے طنز کیا۔ ”تم جیسے لوگوں نے اسلام کو غلط انداز میں پیش کر کے بدنام کر دیا ہے۔ لوگ اسلام کا نام سن کر الجھ جاتے ہیں۔ ارے بھائی! ہمارے دین میں قبا اور تاج کے استعمال پر پابندی نہیں ہے۔ کیا ہوا اگر امیر اندلس نے اسے رواج دے دیا؟“ اس پر اسلام کا ایک شیدائی گرج کر بولا۔ ”تم تو یہی کہو گے جو اب نہ مسلمان رہے ہونہ نصرانی۔ تمہارے گھروں میں عیسائیت کے چرچے ہیں اور باہر تم مسلمان بنے پھرتے ہو تمہاری اولادوں میں دوغلا خون ہے۔“

ادھر یہ جھگڑے ہو رہے تھے جنہیں ایوب بن حبیب سنبھالنا چاہتا تھا اور ادھر سازشی ذہن رکھنے والے تاج پوشی کی رسم کی خبر بڑے خوب صورت انداز میں دمشق پہنچا رہے تھے جہاں سلیمان بن عبد الملک خلیفہ بنا تھا۔ ان سازشی لوگوں کا مقصد موسیٰ بن نصیر

تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑائے اور تالی بجائی جسے سنتے ہی غلام حاضر ہوا تو وہ بولی۔ ”وہ تھال اٹھا لاؤ جس میں ہم نے تاج شاہی سجا رکھے ہیں۔“

یہ سن کر عبدالعزیز بن موسیٰ ایک ساعت کے لیے حیران رہ گیا، گویا وہ یہ پروگرام کئی دن سے تیار کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد موسیٰ غلام ایک بڑا طشت لیے حاضر ہوئے جس میں چھتیس تاج رکھے ہوئے تھے جو نہ جانے کس طرح سے موسیٰ بن نصیر کی نظروں سے بچ گئے ورنہ وہ دیگر تمام مال غنیمت کے ساتھ بیت المال میں ہی ہوتے۔ عبدالعزیز کو انجیلوں کی محبت نے یہ سب سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ چشم زدن میں خوب صورت انجیلوں پٹی اور اپنے ہاتھوں سے عبدالعزیز کے سر سے عربی صافہ اتار کر سب سے خوب صورت تاج اس کے سر پر رکھ دیا اور اسے آئینے کے دیوڑھے جانی ہوئی خوشی سے چبکی۔ ”امیر اندلس سچ کیے! آپ کی شان کے مطابق یہ عربی صافہ ہے یا تاج شاہی؟“

عبدالعزیز بن موسیٰ نے قد آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھا بلاشبہ اس کی شخصیت میں غیر معمولی تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ ایک ایسا نوجوان شہنشاہ نظر آ رہا تھا جس کی امارت اور رعب ہر فرد کو مرعوب کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے خود کو دیکھنے کے بعد ایک نظر قریب کھڑی ہوئی انجیلوں کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں سے مسرت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ وہ بے خود ہو کر بولی۔ ”امیر اندلس! کیا یہ اعزاز آپ ہمیں نہیں بخشیں گے؟“

عبدالعزیز بن موسیٰ کو محسوس ہوا کہ وہ اس آرزو کو رد نہیں کر سکتا۔ اس نے بڑی نفاست اور آہستگی سے طشت میں سے دوسرا تاج اٹھایا اور ملکہ انجیلوں کے سر پر رکھ دیا۔

اس شام باقاعدہ تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی اور حکم جاری کیا گیا کہ عمائدین شہر مسلمان ہوں یا نصرانی سب دربار میں حاضر ہو کر امیر اندلس اور ملکہ اندلس کو مبارکباد پیش کریں۔

اسلامی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب ایک

اور اس کے فرزند کو خلیفہ کی نظروں سے گراناتا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نے موسیٰ بن نصیر جیسے جنرل کو ایک معمولی سی اعزاز پر قید کر دیا تھا پھر قید خانے سے نکال کر مال و متاع ضبط کر کے وادی القفرہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ اس خبر نے عبدالعزیز بن موسیٰ کو حواس باختہ کر دیا۔ اس رات وہ افسردہ سا چشم تصور سے اپنے باپ کو زندان میں بے بسی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اسے احساس ہی نہ رہا کہ ملکہ انجیلونہ اس کے سینے پر سر رکھے کتنی دیر سے اس کی اداسی کو محسوس کر رہی ہے۔ آخر وہ خود ہی بولی۔ ”امیر! کیا سوچ رہے ہو؟ دمشق میں آپ کے باپ پر ظلم ہو رہا ہے اور آپ کچھ نہیں کر رہے؟“

”ام عاصم!“ عبدالعزیز نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ہم کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتے جو مسلمانوں کے لیے نقصان کا باعث بن جائے۔ دمشق کی خلافت اور اندلس کی امارت جدا نہیں ہے۔ نہ بابا جان ہی اس بات کو پسند کریں گے کہ مسلمان آپس میں ٹکرا جائیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں؟“

ملکہ انجیلونہ نے محسوس کیا کہ عبدالعزیز بن موسیٰ کے اندر ابھی مسلمان مرد موجود ہے۔ وہ مسلمان جو بہر صورت اسلام کی حفاظت چاہتا ہے۔ انجیلونہ اسے اندلس کا وہ بادشاہ دیکھنا چاہتی تھی جو ذاتی عزت نفس کے لیے ہر حکم جاری کر دیتے تھے۔ وہ دھیرے سے بولی۔ ”آپ کو چاہیے کہ اپنی قوت بڑھائیں۔ اندلس کے مسلمان آپ کے ساتھ ہیں آپ یہاں کے تمام نصاریٰ کو اعتماد میں لیجئے، میں بھی آپ کی خوشی کے لیے عیسائی امراء کو آپ کی قوت بنانے کا فرض ادا کروں گی پھر آپ اندلس کی امارت کو دمشق کی خلافت سے آزاد کرا لیجئے۔ جب آپ خود مطلق العنان حکمران بن جائیں گے تو خلیفہ دمشق آپ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔“

عبدالعزیز بن موسیٰ نے بغور اس مشورے کو سنا اور دھیرے سے بولا۔ ”ام عاصم! تم اس بات کو سمجھ نہیں سکتیں، ہمارے اس اقدام سے مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے جو ہم نہیں چاہتے۔“

”اونہہ.....“ انجیلونہ نے بڑی توجہ سے کہا۔ ”جو مسلمان حکومت آپ کے باپ نے خود کما اعتراف نہیں کر رہی ہے اتنی بڑی فتوحات پر نہ حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے ان پر تشدد کرتے ہیں۔ آپ خود بھی ہمیشہ اسی کے تحت رہنا چاہتے ہیں۔ مسیحیت ہوں اگر آپ یوں ہی وفاداری کا ثبوت دیتے رہے تو آپ کا انجام بھی اپنے باپ سے مختلف نہ ہوگا لہذا جتنی جلد ممکن ہو اپنی طاقت بڑھائیے۔“

امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کی زندگی کے انداز ایک دم سے بدل گئے۔ مسلمانوں نے اس بات کو واضح طور پر محسوس کیا۔ اندلس کے نصاریٰ کو مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں کی امارت بھی دی جانے لگی۔ متعدد شہروں میں عیسائی ناظم مقرر کیے گئے جو اسے وہی حیثیت دیتے جو قدیم شاہان اندلس کو دیتے تھے۔ آئے دن ایوان شاهی میں نصرانی امراء امیر کی خدمت میں حاضر ہوتے، مختلف معاملات میں مشورے دیتے، جس بات کی تائید ملکہ کر دیتی، وہ امیر اندلس کے لیے لازم ہو جاتی۔ اس صورت حال سے مسلمانوں میں خاصی بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مخالفین بہت تھے جو ہر خبر کو نیارنگ دے کر خلیفہ سلیمان بن عبد الملک تک پہنچا رہے تھے۔ وہ لوگ جو دل سے عبدالعزیز بن موسیٰ کے خیر خواہ تھے، مایوس ہوتے جا رہے تھے۔ مستزاد یہ کہ شہروں کے مسیحی ناظم مزید تشویش کا باعث بن رہے تھے۔ ان دنوں امیر اندلس کے طرز زندگی پر مسلمانوں سے سرور و مطمئن تھے تو صرف وہ مسلمان جن کی بیویاں نصرانی تھیں اور ملکہ انجیلونہ تک رسائی حاصل کر کے دربار میں اہم مقام حاصل کر چکی تھیں۔ ان دنوں ایوان شاهی کو یاسیسوں کا ٹرہ بن گیا تھا۔ مسلمانوں کی اجازت لے کر مسلمانوں کی مسیحی بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ خانقاہ جانے لگیں، یوں حیثیت تعلیم عام ہونے لگی ہر چند کہ مسلمانوں نے عیسائیت اختیار نہ کی مگر نصرانی بیویوں کے سبب وہ بھی سرد سے دور ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دو سے بھائی جن میں ایک کی بیوی مسلمان اور دوسرے نہ

قوت نہیں ہیں؟ وہ آج بھی آپ کے خیر خواہ ہیں، دوست ہیں۔ سچ بتائیے کہ ان تمام مسلمانوں کا حق ان مسیحیوں سے زیادہ نہیں ہے جو کل تک اسلحہ لگا لگا کر میدان میں آتے اور آپ کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ اگر آپ ان کے قابو میں آجاتے تو کیا آپ امیر اندلس ہوتے؟ جن مسلمانوں کی قوت کی بدولت آپ اندلس کے امیر ہیں، ان پر آپ نے ان نصرانیوں کو مقرر کر دیا ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ لوگ صرف اس لیے ہیں کہ آپ امیر ہیں مگر آپ نہیں جانتے کیوں کہ آپ کو بیرونی بغاوت نہیں، اندرونی سازش تباہ کر رہی ہے۔ میں یہ کہنے کے لیے معافی چاہوں گا کہ حسن کے مشوروں پر کان دھرنے والے اچھے حکمران نہیں ہوتے۔“

ایوب بن حبیب نے وہ بات کہہ دی تھی کہ امیر اگر چاہتا تو بدترین سزا بھی دے سکتا تھا مگر اس وقت اس کی جبین پر نظرات کی شکنیں تھیں۔ وہ اس پرندے کی مانند تھا جو شکاری کے جال میں پھنس گیا ہو۔ اس نے بے چارگی سے کہا۔ ”ایوب، خدا کی قسم ہم آج بھی مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں لیکن اپنے مستقبل سے خائف ہو کر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اب تم ہمیں مشورہ دو کہ ہم کیا کریں؟“

ایوب بن حبیب نے چند لمحے غور کیا پھر بولا۔ ”امیر اندلس کے لیے میرا مشورہ صرف اتنا ہی ہے کہ آپ فوری طور پر خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کو اپنی اطاعت کا یقین دلائیں اور ذہن سے یہ بات فراموش کر دیں کہ وہ آپ کے باپ سے تھا ہیں۔ اگر خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کو آپ سے کوئی دشمنی ہوتی تو وہ مطلق العنان ہیں، آپ کو اندلس کی امارت سے معزول بھی کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے خدشات بے بنیاد ہیں۔ آپ انہیں اپنی اطاعت کا یقین دلائیں، میں یہاں کے برگشتہ مسلمانوں کے دلوں سے کدورت صاف کر دوں گا مگر خدارا آپ خود بھی ان سے خطاب کیجیے اور ہر روز ملاقات کا وقت دیجیے۔“

یہ بات سن کر عبدالعزیز بن موسیٰ نے اطمینان کا

نصرانی تھی ایک دوسرے کے شدید مخالف نظر آتے اپنی اپنی بیویوں کے عقیدوں سے متاثر ہو کر وہ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح اختلاف رائے نے نفرت اور بغض کی شکل اختیار کر لی تھی۔

ان تمام حالات نے ایوب بن حبیب کا صبر و قرار لوٹ لیا تھا۔ وہ عجیب و غریب حالات کا شکار تھا مثلاً موسیٰ بن نصیر کا انجام، اندلس کے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت، اسلامی اصولوں کی پامالی اور خانہ جنگی و بغاوت کے آثار، مستزاد یہ کہ امیر عبدالعزیز بن موسیٰ سے ملاقات میں رکاوٹیں۔ انجیلو نہ ہر دم اس کے ساتھ رہتی اور دربار میں خوشامد یوں کا جھگھکا نظر آتا۔ ایک دن بڑی ہی کاوش کے بعد ایوب بن حبیب کو عبدالعزیز سے ملاقات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ اس دن صبح کے وقت انجیلو نہ اپنی عبادت گاہ میں مصروف تھی اور امیر اندلس اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک ایوب بن حبیب وہاں پہنچا اور بولا۔ ”محترم، کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ عبدالعزیز نے چونک کر اسے دیکھا اور باریابی کی اجازت دی۔ وہ اندر جا کر بلا تمہید بولا۔ ”میں اس اندازِ مخاطب پر معافی کا خواستگار ہوں مگر صرف یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ فرماں روئے اندلس غلط راہ پر جا رہے ہیں۔“

”ہم تمہاری بات نہیں سمجھے ایوب، وضاحت کرو۔“ عبدالعزیز بن موسیٰ نے کہا۔

”آپ نے ہر شہر اور ہر علاقے میں مسیحی ناظم مقرر کیے ہیں۔ یہ بات باعث خیر نہیں ہے۔ اس سے آپ کے مسلمان عرب ساتھی مایوس ہو رہے ہیں۔“ ایوب نے کہا۔

”ایوب.....!“ عبدالعزیز نے صفائی سے کام لیا۔ ”ہم اپنی قوت بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ دمشق کی حکومت کے شر سے محفوظ رہیں۔“

یہ سن کر ایوب بن حبیب نے بڑے ہی افسردہ انداز میں امیر اندلس کی جانب دیکھا اور کہا۔ ”امیر محترم، جن مسلمانوں نے میدانِ جنگ میں آپ کے والد کا اور آپ کا مسلسل ساتھ دیا ہے، کیا وہ آپ کی

واقف ہیں مگر یہ مت بھولو کہ تمہارا شوہر مسرت ہے اور مسلمانوں میں جھگ کر سلام کرنا جائز نہیں ہے۔

”لیکن آپ اس ملک کے امیر ہیں جس میں مسلمانوں کی نہیں نصاریٰ کی اکثریت ہے۔“ نجیونہ نے جواب دیا۔

اس دن امیر عبدالعزیز نے پوری قوت سے اس طوفان کو روکنا چاہا مگر انجیلونہ کی دلیلوں کے سامنے سب کوششیں بے کار گئیں۔ اس ملکہ نے بھی زپن سے قائل کرنا چاہا، کبھی اشک بہائے، کبھی بے پناہ حسن کے نت نئے انداز سے اسے منانا چاہا یہاں تک کہ چند دن اسی بحث کی نذر ہو گئے۔ امیر عبدالعزیز نے بار کر ایک دن حکم جاری کیا۔ ”نصاریٰ اندلس حسب رواج قدیم امیر کے لیے زمین یوں ہو کر کورش بجالائیں.....“ عیسائیوں نے اس حکم کی تعمیل بلا تردد کی مگر اس نئی رسم نے مسلمانوں میں آگ لگا دی۔ اس آگ کو ایوب بن حبیب بھی ٹھنڈا نہ کر سکا۔ چند دن اسی ہنگامے کی نذر ہو گئے۔ کبھی سردار دربار میں جا جا کر امیر عبدالعزیز اور ملکہ کو سجدہ کرتے مگر مسلمان ”السلام علیکم!“ کہتے۔ شاید کچھ دن میں معاملہ ٹھنڈا ہوتا مگر ملکہ کو ایک نئی ضد لگ گئی اس نے کہا۔

”امیر اندلس رعایا میں شامل نصاریٰ تو آپ کو سجدہ کرتے ہیں مگر مسلمان صرف سلام کرتے ہیں۔ یہ فرق بڑا ناپسندیدہ ہے۔“

”ام عاصم.....“ عبدالعزیز نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”مجھے کسی کوشش کرو مسلمانوں میں خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنا شرک ہے۔ اگر ہم ایسا کرنے کا حکم دیں گے تو بغاوت ہو جائے گی۔“

”بغاوت اس لیے ہوگی کہ آپ کمزور ہیں۔“ انجیلونہ نے طنز کیا۔ ”جہاں تک جھکنے کا تعلق ہے مسلمان اختیاری نہیں غیر اختیاری تو جھکیں گے۔“

”کیا مطلب؟“ امیر عبدالعزیز کچھ نہ سمجھا۔

”مطلب یہ کہ دیوان خانے میں اتنی چھوٹی کھڑکی بنوائے جس سے گزر کر اندر آنے والے مسلمانوں کو سجدے کے انداز میں جھکنا پڑے اور وہ اس کے درمیان سے ہو کر امیر اندلس کی خدمت میں

سائنس لیا۔ بڑے عرصے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ تردد کے بادل چھٹ گئے۔ اس نے مکر کر ایوب بن حبیب کو دیکھا اور بولا۔ ”ایوب تم واقعی میرے بہترین دوست ہو۔ اچھا اب تمام باتوں کو کھلی جامہ پہناؤ اور صدر نشینی کے موقع پر دمشق کے خلیفہ کے لیے تحائف اور ہماری جانب سے امیر المومنین کی خدمت میں ایک مکتوب روانہ کرو جس میں ہماری طرف سے وفاداری اور اطاعت کا یقین دلایا گیا ہو۔“ ابھی گفتگو اسی قدر ہوئی تھی کہ انجیلونہ کی آمد نے موضوع بدل دیا اور چند منٹ ہی گفتگو کرنے کے بعد ایوب بن حبیب رخصت ہو گیا۔

یہی زمانہ تھا جب پہلی مرتبہ اندلس کے امیر عبدالعزیز بن موسیٰ کی جانب سے دمشق کے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی خدمت میں قیمتی پارچہ جات اور بے شمار ہیرے جواہرات بطور تحفہ روانہ کیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ خط بھی تھا جس میں امیر اندلس نے اپنی اطاعت کا یقین دلایا تھا۔ اس وفد کو روانہ کرنے کے بعد ایوب بن حبیب نے اپنی تمام مقررانہ صلاحیتیں اندلس کے مسلمانوں کے لیے وقف کر دیں۔ اس کی تقریر نے بہت حد تک مسلمانوں کو متحد بھی کر دیا تھا مگر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اندلس کے امیر کو قدرت میں دھکیل دیا۔ اس وقت ایوب بن حبیب کی ہر مخلصانہ کوشش بے کار لگی۔ اندلس کے مذہب دوست حکمران دیکھتے ہی رہ گئے اور یہ سچی بیوی کا حسن پرست شوہر ہمیشہ کے لیے معتبوب ہو گیا۔

ایک دن ملکہ نے اسے مخصوص اور چاہنے والے انداز میں کہا۔ ”امیر اندلس آپ کو معلوم ہے کہ اندلس میں قدیم رواج کے مطابق رعایا شہنشاہ کو جھک کر سلام کرتی ہے؟“

امیر عبدالعزیز بن موسیٰ چونک پڑا۔ اسے محسوس ہوا کہ ملکہ کے اس فقرے کے پیچھے بہت بڑی سازش پوشیدہ ہے۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور لاچارگی سے بولا۔ ”ام عاصم! ہم اندلس کے ہر رواج سے

عبدالملک کے حکم پر مجبور ہیں۔“

یہ سنتے ہی امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ زین بن مویٰ کے چوراہے پر لے گئے۔

ایوب بن حبیب نے اس منظر کو بڑے دکھ سے دیکھا۔ اس وقت بہت سے مسلمان خانقاہ میں گھس گئے اور ملکہ انجیلونہ کو بالکل اسی انداز سے گھنٹتے ہوئے اس چوراہے پر لے گئے جہاں امیر اندلس کا سرتن سے جدا کیا جا چکا تھا۔ ایوب بن حبیب نے ملکہ کو دیکھا اور سچ لہجے میں بولا۔ ”امیر عبدالعزیز عمر بھر ساتھ دیتے رہے آج یہ اس حالت میں ان کا ساتھ دے گی۔“ پھر ملکہ چلائی رہی مگر اس کا سر بھی تن سے جدا کر دیا گیا۔

اس وقت لوگ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ دربار خلافت سے دو حکم جاری کیے گئے تھے اول یہ کہ امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ کو قتل کر دو اور اس کا سر دربار خلافت میں بھیج دو دوسرا حکم یہ تھا کہ اندلس میں اپنی مرضی سے امیر مقرر کر دو۔“

اس وقت کسی دانائے کہا۔ ”حسب پرست عبدالعزیز بن موسیٰ کو برائی سے روکنے اور مسلمانوں کی خوشحالی کی سب سے زیادہ کاوشیں ایوب بن حبیب نے کی ہیں لہذا وہی امارت کا مستحق بھی ہے۔“ اس وقت ایوب بن حبیب خدواید عالم کے اس حکم کی زربل تلاوت کرتے ہوئے اپنے ایمان اور یقین کو مستحکم محسوس کر کے عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کو عبرت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”اے ایمان والو! مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں نکاح مت کرنا کیوں کہ مشرک عورت خواہ تم کو کیسی بھی بھلی لگے اس سے مومن لوٹتی بہتر ہے اور مشرک مرد جب تک وہ ایمان نہ لائیں مومن عورتوں کو ان کی زوجیت میں مت دینا کیوں کہ مشرک مرد سے خواہ وہ تم کو کیسا ہی بھلا لگے مومن غلام بہتر ہے۔ یہ مشرک تم لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔“ (البقرہ آیت نمبر ۲۲۱)

☆☆.....☆☆

حاضر ہوں۔ ایسے میں وہ لامحالہ امیر کے سامنے جھک کر آئیں گے۔“

اس ترکیب پر عبدالعزیز بن موسیٰ جیسے سن ہو گیا۔ یہ عورت غیر معمولی ذہین رکھتی تھی مگر نبل اس کے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا اس بات کو رد کرتا انجیلونہ امیر کے قریب آئی اور بولی۔ ”ہمارے خیال میں آپ قابلِ تعظیم ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر فرد آپ کی تعظیم کرے۔“

عبدالعزیز بن موسیٰ نے بارگاہ حسن میں ایک بار پھر ہتھیار ڈال دیئے۔ سردارانِ عرب کی آمد کے لیے دیوان خاص میں ایک اتنی چچی کھڑکی بنوائی گئی کہ امیر اندلس کے لیے رو برو آنے کے لیے ہر مسلمان کو سر جھکانا اور گھٹنوں کے بل گھسنا پڑتا یوں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے لگے۔ ان میں وہ عرب بھی تھے جنہوں نے صحابہ کرام کی محفلیں دیکھی تھیں۔ آج امیر اندلس کے رو برو سجدے کے انداز میں حاضر ہوتے تو دیکھنے والے چیخ پڑتے۔

عبدالعزیز بن موسیٰ کے خلاف نفرت پھیل گئی پھر یہ نفرت اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ اندلس کے مظلوم مسلمانوں نے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے حضور فریاد لے کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک صبح امیر عبدالعزیز بن موسیٰ ایوانِ شامی کے باغ میں خانقاہ کے باہر کھڑا انجیلونہ کی عبادت سے واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ حسب معمول توبہ و استغفار کے بعد اپنے راہب سے درس سن رہی تھی۔ اس وقت چند بڑے عہدے دارنگی تواریس ہاتھوں میں لیے باغ میں داخل ہوئے۔ امیر اندلس نے حیران ہو کر دیکھا تو کسی مسلمان عہدے دار نے دکھ سے کہا۔ ”امیر..... ہماری نیت پر شک نہ کیجیے ہم آج بھی اسلام کے مسلمانانِ اندلس کے اور آپ کے خیر خواہ ہیں لیکن یہ دربار خلافت کا حکم ہے۔“ امیر عبدالعزیز بن موسیٰ معاملے کو سمجھ گیا شاید وہ اس وقت فرار کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جزل حبیب الشہدی نے کہا۔ ”امیر فرار کی کوششیں بے سود ہیں۔ شامی ایوان کا مکمل طور پر محاصرہ کیا جا چکا ہے۔ ہم خلیفہ سلیمان بن

حج بیت اللہ سے بڑی ایران تازہ دروں کا شکر کرنے والی روداد

گملا ہے بابِ رحمت

نور شرفی کی کہانیاں

ذکر اُس رب کا جو زباں پہ آتا ہے
دل میرا اُس سے ہی سکون پاتا ہے

سببِ غزالہ یہاں

پروردگار تیرا شکر ہے تیرا کرم ہے تیرا فضل ہے..... تو نے اپنے گھر کی زیارت کے لیے بلایا..... اپنے حبیب ﷺ کا روضہ دکھایا۔“

”نہ میرے اعمال نہ میرے وسائل، پھر بھی تو نے مجھ پر اپنا کرم کیا۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میں اس پاک پروردگار کے گھر کے سامنے کھڑی ہوں! آنسوؤں سے نظریں دھندلا رہی تھیں مگر اُس کا نور اُس کی رحمت آنکھوں میں سما کے دل میں اتر رہی تھی! اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہوئے اپنے اعمال پر شرمسار تھی۔ پھر بھی اُس کی رحمت اور ستر ماؤں سے زیادہ محبت کے وسیلے سے دوزخ سے پناہ مانگ رہی تھی اور جنت طلب کر رہی تھی۔“

اُس کے گھر کا دیوانہ وار طواف کر کے اپنی روح کو بندگی سکھا رہی تھی۔ دل سے ایک صدا نکلتا رہتا تھا۔

”اے اللہ میں حاضر ہوں۔“

جسے 7 مارچ 2014ء کا سورج میرے لیے بڑی خوش بختی اور خوشیوں کے پیغام لے کر طلوع ہوا۔ میری زندگی میں بڑے نشیب و فراز آئے۔ لیکن مجھے کبھی شکوہ نہ ہوا۔ ہر دکھ پریشانی کو میں نے اپنی

وہ دربارِ حج میرے سامنے تھا

تصور تھا جس کا ابھی تک خیالی.....

کعبہ پر بڑی جب پہلی نظر کیا چیز ہے دنیا بھول گیا

وہ تمام حمد اور تعنیں زبان پر بنے اختیار جاری تھیں۔ میں بچپن ہی سے تعنیں پڑھتی تھی..... اس تصور سے کہ ایک دن ضرور مکہ میں جاؤں گی۔ اور وہ خواہش وہ تمنائاب پوری ہوئی تھی۔

دل کی عجب کیفیت

جذبات کا عجب عالم

میں حج حج..... اس دربارِ عالی کے سامنے تھی..... جو سب کا خالق سب کا مالک ہے۔

دل سے اللہمہ لبیک کی پکار

زبان پر اس کی وحدانیت کا اقرار

سر اُس کے آگے جھکا ہوا

نظریں شرمسار

پاؤں میں کپکپاہٹ

لب پر لبیک کی صدائیں اور دل سے شکر کے

کلمات.....

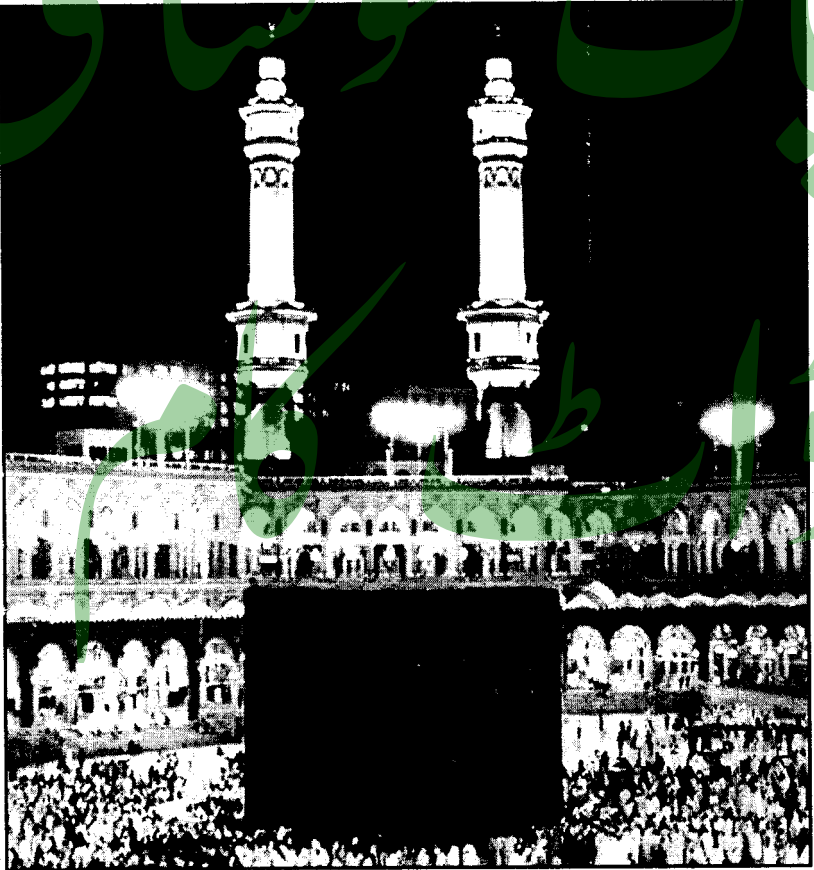
”اے مالک..... اے خالق..... اے پاک

ہیں اور حج کیسے کرتے ہیں؟ بس اتنا جانتی تھی کہ حج کے لیے مکہ کا سفر پانی کے جہاز سے ہوتا ہے۔ اور پانی سے میں بہت ڈرتی تھی اس لیے مکہ مدینہ کا خواب ہی دیکھتی رہی۔

ہماری رہائش اندرون سندھ کے ایک پس ماندہ سے گاؤں میں تھی۔ ابا ایک درمیانہ درجے کے زمیندار تھے اور ان کی زمینیں اندرون سندھ میں تھیں۔ میرا بچپن وہیں گزرا (بعد میں جب اسکول کی پڑھائی کا وقت آیا تو لاڑکانہ شہر منتقل ہو گئے) وہاں نہ کوئی ٹیکنک پوائنٹ تھا نہ ریڈیو ٹیلی ویژن اس وقت آیا ہی نہیں تھا۔ ہمارا سارا وقت گھر میں گزرتا تھا۔ بہت دینی اور ادبی ماحول ملا۔ ہمارے بزرگ ہم

آزمائش اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی سزا سمجھ کر قبول کیا۔ کبھی شکوہ یا گلہ نہ کیا۔ نہ میں نے بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر کچھ طلب کیا۔ مگر ایک خواہش ایک تمننا اور ایک طلب مجھے بچپن ہی سے دل میں رہی اور یہ یقین بھی رہا کہ وہ پاک پروردگار جو رحمن ہے رحیم ہے ستار ہے غفار ہے جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ میرے گناہوں کا پردہ بھی رکھے گا۔ میری بخشش بھی کرے گا اور میری اولین خواہش اور طلب کو بھی پورا کرے گا۔ جس کے خواب میں بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔

مجھے بچپن ہی سے مکہ مدینہ جانے کی خواہش رہی اس وقت مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ عمرہ کس کو کہتے



خواتین کے کردار سے متاثر ہونے کے باوجود..... اپنا آپ منوانے کا عزم بھی رکھتی تھی ہر بات کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دلائی جاتی تھی۔ اور ان کو صرف دو ہی حدیث یاد.....

ایک چارشادی والی..... دوسری اگر شرک نہ ہوتا تو شوہر کو سجدہ کرنے کا حکم بیوی کو ملتا۔ اور میں چار شادی کی اجازت کی وجوہ پر بحث کرتی اور شوہر کی بندگی کن کن حالات میں جائز ہے وہ بتاتی..... اس کے بعد مجھے یہ جواب ملتا۔

”خود کو بڑی عالمہ سمجھتی ہو..... بحث کرتی ہو وہ بھی شوہر سے..... جو تمہارا مجازی خدا ہے۔ بڑی سستی سادگی بنتی ہو..... کعبہ..... کس منہ سے جاؤ گی۔“

اور میں اندر ہی اندر شرمسار رہنے لگی۔ شاید وہ صحیح کہتے ہوں..... میں بھی ان سے بے حد احمق ہوں..... مگر کم عمری اور کم عقلی میں کچھ آگے نہیں سو جھتا۔

حالانکہ انہوں نے مجھے شادی کے بعد بھی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ میں آگے بڑھ رہی تھی۔ مگر بیوقوف اتنی تھی کہ اپنے علم کو ان سے بحث کرنے میں استعمال کر رہی تھی۔ وہ بھی کم نہیں تھے میرے دلائل کے جواب میں کہتے۔

”لفظ سیکھ کر زعم کرتی ہو..... بڑی قابل بنتی ہو..... میری خدمت کرو تو جنت ملے گی..... چھوڑو کے مدینے کا خواب شوہر کو خوش رکھو دنیا و آخرت کی بھلائی ملے گی۔ حج سے بڑا فرض شوہر کا حکم ماننا ہے۔“ خیر میں خود سر ہونے کے باوجود شوہر کی حکم عدولی تو نہ کرتی تھی۔ مگر میں یہ چاہتی تھی کہ میری طرح ان کو بھی حج اور عمرہ کی خواہش ہو۔ پھر میری خواہش میرا جنون خوابوں میں ڈھلنے لگا۔

سب سے پہلا خواب اس وقت دیکھا۔ جب پہلی بچی گود میں آگئی تھی۔ بچی رو رہی تھی اُسے چپ کراتے ڈرا سی آنکھ لگ گئی۔ اس وقت پہلی دفعہ میں نے مسجد نبوی ﷺ کا دیدار خواب میں کیا۔ فوراً آنکھ کھل گئی۔ اور میں یہ ہی سوچتی رہی کہ کہاں میں اور کہاں ہی ﷺ کی مسجد..... مگر مجھے خوشی بھی بہت ہوئی

بچوں کو مذہبی اطوار..... احادیث اور قرآن کے احکام کے مطابق اسی کے حوالے سے سکھاتے..... ہمیں دین کی باتیں..... اصحاب کرامؓ ازواج مطہرات اور اہل بیت کے قصے سنا سنا کر ہمارا ایمان مضبوط کرتے۔ شہیدان کربلا کے ایمان افروز قصے سناتے۔ ہمیں حقوق العباد..... حقوق اللہ اور اپنے حقوق فرائض کے بارے میں بتاتے..... اسلام کی بنیادی باتیں ہمیں ہر وقت بتاتی جاتیں۔

یوں مجھے بچپن ہی سے حج کرنے کی خواہش رہی مگر بانی کے خوف سے صرف تصور میں مکہ مدینہ رہا۔ میں اچھی پوری طرح شعور کی منزل پر بھی نہ پہنچی تھی کہ شادی ہوئی۔ صرف چودہ سال کی عمر تھی۔ میٹربک کا امتحان دیا تھا۔ پڑھائی سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ مگر میری سانس بستر پر بڑی تھیں۔ مگر سنبھالنے کے لیے ہوا چاہیے تھی۔ میں گھر بھر کی لاڈلی..... بلکہ لاڈ میں بڑی ہوئی، مذہبی رجحان رکھنے کے باوجود دوسرے گھر داری کا سلیقہ نہ سسرال میں رہنے کا طریقہ..... پھر بھی گھر سنبھالنے کے لیے..... مجھ جیسی بیوقوف انٹری اور کم عمر لڑکی کا انتخاب کیا گیا۔

دراصل گھر سے زیادہ گھر والے کو سنبھالنے والی کی ضرورت تھی۔ کیونکہ وہ بھی اکلوتے ہونے کی وجہ سے لاڈ میں بگڑے نواب تھے۔

میں مذہب کی دیوانی..... وہ مذہب سے بیگانہ..... ان کے نزدیک عورت کی عبادت صرف اور صرف مجازی خدا کی بندگی اور میرے خوابوں میں مکہ..... مدینہ..... مگر اوتو ہونا ہی تھا۔

”تم خود کو کیا سمجھتی ہو؟“

”تم کیسا بی بی مریم ہو؟“

”راہبہ بصری..... بننا چاہتی ہو؟“

ایسے سوالات کا ہر دم سامنا..... اور سسرال والوں کا یہ کہنا.....

”میاں کی ہر بات مانو۔“

ان کو اپنے یوسف ثانی ہونے کا دُعا..... اور مجھے زلیخا بنانے کی ضد..... اور میں جو بچپن ہی سے سارے اسلاف کے کارنامے پڑھی ہوئی..... مسلم

شوق ہے۔“ انہوں نے ہنس کر کہا۔ اُس دن میں کبھی اُن کے طعنوں تشوئوں اور سنانے کے انداز میں دراصل اُن کی محبت چھپی ہوئی تھی۔ اور میں اُسی دن پاسپورٹ بنوانے چل دی۔ اور ارجنٹ بنانے کو دیا۔ جب پاسپورٹ بنوانے جارہی تھی تو ایک عجیب خوشی اور سرشاری کا عالم تھا۔ لب پر درود تھے اور دل میں یقین تھا کہ..... جارہی ہوں۔

جب پاسپورٹ بن کے آیا تو میرا تو صحیح تھا مگر بیٹے کے پاسپورٹ میں اس کے والد کا نام غلط ہو گیا تھا۔ دوبارہ بننے کے لیے دیا۔ رمضان کی آمد تھی۔ جاننے والوں اور رشتہ داروں نے ڈرانا شروع کر دیا۔

”رمضان میں بہت رش ہوتا ہے..... پہلی دفعہ جارہی ہو..... بچہ پریشان ہو جائے گا۔ اس سے اچھا ہے حج کے لیے چلی جاؤ..... حج تو فرض ہے۔“

بہر حال جب پاسپورٹ بن کر آیا تو رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ رمضان کا چیکبج بھی بڑھ گیا تھا۔ میرا بجٹ بھی آؤٹ ہو گیا۔ بٹلنگ میں بھی مشکل ہو رہی تھی۔ اسی کشمکش میں چاند رات آ گئی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میرے جانے میں رکاوٹ کیوں آرہی تھی۔ بیٹے کا پاسپورٹ غلط ہونا..... بٹلنگ کی مشکل..... پیسوں کا بڑھ جانا..... یہ سب اللہ کی مصلحت تھی اور اُس کی نشاندہی بھی خواب کے ذریعے ہوئی تھی۔

چاند رات کو میرے شوہر اچانک گر گئے دماغ میں چوٹ لگی۔ ایمر جنسی میں آپریشن ہوا..... مگر چھ دن تک بے ہوشی کی حالت میں رہنے کے بعد اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔

بڑا بیٹا میر دن ملک تھا۔ بیٹیاں اپنے گھر کی ہو گئی تھیں اگر میں چلی جاتی اور میری غیر موجودگی میں اُن کو حادثہ پیش آ جاتا تو کون دیکھتا..... میرے نا جانے میں بہتری تھی۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

پھر عدت کی مدت..... قانونی اور دفتری کارروائیاں پشمن کا مسئلہ..... تین سال گزر گئے..... میرا خواب سچ ثابت ہوا کہ بیٹے کے پاسپورٹ کے

میں نے انہیں بتایا کہ مجھے مسجد نبوی ﷺ کی زیارت ہوتی ہے۔ اور ان کا پھر یہی جواب.....

”ارے میری اطاعت کرو..... جنت لے گی..... مکہ مدینہ جا کر کیا کرو گی؟“ اور میں خود سے شرمسار رہنے لگی..... کیا پیٹہ..... میرے اعمال ایسے نہ ہوں کہ میں اللہ کے گھر کی زیارت کر سکوں..... اس لیے اپنے اس اولین خواہش یا تمنا کی تکمیل کی فرمائش اُن سے نہیں کی۔ ویسے بھی مجھے کچھ مانگنے کی عادت نہیں تھی اور میری یہ ہی عادت اُن کو پسند بھی تھی کہ میں بیویوں والی کوئی فرمائش نہیں کرتی۔

دن یونہی گزرتے رہے..... بچے بڑے ہو گئے..... میرے خوابوں کا سلسلہ اور بڑھ گیا اور دعاؤں میں شدت آ گئی۔

”یا اللہ مجھ گناہ گار کو بھی اپنا گھر دکھا دے۔“ کبھی دیکھتی..... عمرہ کے لیے جارہی ہوں.....

اور میرا پاسپورٹ کم ہو گیا ہے..... کبھی مجھے سواری نہیں مل رہی ہے..... اور آنکھ کھل جاتی۔ پھر ایک دفعہ یہ دیکھا کہ میں عمرہ کے لیے جارہی ہوں اُس دفعہ بیٹے کا پاسپورٹ نہیں مل رہا ہے اور میرے شوہر ناراض ہو کر چلے گئے کہ تم دیر کر رہی ہو..... اور یہ خواب سچ ثابت ہوا۔

☆.....☆.....☆

”تم عمرہ پر چلی جاؤ.....“ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔ میں نے بے یقینی سے اُن کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... بھئی۔“

”واقعی.....؟“ میں مارے خوشی اور حیرت کے اچھل پڑی۔

”دک چلیں گے؟“

”تم چلی جاؤ..... میں پھر کبھی جاؤں گا۔“

”میں اکیلی محرم کے بغیر کیسے جاؤں؟“

”اکیلی کیوں؟ احد کے ساتھ چلی جاؤ۔“ (احد

چھوٹے بیٹے کا نام ہے)

”آپ کیوں نہیں؟“

”ارے بھئی تم دونوں چلے جاؤ..... تمہیں زیادہ

پر لرزہ طاری کر رہا تھا تو وہیں پیارے اللہ کی رحمت کا چمکی خیال آ رہا تھا..... کہ وہ رحمن ہے رحیم ہے..... کریم ہے..... اپنے بندوں سے محبت کرنے والا ہے۔ وہ کہتا ہے مجھ سے مانگو میں دوں گا مجھے پکارو میں سنوں گا..... اس کے فرمان کے مطابق اس کے آگے ہاتھ اور دامن پھیلانے رکھا تھا۔

مکہ اور مدینہ بہت ترقی کر گیا ہے، اونچی اونچی فلک شکاف عمارتیں..... خوبصورت اور مینگے سامان سے سجے سجائے ماڑ..... فاسٹ فوڈز سے بھری دکانیں..... خوبصورت آرام دہ..... سبک رفتار گاڑیاں..... غرض کہ جدید دور کی جدید سہولتوں سے بھرا کہ دنیا کی ترقی یافتہ شہروں کا مقابلہ کر سکتا ہے..... مگر یہ نہیں کیوں میری یہ شدید خواہش رہی کہ کاش میں مکہ اور مدینہ کو اسی دور کا دستخطی جب پیارے نبی ﷺ وہاں رہتے تھے..... وہی جگہ گھماں وہی حجرے ہوتے..... جہاں جہاں میرے نبی ﷺ نے قدم رکھا تھا وہاں کی خاک چومتی.....

جہاں میرے آقا ﷺ کے نقش قدم ہیں میں پلکوں سے چن لوں وہ خاک مدینہ مسجد نبوی ﷺ کا پڑے کیف سماں ابھی تک نظروں میں سایا ہوا تھا۔ ریاض جنہ میں نفل پڑھنے کی سعادت ملی..... تو خیال آیا میرا اللہ کتنا مہربان ہے ہمیں دنیا میں جنت کے ٹکڑے پر تجرہ کرنے کی توفیق عطا کر کے ہمیں جنت کا حقدار بنا دیا..... دنیا کی ہر خوبصورت جگہ سے بڑھ کر حضور ﷺ کی جالیوں کے سامنے درود پڑھ کر سعادت حاصل کرنے کی توفیق عطا کی۔ وہاں پر جو دعائیں مانگی سب قبول ہوئیں..... کئی خواب سچے ثابت ہوئے۔

یا اللہ ہر مسلمان کو زندگی میں ایک دفعہ اپنے گھر کی زیارت کروادے..... اپنے حبیب ﷺ کا روضہ دکھا دے (آمین) وہ جگہ جہاں سب کے لیے باب رحمت کھلا ہے۔ سب کو اُس در سے رحمتیں سمیٹنے کا موقع عطا کر..... (آمین) اب بھی میرے لب پر یہ دعا

ہے۔

☆☆.....☆☆

مسئلے کی وجہ سے خواب میں بھی نہ جا سکتی تھی۔ دل میں لگن اب بھی تھی۔
”نیت اچھی ہو..... لگن بچی ہو تو خواہش ضرور پوری ہوتی ہے۔“

☆.....☆.....☆

”امی آپ اور احمد عمرہ کر لیں..... جرمنی سے آئے ہوئے بیٹے نے میرے ہاتھ میں یورو تھماتے ہوئے کہا تھا۔
”واقعی.....“ میں خوشی سے سرشار ہوتی ہوئی بولی تھی۔

”بالکل.....“ بیٹے نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اور میں نے اسی دن ایلٹائی کر دیا۔ جس کے نتیجے میں 7 مارچ کو فلائٹ کنفرم ہوئی تھی۔
”میں ابھی تک اس سحر سے نہیں نکلی ہوں۔ وہاں کی فضا نہیں.....“

وہاں کی اذائیں..... وہاں کی عبادت..... اور وہاں کے دن رات عجب پڑے کیف سماں تھا۔ ایک نماز کا ایک لاکھ ثواب..... ایک نیکی پر لاکھ اجر..... جو مجھے وہاں پہنچانے کا وسیلہ بنے اُن کے لیے دل سے ڈھیروں دعائیں کی تھیں۔
سننے آئے تھے کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی جو دعا مانگی جائے..... وہ قبول ہوتی ہے..... اپنے گناہوں کی بخشش کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کرنے کی دعا بھی مانگ لی۔
اور بالکل ہٹ کی طرح تھوڑا سا لاڈ بھی کیا۔

”اے پروردگار..... اس سال حج کی سعادت بھی عطا فرما، اور وسائل بھی تو ہی مہیا کرے گا۔ تو تو دلوں کا حال جانتا ہے۔“

اور میرے اللہ نے میری یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ عمرہ کرنے کے صرف چھ مہینے بعد مجھے حج پر بھی بلالیا۔ یہ صرف مجھے بلکہ میں نے جس جس کے لیے دعا کی تھی۔ شکر الحمد للہ کہ اُن سب کو حج کی سعادت نصیب ہوئی اور ہو رہی ہے۔

☆.....☆.....☆

جب کعبہ پر پہلی نظر پڑی تو جہاں کعبہ کا جلال دل

ماؤں کے حوالے سے دوسری خصوصی تحریر

انگریز ابراہیم

صفیہ سلطانہ کا خیال

تیرے کرم کا کیسے ذکر ہم یہاں
ہم سے گناہ گار کو لفظوں سے مات ہے

تسلیم منیر علوی

کے عمرگزشت کی کتاب کلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔

☆.....☆.....☆

ہم چار بھائی بہنیں شہر کے قدرے گنجان آباد علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ ابا سرکاری ملازم تھے جو حال میں ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ چھوٹا سا گھر، گھر دل سب کے بڑے اور فرائض امان لگائیت پسند اور ابا قناعت پسند بھائی ہمارا ایک ہی ہے اس کے لیے ابا پریشان رہتے کیونکہ اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ میں یعنی عفت (عفتی) اپنے بہنوں میں دوسرے نمبر پر فائز ہوں۔ غازی بھائی مجھ سے بڑے ہیں یہ ہمارے بے حد لاڈلے اور جیسے بھائی ہیں آخر اکلوتے جو ہونے والے تک مجھ سے عمر میں بڑے ہیں مگر سادگی اور بھولپن میں بالکل معصوم مصلے میں بچوں کی لڑائی میں ہمیشہ پیٹ کر آجاتے۔ ایسے میں میں بہادر بنی لڑنے لگتی جاتی اور ایک آدھ کو دو ہاتھ بڑ کر واہس آتی یعنی میری ٹخنے میں بڑی دھاک بیٹھی ہوتی تھی۔ محاذ بھائی تیار کرتے سورہے پر میں موجود ہوتی اور کاغذ لکھ بیٹھے دے کر بے وقوف بنا دیتا میں جا کر دو دو ہاتھ کر آتی..... لب تو میری چھوٹی بہنیں بھی مجھ سے ڈرنے لگی تھیں۔ بھائی ابا پر گھنے تھے۔ ابا تو مانو ہمارے اللہ ماں کا گائے ایک دفعہ کا ذکر ہے

مج سے بہت جس تھا آسمان ہاڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی وقت بھی بارش برس سکتی تھی۔ ایسے میں مانو نے آواز دی۔

”ای جلدی کام ختم کریں میں نے بی وی لاؤنج کا اسے سی آن کر دیا ہے۔ آجائیں میں بی وی لگا رہا ہوں۔“ اور میں نے جلدی سے چولہا بند کیا اور بی وی لاؤنج کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

دراصل جب سے ہم لوگوں کو جج کی سعادت نصیب ہوئی ہے ہر سال جج کے پروگرام ذوق و شوق سے دیکھنا شروع کر دیے ہیں کہ دل وہیں رہ گیا جان وہیں رہ گئی۔ آنکھوں میں وہ مناظر گھومنے لگتے ہیں اور جب مدینے کا مسافر کوئی جایا تا ہوں وہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں کی صورت حال ہو جاتی۔ ارکان جج کا آغاز ہو چکا تھا۔ بی وی آن ہوا۔ مگر یہ کیا۔ میری تو خوف سے چیخ نکلی گئی۔ اتنا خوفناک حادثہ..... چیخ و پکار آہو بکا..... کرین کا کوئی جان لیوا حادثہ ہو گیا تھا جانے کتنے لاپتہ اور معلوم نہیں کتنے موت کا نوالہ بن گئے۔ لوگ بھاگ رہے ہیں ایبویٹس کے سائزنگ شور مچا کر راستہ مانگ رہے ہیں..... گورنمنٹ کی پوری مشینری حرکت میں آچکی ہے..... اور میں سالوں پہلے ماضی کے درختے وا

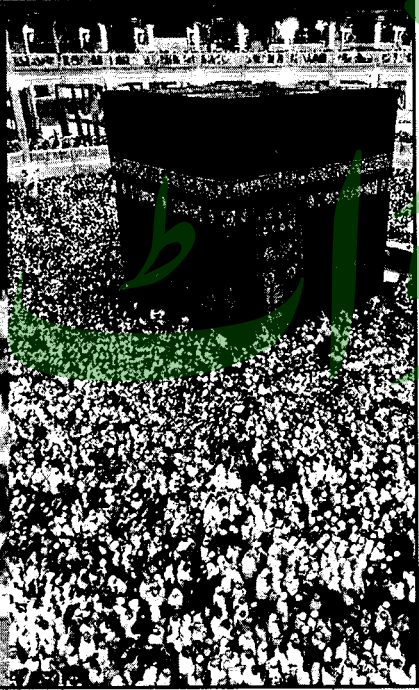
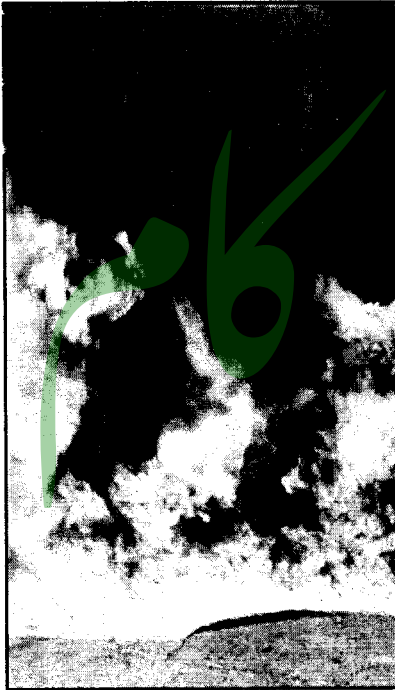
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



”ارے بہن! ہم کیا جانیں وہ اپنا کام کر رہے تھے ہم اپنا ہمیں کیا خبر کہ مال بنا رہے ہیں کہ لگا رہے ہیں۔“ سب سر پٹ کر رہ گئے۔ اس واقعے سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ابا جب عبادت میں مصروف ہوتے تو اس پاس کی خبر نہ ہوتی۔ وہ نہایت پرہیزگار اور عبادت گزار آدمی تھے سجدے میں گھنٹوں پڑے سکتے رہتے اور پھر اس پر سادگی غازی بھائی ابا پر چلے گئے تھے۔ ہر ایک پر اندھا اعتماد امان سیدھی سادھی سی خاتون تھیں سارے گھر کا نظام میرے ناتواں کاںدھوں پر تھا۔ ان دنوں غازی بھائی ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے ایک دفتر سے دوسرے دفتر انٹرویو دیتے سفارش کے بغیر کوئی کام بنتا نظر نہیں آ رہا تھا ابا کا مسجد میں قیام لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ ہم بچیوں کا بوجھ اور بھائی کی ملازمت نے ابا کو نڈھال کر دیا تھا۔ کمزور اور ناتواں ہو گئے تھے ایک دن مسجد جاتے ہوئے راستے میں لڑکھڑا گئے۔ ایک فرشتہ صفت اچھی راہ گیر نے سنبھالا اور گھر تک پہنچایا۔ ابا کی خراشوں پر فوراً مرہم پٹی ہوتی اماں نے

پھوپھو کا گھر (دوسری منزل) بن رہا تھا۔ ”بھائی آپ دو تین دن کے لیے آ جائیں۔ گھر میں کوئی مرد نہیں ہے چھت پڑ جائے تو چلے جائے گا۔ آپ بس مزدوروں پر نگاہ رکھیں سامنے مصلحا بچھالیں آپ اللہ اللہ کریں مزدور اپنا کام کریں۔“ پھوپھو نے ایسے رسوائیت اور لجاجت سے اصرار کیا کہ ابا ان کی التجا سے پسپا ہو گئے۔

اب وہ تو سامنے جانے نماز پر عبادت میں مصروف مزدور اور آ رہے ہیں جا رہے ہیں تیسرے دن ٹھکدار آیا۔ ”بابی شین آگئی چھت پڑے گی مگر مال تو ہے نہیں۔“ پھوپھو یہ سن کر اپنے ہوش کھو بیٹھیں۔ ”ارے بھائی جان آپ تو وہاں ہی بیٹھے تھے۔۔۔۔۔ سینٹ کی بوریاں سیرگی کے نیچے سے غائب ہو گئیں آپ کو ظلم ہی نہیں ہوا؟“ ابا تو مارے شرمندگی کے زمین میں گڑ گئے۔ ”یا الہی یہ کیا ہو گیا یہ وہ بہن کی کمانی یوں غائب ہو جائے۔“ وہ پریشان ہو کر بولے۔



چھوٹی بہنیں بھی اب توری کی بیل کی طرح سر دیوار آچکی تھیں۔ والدین کو گھر بیٹھے اتنا اچھا سمجھا رشتہ مل جانا معجزے سے کم نہ تھا۔

سب اس کو ابائی کی کرامت سمجھتے..... وہ ہی والی بات تھی کہ جو دلوں کو فتح کر لے وہ ہی فاتحِ زمانہ..... اس نے اپنے خلوص سے ہم سب کو فتح کر لیا تھا۔ یوں میرے ہاتھ میں 'آذر علی' کے نام کی انگوٹھی پہنادی گئی، کس ادا سے ایک شخص ہماری زندگی میں داخل ہو کر گھر کا حصہ بنا اس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں۔ وہ ذکرِ رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ نعین بھی بہت خوش الحانی سے پڑھتا۔ سب سبحان اللہ اللہ کرتے، اب تو ہاتھ چوتے یہ سب تو تھا، مگر بھائی کی ملازمت؟ ابائے لے لے ڈٹنے جانے کہاں جا رہے تھے پھر ایک دن یہ مشکل بھی آڈرنے آسان کر دی۔

آڈرنے بھائی سے کہا۔

”تمہارے مطلب کی ایک ملازمت جدہ میں ہے میں نے معلومات کی ہے پہلے تم عمرہ کر لینا پھر اپنا کام شروع کرنا۔ میرا جاننے والا بندہ ہے اگر تم جاہو تو.....“

”اندھا کیا جاوے دو آنکھیں اظہار بھی مشکل تھا۔ صرف آنکھوں سے شکر کے آنسو لیریز ہو گئے۔ اُف وہ کیفیت لفظوں میں عیاں نہیں ہو سکتی۔ اماں ابائے کو بس نہ چلا تھا کہ ہونے والے بھاکوان داماد کے قدموں میں سر جھکا دیں، ایسا قدر دان داماد ملا کہ گھر کے ایک ایک کر کے تمام مسائل حل ہوتے چلے گئے روزی رزق کا بھی دروازہ کھل گیا۔ سجان تیری قدرت!

بقول شاعر ایک مہربان نے آکر زندگی بدل دی۔ اب تو آڈر میری بسا بیل دل پر پوری طرح چھاپ چکا تھا۔ اور اپنی خوش قسمتی پر مجھ پر بھی ریز گئی اس کے چہرے پر حد درجہ نرمی اور لہجے میں شاکلی تھی۔ وہ میرے پاس ہوتا تو میں اس کی بے پناہ ذہانت کے آگے چاروں خانے چت ہو جاتی۔

اُس روز تو مجھے گھر میں خوشیاں اترا آئیں تھیں، بھائی کا ویزا آ گیا تھا۔ آڈر تو بھائی کے جانے سے پہلے مجھ سے نکاح پر اصرار کر رہے تھے مگر بھائی نے حامی نہ بھری کہ میں سیٹ ہو جاؤں پھر انشاء اللہ آ کر یہ مبارک کام اپنے ہاتھ سے انجام دوں گا۔ وہ زندگی کا عجیب سا دن تھا شاید اسی کو کہا جاتا ہے کہ کبھی خوشی کبھی غم..... جانے کی

دوڑ کر دو دھ ہلدی پلایا، ساری بہنیں جمع ہو گئیں کوئی ہاتھ سہلا رہا ہے کوئی یادوں..... جیسے گھر میں کوئی قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ ایسے ہی موقع پر غازی بھائی اپنا لٹکا ہوا منہ لیے داخل ہوئے۔ گھر میں یہ تماشا دیکھ کر بوکھلا گئے۔

”ہائے اباکو کیا ہوا؟“

اب ذرا اوسان بحال ہوئے تو اجنبی کا خیال آیا، ابائے نے شکر آمیز احسانندی سے مہربان، مہمان کی طرف اشارہ کیا۔

”بھئی ان صاحب کو چائے پلاؤ ٹھنڈا پانی لاؤ، ان کی مہربانی ہے ہمارے بہت نیک آدمی ہیں۔“ میں نے جلدی سے چائے پیش کی وہ انکار کرتے رہے۔ پھر ابائی مہمان نوازی نے مزید اصرار کیا۔

”ارے بیٹا صرف چائے ساتھ کچھ کیکٹ وغیرہ۔“

سامنے بھائی کی خوبصورت فرخ پوشانی عرق آلود، اجنبی مہمان کی آؤ بھگت دیکھ کر وہ بھی میری مدد کو لپکے، گھر میں موجود نیکو وغیرہ بھی پیش کیے مگر اس نیک انسان نے چائے کے سوا کچھ نہ لیا، وہ گھر کے پُر خلوص ماحول سے متاثر بہت ہوئے پھر وہ مہربان ابر نیساں بن کر ہمارے گھر کا حصہ بن گیا۔ ابائے کے ساتھ مسجد جانا ہاتھ میں تسبیح بہت سی تصویریں بھی دکھائیں جس میں احرام کے ساتھ مدینے کے میں موجود ہے۔ اس نے ہی بتایا۔

”ایک بہن کے سوا دنیا میں کوئی نہیں ہے اپنا چھوٹا سا بزنس ہے۔ اسی سلسلے میں کسی سے ملنے آیا تھا کہ مجھے جنت جیسا گھر مل گیا۔“ غازی بھائی تو جیسے کام کاج نوکری کی تلاش چھوڑ چھاڑ اس اجنبی کے گردیدہ بن گئے۔ یہ شخص بھی بڑا متاثر کن شخصیت کا مالک تھا یعنی جو ایک دفعہ مل لے اس سے متاثر ہونے لگتا نہ رہ سکے۔ میں یعنی غنی کو یہ بے غرض سادہ جیہ دیکھ لہجے میں بات کرنے والا نوجوان بھی اچھا لگا کہ ابائے اور بھائی کا مددگار بن گیا تھا۔ میرا کام بھی ذرا ہلکا ہو گیا تھا۔ ابائے پہلے ہی دن سے اس کے حصار میں آ گئے تھے۔ اس کا ذہنی رنگ اور بے غرض محبت نے پور پور اباکو بھگودیا تھا۔ گھر میں سرگوشیاں بڑھ گئی تھیں۔ کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ وہ میرا ساتھ

چاہتا ہے۔

مجھے بھی بظاہر کوئی اعتراض نہ تھا۔ میرے بعد دو

دوری، گیلی مٹی کی طرح پٹھ پٹھ بھاری تھی۔ اب کسی رنگ مال سے اس حقیقت کو کھس کھس کر صاف نہیں کیا جاسکتا کہ جو دیکھا خواب تھا جو سنا سنا تھا۔

میں جگن میں باغی بھوتی تو آگ سے نکلنی چنگاریاں میرے دل کو جلا کر بھسم کر دیتیں۔ جیسے راکھ میں شرر چھپا ہو۔ سارے رفاقتوں کے چراغ بجھ کر فنا ہو چکے تھے صرف راکھ رہ گئی تھی۔

ابا سارا سارا دن بھوکے پیاسے مارے مارے اس دفتر سے اُس دفتر کی خاک چھانتے۔ پاؤں میں جھالے زبان خشک رات بھر مصلے پر گر کر یہ وزاری جانے زمین نکل گئی کہ آساں کھا گیا۔ ایسے میں مجھے نروس بریک ڈاؤن نے جکڑ دیا کیونکہ سب جیسے مجھے موردِ اِزلام سمجھ رہے تھے۔ سب کیا دھرا میرا ہے میں نے خود پش قدمی کی اُس کے نام کی انگوٹھی پہنی بھائی کو باہر نوکری کا لالچ دیا یہ سب میں نے کیا۔

سارا خاندان اور رشتے دار عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے جیسے حالات کی ذمہ دار میں ہوں۔ جانے وہ کون سی نخوس گھڑی تھی جب وہ غیبت انسان فرشتے کے روپ میں ہمارے پاکیزہ ماحول میں داخل ہوا اور اپنا شیطانت بھرا پلان ہمارے پُرسکون گھر پر شروع کیا۔ میرے دل میں تم و غصے کی لہریں بول اٹھیں جیسے کسی گہرے پاتال میں ڈوب گئی ہوں اور پھر کوئی مجھے اچھال رہا ہے۔ وہ فسوس گرتے کار اپنی پوری خباثت سے سامنے آجاتا ہے۔

وہ جنوری کی ایک خشک شام تھی، ہوا میں شائیں شائیں کر رہی تھیں۔ کوسڑی بریلی کو لڈو پو آئی تھی۔ ابا سکر نے سے مصلے پر تنہج پر پڑے تھے کہ دروازے پر تیل پر (اب تو ہر آہٹ پر گماں ہوتا کہ شاید کوئی مجزہ ہو گیا) سب نے ایک ساتھ چلاٹک لگائی..... پوسٹ میں بھی سب کو پچچان گیا تھا۔ اُس نے ایک پوسٹ کارڈ پکڑا یا لکھا تھا۔

پیارے ابا اماں اور بہنیں..... میں یہاں جدہ جیل میں ہوں (کچھ نمبر لکھے تھے) بس شکر ہے زندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیں اور اگر ہو سکے تو دعا کریں۔

آپ کا برفصیب بیٹا
غازی صدیقی

خوشی تھی جدائی کا تم تھا آخر ہم سب کا اکلوتا چہیتا بھائی تھا۔ ابا کی تاکید تھی جاتے ہی خیریت کا تار ارسال کر دینا پھر بے خشک عمرہ کے لیے روانہ ہو جانا۔

بھائی سب کو اُداس کر کے چلے گئے۔ آڈرنے سب کو سنبالا۔ دلاسرتلیاں دیتے..... سب کو کھانے تفریح کرانے لے گئے۔ مگر جب دو تین دن بھائی کی خیریت نہ معلوم ہوئی تو پھر ابا کو پریشانی شروع ہوئی۔ آڈر کھاتے۔

”ابا وہ ایسی ہی مبارک جگہ ہے بندہ پہنچنے ہی سب کو فراموش کر دیتا ہے اب عمرے سے فارغ ہو کر ہی سب کی یاد آئے گی۔“ مگر ہم سب کا دل اس بات پر آمادہ نہیں تھا۔ ابا پوسٹ افس کے چکر لگانے لگے روز..... وہ چکر لگاتے مایوس لوٹنے ان کی کمزیر جھک گئی۔ آڈر آتے سمجھاتے کہ میں نے ایک آدمی کو معلومات کے لیے لگا دیا ہے۔ اللہ خبر کرے گا۔ وہ تو الفاظ کی گلکاریاں بکھیرتے مگر کسی کو ہنسی نہ آتی تھی۔

ہم سب حیرت سے اُن کے مطمئن چہرے کو دیکھتے..... وہ ماں باپ جو اپنے اکلوتے بیٹے کی ایک منٹ کی تاخیر پر دروازے پر جا بیٹھتے ہوں اُس کی آٹھ دس دن سے کوئی خبر نہ آئی ہو بھلا وہ کیسے جان لیتے کہ وہ ہاں خیریت سے ہے۔ بظاہر یہ مطمئن شخص جس کا مستقبل بیٹی سے بھی واسطہ ہو چکا ہے کیسے گفتگو لے جس میں یقین دلا رہا ہے کہ سب خیریت ہے آپ لوگ فکر نہ کریں۔ بقول شاعر اک یہ بھی تو انداز علاج تم جاناں ہے چارہ گرہ..... مگر اس کے توجہ میں اب کھو کھلے گئے دل کہتا بھائی کسی مشکل میں ہیں۔

پھر ایک انہونی اور ہوئی وہ متاع جاں بنا شخص بھی کئی دن سے گھر نہیں آیا۔ اُس کے بتائے ہوئے تمام علاقے حمان لیے گئے تصویر لے کر علاقہ علاقہ دیکھا..... مگر کسی نے بھی کوئی شاخت نہ بتائی۔

اب ہم سب نظلیں روزے اور وظیفوں پر زندہ رہ گئے۔ اماں بستر پر جا لگیں۔ ابا دفتروں کی خاک چھاننے لگے۔ زندگی میں ملال کا موسم آن ٹھہرا۔ زندگی مانند سراب ہو گئی۔ پہلے سفر کے واسطے صحرا دیا مجھے پھر خود سزاب بن گیا دھوکہ دیا مجھے..... میری جرأت گفتار دیدہ

ہوں۔ وہ بڑی درد مندی سے حوصلہ دے رہے تھے۔
 روتے سکتے ابا داپس آئے حضرت یعقوب کی بیٹی
 کی جدائی یاد آئی۔ اُف وہ شخص کس کمال سے کیلا عشق کی
 بازی..... اور ہم سب اپنی فتح سمجھتے رہے جبکہ ہمیں مات
 ہو چکی تھی۔

خیر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تو پورا خاندان اہل
 کر رہ گیا۔ کچھ تو گریزاں ہوئے کچھ نے بنا دلی مدد کا
 بہانہ کیا۔ وہ رشتے دار جن کی بڑی دور دور رسائی تھی
 انہوں نے رشتہ دار ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

ایک سال گزرا، دوسرا سال آیا تو بھائی کی تحریر نظر
 آئی، اُن کو خط و کتابت کی اجازت مل گئی تھی۔ ان کے
 نیک چال چلن اور ہر وقت تلاوت کلام کا صلہ و تسبیح دیکھ
 کر اہلکار کو بھی رحم آ گیا۔ گورنمنٹ نے رابطے کی اجازت
 دے دی ہے۔ اس خط نے امید کی نئی روح پھونک دی۔
 اب مہینے دو مہینے میں ایک خط آ جاتا تھا۔

دل کو اب بھی اکثر اُس اجنبی کے نام سے ٹھیس پہنچی
 ایک ٹیس اٹھنی وہ اجنبی میرے ابا کی سادگی عبادت
 گزار سے کھیل گیا۔ اُس کا یکم پلان بڑی مہارت سے
 تیار ہوا پہلی ملاقات میں اس نے ہماری ساری مجبوریوں
 پریشانیوں جان لیں۔ ضرورت مند باپ بیٹا بے روزگاری
 سادگی اس نے دین کو کھیل بنایا اور محبت دے دھوکہ دے
 گیا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مگر تیر انداز جانے
 کہاں اب دوسرے محاذ تیار کر رہا ہوگا۔ ہمارا گھر ان اس کو
 اپنے کھیل کے لیے بہترین نظر آیا ہوگا۔

ابا روز مختلف اداروں سے معلومات حاصل کرتے
 کرتے اور بوڑھے ہو چکے تھے۔ ڈاک خانے والے
 سرکاری افسران ابا کو پہچان چکے تھے۔ اُن کی بزرگی
 عبادت گزار اور آہ و زاری دیکھ کر اکثر تو اپنی سیٹوں
 سے کھڑے ہو جاتے چائے پانی کی پیش کش کرتے۔ وہ
 بھی مجبور تھے کاغذات کے پلندے لے ابا کو ایک
 ادارے سے دوسرے ادارے تک بھیجتے رہے۔ رشتہ
 داروں نے منہ موڑ لیا۔ دوست احباب چھڑ گئے۔ بس
 ایک حضرت ناصح آتے جاتے رہے یوں کر وہ یہ کیوں
 کیا؟ بس ہمیں ہی ذلیل دخواں سمجھ رہے تھے کو یا کیا دھرا
 سب ہمارا ہے۔

زندگی کی نوید تو ملی..... مگر کس طرح..... ابا نے کہا۔
 ”شکر ہے بیٹا زندہ ہے۔“ وہ پوسٹ کارڈ لے کر
 اس کی کئی کاپیاں کرائیں اور مختلف محکموں میں درخواستیں
 روانہ کیں۔ وزیر اطلاعات و نشریات سے ملاقات کی
 سب ایک دفتر سے دوسرے دفتر بھیجتے رہے۔ اور پھر
 اداروں کے اہلکاروں کو بھی شاید باپ پڑس آ گیا۔
 وزیر داخلہ کے سیکریٹری نے ٹائم دیا۔ ابا کا کیس
 ہمدردی سے سنا اور فرمایا۔

”صدیقی صاحب! کسی نے آپ کے بیٹے کو
 پھنسا یا ہے ہمارے وزیر صاحب بہت خدا ترس آدمی ہیں
 آپ کا پورا کیس اسٹڈی کر رہے ہیں۔ وہاں کی گورنمنٹ
 سے بھی رابطہ کیا ہے۔ آپ جمعرات کو تشریف لائیں۔“
 انہوں نے بڑی شفقت اور مہربانی سے بات کی۔ آپ
 سوچ سکتے ہیں ایک بوڑھا اور ناتواں شخص اکلوتا جوان بیٹا
 تین جوان بیٹیاں..... ذرا رخ آمد و رفت محمد و خون ناپید
 اور گھر کے حالات کے ہاتھوں مجبور بیٹا وطن سے دور
 انجانے میں شکار ہو کر کہاں جا پہنچا۔

”زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
 جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں
 جمعرات لگ رہا تھا سال کے برابر ہوئی تھی۔ اللہ
 اللہ کر کے وزیر اطلاعات و نشریات (مولانا کوثر نیازی)
 سے ملاقات ہوئی وہ بہت شریف انفس آدمی تھے ابا کا
 حال دیکھ کر بہت متاثر ہو چکے تھے حال دل سنا تو خود بھی
 آنکھیں نم ہو گئیں۔ انہوں نے ایک پیپر نکالا اور کہا۔

”آپ کا بیٹا ایک گینگ کے تھے چڑھ گیا جس نے
 چالاکی سے سوٹ گیس میں ہیروئن رکھوائی کہ میرا دوست
 ایئر پورٹ لینے آئے گا اُس کو یہ تھنہ پر در کر دینا پھر وہ تم کو
 آگے کے معاملات سمجھائے گا مگر اس سے پہلے ہی بیٹا
 آپ کا دھریا گیا۔ آپ کو معلوم ہے وہاں کے قانون
 بہت سخت ہیں ہیروئن برآمد ہو تو سزایم ہو جاتے ہیں۔ وہ
 معصوم بے جرم دخطا پکڑ گیا۔ آپ کا کیس بڑی ہمدردی
 سے سنا جا رہا ہے ہم نے تمہیں روانہ کر دی ہیں یہ کون
 لوگ ہیں تنگ ملت تنگ قوم جو اس ملک وطن کو بدنام
 کر رہے ہیں۔ وہ کم عمر اور مجبور لوگوں کو ہی استعمال
 کرتے ہیں۔ میں بھی ایک باپ ہوں آپ کا درد سمجھ سکتا

نمبر ہمارے پاس موجود نہیں..... وہ لاپتہ ہے ہماری تو دنیا ہی دیران ہوگئی۔ ابا ڈھے گئے۔ ہم سب روز بیچ ہو کر آیت کریمہ کا درو کر تے۔ آہوں سسکیوں سے دعائیں کر رہے تھے کہ پاکستان کے وزیر اطلاعات و نشریات کے دفتر سے ابا کا بلاوا آیا جائے کیوں کہ فرساختہ سنانے والے ہیں۔ ابانم سے ٹڈھال لڑ کھڑاتے قدموں سے آفس تک پہنچنے پہنچنے گر گئے کسی اہلکار نے اٹھا کر کھڑا کیا۔ اندر بھی بھٹکا بچ گئی تب وزیر صاحب بھی آ موجود ہوئے انہوں نے تم سے ٹڈھال باب کو ملے سے لگایا اور کہا۔

”مبارک ہو صدیقی صاحب آپ کی دعائیں رنگ لائیں معجزہ ہو گیا۔“

”آگ کی شدت سے گھبرا کر لوگ جدھر منہ اٹھا بھاگ رہے تھے..... آپ کا بیٹا قیدیوں کے کیمپ کی طرف بھاگا، وہاں موجود کسی ٹیک دل نے اُس کو دلچھ کر کہا۔

”صدیقی تو یہاں کیوں آیا؟ زندگی تجھ کو بلا رہی ہے اور ڈو موت کی جانب بھاگ رہا ہے۔ بھاگ جا تو لاپتہ ہے پاکستانی کیمپ میں جا..... جا اور غازی نے اندھا دھند پاکستانی جنڈے لگے خیمہ کی طرف دوڑ لگائی اور کسی رحم دل نے اُس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اب وہ ہمارے ادارے کے پاس ہے اس کے پیسے پاسپورٹ بن گیا ہے کل بحری جہاز سے روانگی ہے۔ آپ ایک ہفتے بعد بیٹے سے ملیں گے۔ جایں صدیقی صاحب یہ آگ آپ کے بیچے کے لیے گھزار ابرا یہی بن گئی ہے۔ یہ آپ کی جیش بہادری اور اللہ سے لو اور بزرگی ہے کہ خدانے سن لی۔“

کہتے ہیں وزیر صاحب خود بھی رو رہے تھے اور ابا پر خوشی سے سکتے طاری ہو گیا تھا۔ ان کو گورنمنٹ نے اپنی حفاظت میں گھرنیک پہنچایا تھا۔

آج اس حادثے نے مجھے ماضی کی ہولناک کہانی یاد دلادی اللہ جیسے چاہے پھانسی کے پھندے سے اتار دے اور کسی کی عمر قید کو زندگی میں بدل دے..... واہ رے اللہ تیری قدرت، جہاں ہزاروں لوگ شہید ہوئے وہاں بھائی کے لیے گھزارا بھائی شہنشاہی ہو کر نوید مسرت لے گئی۔

☆☆☆☆

اپنے لحاظ سے شاید وہ بھی ٹھیک ہی سوچتے ہوں گے کہ ایک اجنبی شخص پر انہوں نے کیسے اعتماد کر لیا کہ وہ گھر کا حصہ ہی بن گیا۔ ہاں یہ بات غلط بھی نہیں تھی ہماری ہی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ وہ شخص تو اچھے دلوں میں بھائی کی منگنی اپنی ہی عزیزہ سے کر رہا تھا۔ بس اسی سلسلے میں ہم سب وہاں گئے تھے بڑا سامان و منزلہ گھر تھا لوگ بھی اچھے تھے۔ مگر بات کچھ بتی نہیں تھی بعد کو جب بھائی اور اس خبیث انسان کی تلاش ہوئی تو ہم لوگ اس گھر بھی گئے۔ مگر وہاں تو وہ پہلی ہی موجود نہ تھی کوئی اور لوگ رہتے تھے انہوں نے بتایا کہ ہم ایسے کسی لوگوں کو نہیں جانتے، بس قدرت جب امتحان لیتی ہے تو انسان بے بس ہوتا ہے۔

دن نہیںوں اور سالوں میں گزر رہے تھے گورنمنٹ کی وہ ہی ترائیاں چل رہی تھیں۔ حق دق میں تن تنہا کھڑے ہم لوگ سسک رہے ہیں عید اور خوشی کے تہوار ہمارے لیے تو کوئی مسرتی ہی نہیں رکھتے تھے۔ اور پھر بھائی کا عید پر خط آیا کہ گورنمنٹ یہاں قیدیوں کو جج کرانے کی میرا نام بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہے کہتے ہیں کہ آپ کے نیک اخلاق اور اچھے چال چلن کی وجہ سے آپ کا نام شامل کیا گیا ہے۔ اب ہم لوگ کسی معجزے کے منتظر تھے کہ جج کے طفیل بھائی کی دعائیں قبول ہو جائیں اور اللہ رحم فرمادے..... اس کے بعد تو ہم لوگ بی بی کے آگے جڑ گئے تھے کیونکہ جج کے ارکان براہ راست دکھائے جاتے تھے کبھی کسی پر بھائی کا شبہ ہوتا کبھی ثریا چلاتی دیکھیں یہ بھائی (احرام میں سب ایک جیسے لگتے ہیں) ہیں مگر فرسوس وہ سراب ہی نکلتا..... نظر کا دھوکہ کھا کر ہم لوگ پھر پاپوس ہو جاتے، ابھی قافلے مننی میں جمع ہو کر عبادت میں مصروف تھے کہ اطلاع آتا شروع ہوگئی کہ خیموں میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔ خوف ناک آتش زدگی سے ہزاروں جاں بحق اور لاتعداد گم شدہ ہیں۔ شدید بھٹکڑ قیامت مغرئی پھانسی بے ہوش ہو چکی تھیں، ہم سب کلمہ پڑھ رہے تھے۔ فون تار سب خاموش، جاں بحق ہونے والوں کی فہرستیں آتا شروع ہو چکی تھیں۔ عالم اسلام سوگوار، تقویت کے پیغامات کی مہر مار لاپتہ افراد کی فہرست میں بھی بھائی کا نام نہیں تھا۔ دہاں کے ٹھکر جیل سے بات ہوئی ان کا جواب تھا فلاں قیدی

پرم دفن ماہ ستمبر 1965ء کے حوالے سے خصوصی چٹی کہانی

اپنی جاں نذر کروں

منور سلطان کا خیال

جان عزیز دے کے وطن کو بچایا
یہ وہ جری ہیں جن کا زمانے میں نام ہے

عالمِ مسلم

کہ تم مسلمان ہو اور جوش انتقام میں اتنا نہ بھول جانا کہ اخلاقی اقدار کو بھلا کر جاؤ۔ مسلمان عورت بوڑھے اور بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔“

۱۹۴۷ء کے واقعات ابھی تک سید کی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے سید کے والد قتلِ جالندھر کے ایک موقع پر میں رہتے تھے۔ گاؤں کے معززین میں شمار ہوتے تھے اور گاؤں کے کرتا دھرتا امر سنگھ کے بہترین دوست۔

”ہندوستان آزاد ہو گیا۔ ہندوستان آزاد ہو رہا ہے۔“ روزانہ خبریں سن رہی تھیں ہندو اور مسلم اب ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے کی قسمیں کھا رہے تھے روزانہ فریے بازی ہوتی تھی:

”گورہ ہندوستان سے نکل جاؤ“ اور بھی:

”ہندو مسلم بھائی بھائی“

ایک قادر مطلق کو ماننے والوں اور سیکڑوں خداؤں کو پوجنے والوں میں چارہ کیسے ہو سکتا ہے؟ گائے کو دیوتا ماننے والوں اور گائے کو ذبح کرنے والوں میں برادری کیسے ہو سکتی تھی یہ صرف ایک وقتی تاثر تھا۔

”میرے بیٹے جاؤ، میں تمہیں اللہ کے حوالے کرتی ہوں۔ اپنے مقدس وطن کی سرزمین کی حفاظت کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دو۔ مگر یاد رکھو! اگر کوئی گولی تمہاری پشت پر لگی تو میں دو دھڑکیں سینوں کی اور تمہارے شہید باپ کی روح کو بھی دکھ ہو گا جن کی غیرت نے مرنا گوارا کیا مگر کفر کے آگے سر نہ جھکا یا۔ یہ دیکھو! تمہارے باپ کی خون میں رنگی ہوئی مٹی کی سرخی تمہیں انتقام کے لیے پکار رہی ہے۔“

اپنے والد کی شہادت کا وقت یاد آتے ہی سید کی آنکھوں سے آنسو ٹھکنے لگے۔

فاطمہ پھوپھی پھر بولیں: ”بیٹا تم ایک بہادر باپ کے بیٹے ہو۔ بہادر وقت پڑنے پر رو یا نہیں کرتے اور پھر تم تو جہاد پر جا رہے ہو ہنسوا اور اگر ضرورت پڑے تو ہتھے پھیلتے عروس و وطن کی ماٹک اپنے لہو کی سرخی سے بھر دو۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں امی خدا گواہ ہے میں اپنے ابا کا انتقام لوں گا اپنی ان مظلوم ماؤں بہنوں اور بچوں کا انتقام لوں گا جو ان بھیڑیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔“

”مجھے اپنے بیٹے سے یہی امید ہے مگر بیٹا یاد رکھنا

علاقوں کی ایسی ناکہ بندی کر دی تھی کہ ان کی امداد کے لیے دوسری جگہ سے مسلمان نہ پہنچ سکیں۔ سعید کے والد شیر محمد ان تمام معاملات سے باخبر تھے۔ انہی حالات کے دوران ایک روز امرنگھ شیر محمد کے پاس آیا اور بولا ”شیر محمد ملک کے حالات نہایت ناگفتہ بہ ہیں خون ہماری قوم کے سر چڑھ چکا ہے اپنے بچاؤ کی کچھ تدبیر کر دو میرے خیال میں یہاں سے کسی مسلم اکثریتی علاقے میں نکلنے کی کوشش کرو اگر تم اکیلے اپنے بچوں کے ساتھ نکلنا چاہو تو میں انتظام کیے

ہندوؤں کے دل میں بغض تھا، حسد تھا اسی لیے ملک کے بٹنے ہی ہندوؤں کی آنکھوں میں خون اتر آیا وہی ہندو جو کل تک نعرے لگاتے تھے کہ ہندو مسلم بھائی بھائی وہی آج مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو گئے سب سے پہلے مسلم اقلیت کے علاقوں کو ہندوؤں نے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ مسلمانوں پر عذاب ٹوٹ پڑا۔ بلواری مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے متحد ہو رہے تھے اور نہتے مسلمان صرف اللہ کی امید پر بیٹھے تھے بلوائیوں نے مسلم اقلیتی



دیتا ہوں۔

”دوسرے مسلمانوں کا کیا ہوگا؟“ شیر محمد نے

پوچھا

”تمہیں دوسروں سے کیا واسطہ شیر محمد، رائے پور کے دوسرے مسلمانوں کو اب دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔“

”امر سنگھ کان کھول کر سن لو میں اپنے مسلمان بھائیوں کو ان حالات میں کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم ایک دوست اور غیر مذہب ہوتے ہوئے بھی میری جان، عزت و حرمت کی اتنی فکر کر رہے ہو تو مجھے اپنے ان بھائیوں کی عزت و حرمت اور جان و مال کی فکر کیوں نہ ہو جن سے میرا مذہبی اور خونی رشتہ ہے۔“

”خدا نہ کر شیر محمد! حالات بہت نازک ہیں۔“ مگر شیر محمد نے اس کی بات نہ مانی اور امر سنگھ غصے سے اٹھ کر چلا گیا۔

روزانہ بلوائیوں کے ظلم و ستم کی خبریں آ رہی تھیں اب رائے پور کے باہر واقع اکا دکا گھر بھی لٹنے شروع ہو گئے تھے۔ تمام مسلمان اپنے اپنے گھروں میں محصور تھے بلوائی روزانہ کسی نہ کسی گھر کو لوٹ کر گھر والوں کو قتل کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ مظلوموں کو بیچ و پکار بھی نہ کرنے دی جاتی۔ پھر ایک روز بلوائیوں نے پورے رائے پور کو لوٹنے کا پروگرام بنا لیا امر سنگھ اپنا حق دوستی ادا کرنے ایک بار پھر شیر محمد کے پاس آیا مگر ایسی شرائط پر جن کو سن کر ہر مسلمان وہی کرتا جو شیر محمد نے کیا۔ امر سنگھ نے تمام حالات سننے کے بعد کہا ”شیر محمد تمہارا اب ہستی سے نکل جانا کسی صورت

بھی ممکن نہیں۔ تم میرے عزیز دوست ہو اب صرف ایک ہی طرح میں تمہارے گھر کو بلوائیوں کے ہاتھوں سے بچا سکتا ہوں یہ لو لڑا، اسے اپنی کلائی میں پھین لو اگر سکتے تمہیں امرت بھی پلا سیں تو چکھ لینا۔ میں کہہ دوں گا کہ تم نے سکھ مذہب قبول کر لیا ہے۔ یہ ایک وقتی چال ہے شیر محمد جب بھی امن ہوگا تمہیں یہاں سے نکال دوں گا مگر یاد رکھو کسی مسلمان کی خیر خواہی میں تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلے۔ تم کو ٹاٹا ہری طور پر مکمل سکھ نظر آتا ہوگا۔“

”امر سنگھ چلے جاؤ یہاں سے۔ مسلمان شہید تو ہو سکتا ہے مگر ایمان نہیں گنوا سکتا۔ ذرا سوچو، جس نے اپنے بھائیوں کی خاطر یہاں سے نکل جانا پسند نہیں کیا وہ تمہارے مذہب کو کیسے قبول کر سکتا ہے۔ مسلمان جو کرتا ہے اپنے دل سے کرتا ہے ہمارا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اگر اسے ہمیں زندہ رکھنا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں مار نہیں سکتی۔“

”یہ زمانہ امن کی باتیں ہیں شیر محمد! اب تمہیں کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اپنے بچوں پر رحم کھاؤ وقتی طور پر سکھ بن جانے سے تمہارا کچھ نہیں بڑے گا۔“ امر سنگھ بولا۔

”امر سنگھ دفع ہو جاؤ یہاں سے، میں تو کیا کوئی مسلمان بھی تمہاری اس شرط پر یہاں سے نکلنا پسند نہیں کرے گا۔ مسلمان حالات سے ٹھننا جانتے ہیں۔“

”اچھا تو اب تم حالات سے منٹ لینا۔“ یہ تھے آخری الفاظ جو امر سنگھ کہہ کر چلا گیا۔

یہ 16 اگست کا دن تھا۔ بلوائیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر رائے پور کے مرد اور عورتیں بھی سروں سے کفن باندھ کر نکل کھڑے ہوئے ان کی تعداد صرف 45 تھی۔ سروں پر کفن باندھے اور ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور بانس لیے ہوئے

سعید ابھی چھ سال کا بچہ تھا۔ والدہ ایک ہاتھ میں کلہاڑی اور دوسرے بازو میں اسے اٹھائے ہوئے تھی۔ ابھی یہ منی بھر مسلمان گھروں سے نکل کر مسجد کے سامنے اکٹھے ہوئے تھے کہ بلوائیوں نے ایک طرف سے حملہ کر دیا۔ مسلمان موت کے شیدائی تھے کلہاڑیوں سے ایسے وار کیے کہ دشمن کے ٹکے چھڑا دیے۔ گو بلوائی ان سے تعداد میں دس گنا تھے مگر ان کو اپنی زندگیاں عزیز تھیں مسلمان صرف عزت کی زندگی چاہتے تھے یا موت اور پھر دو گھنٹے بعد ہزاروں بلوائیوں نے ان اسلام کے شیدائیوں پر انقلوں، بندوقوں اور بموں سے حملہ کر دیا۔ مسلمان مرد و عورتوں نے اپنے بچوں کو چھوڑ دیا اور مقابلہ کرتے رہے مگر کہاں تک؟ ادھر لاش تڑپتی، ادھر سر گرا، یہ بچے کا سرتن

آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ سعید کی والدہ انہیں اپنا ہمدرد پاکر سعید کو لے کر طبعے کے ڈھیر سے نکلیں اور اپنے خاوند کی لاش سے دیوانہ وار لپٹ گئیں۔ ایک نوجوان فوجی نے انہیں لاش سے علیحدہ کیا اور بولا ”محترم بہن! ہمیں احساس ہے کہ تمہیں سخت آذیت پہنچی ہے ان مظلوموں کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے اس کا خمیازہ انہیں ضرور بھگتنا پڑے گا۔ مرحوم نے سینے پر زخم کھا کر شہادت پائی ہے۔ ایک شہید کی بیوہ کو صابر و شاکر ہونا چاہیے تم اب آنسو بہا کر شہید کی روح کو دکھ نہ پہنچاؤ۔ آؤ اب جلدی کریں کہیں بلوائی متحد ہو کر دوبارہ حملہ نہ کریں۔“

سعید کی والدہ نے خاوند کی لاش پر آخری نگاہ ڈالی اور شہید کے خون سے رنگی ہوئی مٹی اٹھا کر اپنے پلو میں باندھ لی۔

فوجی جوانوں نے انہیں جالندھر کیمپ پہنچا دیا۔ ریونیو کیمپ میں عجیب گڑ بڑ مچی۔ بھوک سے نڈھال چہرے، طوفان کا شور، لٹیروں اور بلوائیوں کا زور۔“

سعید کی والدہ پندرہ روز تک کیمپ میں رہیں۔ سوہویں روز بعد مشکل ایک ٹرین میں سوار ہوئیں نئے سعید کے ذہن پر تمام واقعات اپنا نقش چھوڑ رہے تھے۔ گاڑی لاہور پہنچی وہی جالندھر والے کیمپ کی سی حالت تھی۔ زخمیوں کی تعداد بیسٹھاری اتنے زخمیوں کی مرہم پٹی تو آزاد مملکت کیسے کرنی؟ زخمیوں کے علاوہ کوئی اپنے گھر کا ماتم کر رہا تھا تو کوئی اپنے جوان بیٹوں کی موت پر گریہ کناں تھا۔ کسی کو اپنے بیٹے کا سر نیزے پر باندھنے کا مظہر خون کے آنسو رلا رہا تھا تو کوئی اپنی ماں بہن بیٹی کی عصمت کے ماتم میں سینہ پیٹ رہا تھا۔ پھر ان تمام مشکلات سے بچتے والوں کو دہائی امراض نے گھیر لیا میریا، ہیضہ اور دیگر امراض۔ مگر پھر بھی ہر ایک خوش تھا کہ وہ اب پاکستان میں ہے اور پاکستان اس کا گھر ہے۔

ان تمام کڑی منزلوں کو کاروان آزادی کے پروانوں نے طے کر لیا آبادی کاری شروع ہوئی حکومت نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا قافلہ پھوپھی کو بھی ضلع لائل پور (فیصل آباد) کے ایک گاؤں میں

سے جدا ہوا۔ وہ شوہر نے کراہتے ہوئے جان دے دی۔ عزرائیل موت آگ خون اور درندوں کے غول کے غول!

سعید چیخ کر اپنی ماں کو بلارہا تھا۔ قریب ہی اس کے والد ایک بلوائی سے متحم گھٹا ہورہے تھے۔ اس کی والدہ نے بھی شوہر کی مدد کی۔ ایک بانس پورے زور سے بلوائی کے سر پر دے مارا اور شیر محمد نے رائفل غنڈے کے ساتھ سے چھین لی۔

ابھی شیر محمد نے رائفل کو سیدھا بھی نہ کیا تھا کہ ایک طرف سے دھائیں دھائیں گولیاں آئیں اور شیر محمد کے سینے میں اتر گئیں۔ یہ فائر امر سنگھ نے کیے تھے ایک دوست نے اپنا حق دوپٹی ادا کر دیا ایک گولی سعید کی والدہ کی ٹانگ میں لگی تھی مگر خاوند کو گرتے دیکھ کر بیوی اپنا دکھ بھول گئی اس نے گرتے کو سنبھالا مگر گولیاں اپنا کام کر گئی تھیں اور جاہد کا خون فوارے کی طرح بہہ نکلا گرم گرم خون جس میں غیرت کی گرمی تھی۔

درندے اب لاشوں کو چھوڑ کر گھروں کو لوٹنے اور انہیں آگ لگانے لگے۔ سعید کی والدہ کچھ دیر خاوند کو دیکھ کر سسکتی رہیں اور پھر ان کا سر زانو سے اٹھا کر زمین پر رکھ دیا اور خون سے رنگے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ”اے میرے مالک میرے مولا! ہم پر کتنا ظلم ہوا ہے میرے مولا! ہم نے ان درندوں کا کیا بگاڑا تھا؟ صرف یہی کہ ہم مسلمان ہیں! میرے مولا میں اس خون کی سرخی کو گواہ کر کے تم کھاتی ہوں کہ ان درندوں سے بدلہ ضرور لوں گی۔ انہوں نے میرے خاوند، میری بیویوں اور میرے بھائیوں کو ناحق قتل کیا ہے۔ میرے مولا ان کو ان کے کیے کی سزا دے۔“

شاید یہ دعا کی قبولیت کا وقت تھا۔ اسی وقت بلوچ رجنٹ کی تین جھپیں آگئیں۔ سعید کی والدہ سمجھیں کہ شاید کچھ فوج ہے اس نے خود کو اور سعید کو جلعے ہوئے مکان کے طبعے میں چھپالیا۔ ملٹری والوں نے مسلمانوں کی لاشوں کو دیکھ کر بلوائیوں کو ہوائی فائر کر کے بھاگ دیا آنا فانا میدان صاف ہو گیا ملٹری والے لاشوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ ان کی

زمین الاٹ ہوگئی۔ سعید نے اسول جانا شروع کر دیا۔

سعید کو بچہ تھا مگر اس کے دل پر وہ تمام زخم تازہ تھے۔ وہ تمام ہولناک مناظر جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے سعید نے ڈل اور پھر یہ شکر کیا سعید کی والدہ نے اپنے خاوند کے خون میں رنگی ہوئی مٹی ایک ڈبیا میں بند کر رکھی تھی۔ وہ گا بے گا بے سعید کو یہ ڈبیا دکھا کر کہتیں ”بیٹا یہ تمہارے غیرتمند باپ کا خون ہے جس نے جان دے دی مگر ایمان پر آج نہ آنے دی۔ وعدہ کرو کہ تم اپنے مظلوم باپ کا بدلہ لو گے۔“

سعید اب جوان تھا۔ اپنے باپ کا خون دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھتا۔ آخر 1958ء میں سعید فوج میں بھرتی ہو گیا۔

کتنی خوش تھیں اس کی والدہ اپنے اکلوتے بیٹے کو فوج میں بھرتی کر دیا۔ وہ ہر کسی کو بتاتیں ”میرا سعید اب فوجی ہے۔“

1964ء میں سعید چھٹی پر گھر آیا تو مجھے بھی ملا۔ اس کی باتوں میں مجب جوش و خروش تھا۔ اسے مظلوم کشمیریوں سے ہمدردی آئے دن کے سرحدی جھگڑوں پر غم و غصہ تھا اسے قومی وقار پر کٹ مرنے کا عزم تھا حتیٰ یہ ہے کہ وہ بالکل ہی بدل گیا تھا جیسے اس کے جسم میں خون کے بجائے پارہ بھر دیا گیا ہو۔

اس کے بعد سعید سے دوبارہ ملاقات اگست 1965ء میں ہوئی جب وہ چھٹی پر اپنی والدہ سے ملنے آیا۔ سعید کی والدہ نے مجھے بلا لیا تھا سعید کی منگنی کی رسم تھی۔ گاؤں کے ہی ایک معزز گھرانے میں سعید کی منگنی کر دی تھی جس روز سعید کی منگنی کی رسم ادا ہوئی اسی روز سعید کو لاہور ہیڈ کوارٹر سے جلدی حاضر ہونے کا آرڈر ملا سعید نے اسی وقت تیاری کر لی اس کی والدہ کو پتہ چلا تو بولیں ”میرے بیٹے میں نے اسی روز کے لیے تمہارے جوان ہونے کی دعا مانگی تھی۔ جاؤ ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ڈٹ کر مقابلہ کرو تا کہ دشمن کو معلوم ہو جائے کہ 1947ء نہیں 1965ء ہے۔“

سعید اسی رز شام کو لاہور پہنچا اس کے جانے کے

کچھ روز بعد اس کا خط ملا ” پیاری امی جان!

سلام قبول فرمائیے! امی! آپ کے پاس سے آنے کے بعد مجھے واہمہ سیکٹر پر جانے کا حکم ملا تھا بھارت نے چھتمبر کو چوری جیسے حملہ کیا تھا مگر اسے منہ کی کہانی پڑی۔ میں اب بھی اپنے مورچوں میں بیٹھا ہوں۔

ہندوستان کا جو ٹینک یا جیپ آگے بڑھتی ہمارے جیلے تو پٹی اسے وہیں تباہ کر دیتے ہیں۔ صرف میں نے ان کے چھ ٹینک تباہ کیے ہیں ہماری ڈیوٹی نمبر پر ہے جو جنگی اعتبار سے اس وقت لاہور کی جان ہے۔ شدید فائرنگ ہو رہی ہے مگر میرے اور میرے ساتھیوں کے حوصلے بلند ہیں۔

امی سرحد کی طرف سے اب بھی لٹے پٹے قافلے آرہے ہیں بالکل 1947ء کی طرح بعض بڑے بہنیں اور بعض لاچار بوڑھے مگر امی اب 1947ء نہیں اب شاستری کو اپنے کے کا خلیازہ بھگتتا پڑے گا کل انڈیا والوں نے بہت شدید حملہ کیا تھا مگر میرے جوان مرد بھائیوں نے اس کا بے جگری سے مقابلہ کیا کہ دشمن کے دانت کٹے ہو گئے اچھا امی اب اجازت چاہوں گا مگر کی خیریت بتا دیجیے۔

آپ کا بیٹا سعید“

پھوپھی فاطمہ نے جواب میں لکھا:

”میرے نازی بیٹے!

ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ چھتمبر کے حملے کی خبر ریڈیو پر سنی۔ اس روز ریڈیو پر مسلسل خبریں سن رہی ہوں۔ میرے بیٹے مقدس سرزمین کی ایک ایک انچ زمین کی حفاظت اور ماؤں بہنوں کی عزت و ناموس تمہارے ہاتھ میں ہے بیٹا میرا یہ پیغام تم اپنے تمام ساتھیوں کو پہنچا دو۔“

پیارے بیٹو!

آزادی کی بٹا کے لیے ایسا وقت ہر قوم پر پڑتا ہے مگر تاریخ ان قوموں کو کبھی معاف نہیں کرتی جو ایسے وقت میں اپنی غیرت و عزت کو بالائے طاق رکھ کر گھٹنے ٹیک دیتی ہیں یا در کھو مسلمان شہید ہو جاتا ہے مگر

اور آج سے دو روز پہلے جو سلوک ہمارے سرحدی دیہات کے بچوں بوزھوں اور عورتوں سے ہوا وہ بھی یاد ہے۔ ہم نے بربریت کے ان تمام واقعات کے باوجود بھی اسلامی اخلاقی اقدار و ضوابط کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

امی جان دعا کیجیے اللہ تعالیٰ ہمیں آئندہ بھی صبر و تحمل عطا فرمائے (آمین)

آپ کا بیٹا سعید

اس خط کے بعد سعید کا کوئی خط نہیں آیا۔ آخر 17 ستمبر کو معلوم ہوا کہ سعید شہید ہو چکا ہے اس کے ایک ساتھی اور گہرے دوست شہزاد نے سعید کی ماں کو رومال میں بندھی ہوئی مٹی دیتے ہوئے کہا ”سعید نے اپنے سینے پر چھ گولیاں کھائیں۔ وہ دشمن کا تعاقب کر رہا تھا کہ باڑھ کی زد میں آ گیا۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا ”میرے خون سے رگنی ہوئی مٹی میری والدہ تک ضرور پہنچا دینا۔“

فاطمہ نے اس مٹی کو کھلی پر رکھ لیا اسے جو پھر شوہر کے خون سے رگنی مٹی میں ملا کر بولی ”شکر ہے خدا کا کہ اس نے مجھے سرخ رو کیا..... جس مٹی کی آزادی کے لیے باپ نے خون دیا تھا اسی مٹی کی حفاظت کے لیے میرے بیٹے نے بھی جان دے دی۔“ یہ کہہ کر وہ مڑی اور اپنے کمرے میں آ کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

پڑوسی خالدہ بیٹیاں نے ٹوکا:

”بیٹی! باہر تیرے بیٹے کی لاش پڑی ہے اسے اٹھوانے کا انتظام کر۔“

”اماں! اپنے بیٹے کو تو میں نے عرصہ پہلے وطن کی گود میں دے دیا تھا جس پر میرا حق نہ ہو اس کے بارے میں، میں فیصلہ کیسے کروں۔ اب جو کچھ کرنا ہے وطن والے ہی کریں گے۔“

دیکھنے والوں نے دیکھا سعید کا جنازہ کس دھوم سے اٹھا۔ گاؤں ہی نہیں قریبی شہر کے لوگ بھی اٹھ آئے تھے وطن والے بھی کب اپنے محافظوں کو بولتے ہیں۔

☆☆☆.....☆☆☆

اس کی گردن دشمن کے آگے کبھی نہیں جھکتی۔ دشمن پر کاری ضرب لگا کر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ کر دو میری اور لاکھوں ماؤں بہنوں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

16 ستمبر کو سعید کا پھر خط ملا۔

”پیاری امی جان!

اپنے بچے کا سلام قبول فرمائیے!

ہم عظیم کرن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم سات ستمبر کو واہگہ سے عظیم کرن کی طرف روانہ ہوئے تھے کوئی اچھا راستہ نہ تھا مگر پاکستانی فوج کے جانوں کے عزم و ہمت کے آگے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی حتیٰ کہ روہی نالہ کے کناروں کی اونچی دیوار قطعی طور پر ناقابل گزر تھی وہ بھی ہمارا راستہ نہ روک سکی ہم نے اپنی بیٹیوں اور توپوں کو کندھوں پر اٹھا کر اسے عبور کیا رات کے گیارہ بجے ہم نے روہی نالہ عبور کیا تھا۔ بارہ بجے دشمن نے باخبر ہو کر ہم پر فائر کھول دیا مگر دو دو ہاتھ صبح سات بجے ہوئے دشمن ہماری بے پناہ یلغار کے آگے جم نہ سکا اور آخر اسے ہجرت ہی پنی۔

ہم پاکستان کی بقا اور اپنی بہنوں کی عزت و ناموس کے لیے میدان کارزار میں کودے انشاء اللہ ہمارا ہر قدم دشمن کی طرف بڑھے گا دنیا کی کوئی طاقت اس عظیم قوم کو شکست نہیں دے سکتی لاہور کے عوام کے حوصلے کتنے بلند ہیں جی چاہتا ہے اس لاہور کی رہنے والی اپنی بہن کی خاک کو آنکھوں سے لگاؤں جس نے ہمیں لاہور سے گزرتے ہوئے ٹھہرا کر کہا تھا:

”بھیا زنگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں دشمن پر ٹوٹ پڑو تاکہ دو بارہ اسے ہماری سرزمین کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ ہو سکے۔“

امی جان کتنا اشتعال تھا اس بہن کے الفاظ میں۔

بھارتی فوج بھاگ گئی اور عظیم کرن کی پبلک بھی۔ مگر امی جان میں نے اور میرے دوسرے ساتھیوں نے بھاگنے والوں سے کوئی تعرض نہیں کیا اور نہ ہی کسی چیز کو ہاتھ لگایا 1947ء کے وحشیانہ اور انسانیت سوز سلوک کے زخم ابھی تک ہمارے سینوں میں تازہ ہیں

تقسیم و تاشیانیہ

دن کا حال

مجھے آباد کرنا ہے مجھے برباد کرنا ہے
خدایا دین د دنیا میں کرم تیرا ستم تیرا

تبسم زہرا رضوی

بھی.....

اُس نے قاسم علی سے پسند کی شادی کی تھی۔
دونوں سکھر میں رہتے تھے یہ بھی وہیں کالج میں پڑھتی
تھی، گھر بھی وہیں تھا گھر والوں نے شادی کی مخالفت
کی تھی، لیکن اُس کے سر پر تو عشق کا بھوت سوار تھا،
دوسری طرف قاسم بھی بات لے کر آنے پر سنجیدہ
تھا۔ اس طرح ایک چھوٹی تقریب میں وہ نیلوفر اعجاز
سے نیلوفر قاسم بن گئی۔ اور سال کے اندر ارحم بھی گود
میں آ گیا۔ قاسم کے گھر والے اُس سے خوش نہیں
تھے۔ وہ زمین جائیداد والے لوگ تھے اور شادیوں
کے ذریعے سے اُن کی زمین جائیداد میں اضافہ ہوتا
تھا، جبکہ نیلوفر کے والد ایک درمیانے درجے کے
گورنمنٹ ملازم تھے، لہذا انہوں نے ایک مناسب
جہیز دے کر بیٹی کی شادی کر دی تھی۔ ہاں اُسے تعلیم
کے زور سے آراستہ ضرور کر دیا تھا۔

نیلوفر سے چھوٹی ایک بہن تھی اور اس سے چھوٹا
ایک بھائی، نیلوفر کی والدہ بھی بہت پڑھی لکھی خاتون
تھیں، اُن کے حراج میں سلجھاؤ تھا۔ اس لیے گھر کا
ماحول بھی سلجھا ہوا تھا۔ جبکہ اُس کے سسرال کا ماحول
یکسر مختلف تھا۔ وہاں پیسا تو بہت تھا لیکن تیز و تہذیب

پینک سردی اپنے شباب پر تھی، پینک ہڈیوں کا
گودا جم رہا تھا، پینک سرد ہوا میں ستم کو کاٹنے ڈال رہی
تھی۔ مگر اُس وقت خود سے زیادہ اُسے فکر نئے بچوں
کی تھی۔ اور پھر خدا جانے کیا ہوا کہ جونہی اُس نے
اُس منوں دہلیز کو پار کیا۔ اُسے لگا کہ جیسے وہ کسی بلا کے
بہجرے سے نکل آئی ہو۔ ایک عجیب سا اطمینان اُس
کے اندر اتر آیا تھا۔ اس وقت مچ کے پانچ بج رہے
تھے اور ہر طرف گپ اندیرا تھا۔ دور سے آئی وہ لیکن
قریب آ رہی تھی اور اس کی روشنیاں گپ اندیرے
میں مچ کا پیغام تھیں۔“

یہ سندھ کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جہاں اُس نے
مصیبت میں پناہ لی تھی۔ پسند کی شادی بھی بعض
اوقات کیا کیا قیامتیں دکھاتی ہے وہیں رک گئی۔ اور وہ
ارحم کا ہاتھ تھامے نئے شیر کو گود میں کلجے سے لگائے
اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”سکھر.....“ کہہ کر اُس نے چادر کو اچھی طرح
اپنے گرد لپیٹا اور سوچوں کے دریا میں غرق ہو گئی۔
یہ پسند کی شادی ہی تو تھی، جس نے اس طرح
نئے بچوں کے ساتھ اُسے در بدر کر دیا تھا۔ اب اُس
کے سامنے گزرا وقت بھی تھا اور اگلی کڑی منزل

سمجھتی تھیں کہ چند دن کی عاشقی ہے کچھ دن بعد عشق کا بھوت اتر جائے گا۔ ادھر بھوت میاں کا حال یہ تھا کہ میاں بیوی روز بروز کھلی بھتیجی بنتے جا رہے تھے اور ساس بیگم کی تشویش بڑھ رہی تھی۔ وہ مستقل اس فکر میں تھیں کہ کسی طرح یہ شادی ختم ہو جائے لیکن قاسم کی دیوانگی سے پریشان نہیں۔ نیلوفر کے دو دیور چھوٹے تھے، سر انتقال کر چکے تھے۔ دونوں دیور نائٹ کلاسز میں میٹرک کے اسٹوڈنٹ تھے۔ ساس نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ نیلوفر پر دیور کے حوالے سے کوئی الزام لگا کر اس کی چھٹی کریں نیلوفر سب سمجھتی تھی مگر کبھی کچھ نہیں تھی کیونکہ شروع دن ہی سے قاسم نے کہہ دیا تھا کہ میرے گھر والوں کو کچھ نہ کہنا؟ ورنہ؟ اور پھر قاسم کی دیوانہ وار چاہت نے بھی نیلوفر کو مجبور کر دیا کہ گھر والوں کو کچھ نہ کہے قاسم کی معیت میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں وہ ایک نہایت ہی پُرکشش مرد تھا۔ جب وہ اپنی محمور آنکھوں سے نیلوفر کی طرف

کا فقدان تھا۔ وہاں کے لوگ زور زور سے ہاتھیں کرتے، ذرا ذرا سی بات پر ہنگامہ کھڑا ہو جاتا خاص کر کھانے پر قاسم سمیت پانچ بھائی تھے۔ قاسم تیسرے نمبر پر تھا۔ دو بڑے بھائیوں کی بیویاں انہی کے خاندان کی تھیں بڑی جھانی نیلوفر کی ساس کی بیٹی تھی اور چھوٹی بھانجی، جبکہ نیلوفر نہ صرف غیر خاندان کی تھی بلکہ اُن کے درمیان میں زبان کا فرق بھی تھا۔ بڑی بھویں چونکہ اُن کے خاندان کی تھیں اس لیے وہ سب ایک طرف یعنی ایک مارتی تھیں، نیلوفر کے ساتھ صرف قاسم تھا۔ اُس کی زندگی کافی مشکل تھی۔ لیکن وہ جب آسان ہو جاتی جب قاسم کے محبت بھرے بول اُس کی تہنائی میں رنگ گھول دیتے تھے۔

قاسم نیلوفر کو بہت چاہتا تھا بہت ہی زیادہ..... خود سے بھی زیادہ اپنے وعدے کا پابند، اگر اُسے زندگی کا ساسی بنانے کا وعدہ کیا تھا تو پورا کیا، خدا نے ارحم دیا تو جی گھول کر خوشیاں منائیں۔ ادھر ساس شمشاد بیگم یہ



جب اُس نے دعیٰ کی آزاد فضا میں سانس لی تو تبدیلی کا احساس ہوا، حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نیلوفر کو بہت چاہتا تھا۔ لیکن آخر تک اس کے ساتھ رونا روتا۔ اب جو دعیٰ میں رہائش کے ساتھ کاروبار شروع ہوا تو پانچوں بھائی جی جان سے اُس میں جٹ گئے اور ماں نے اپنی دونوں بہوؤں کے ساتھ پاکستان کا راستہ اختیار کیا۔

یہ 1990ء کی دہائی کی بات ہے اُس زمانے میں موبائل اتنے عام نہیں ہوا کرتے تھے ہاں گھروں میں ٹیلی فون سیٹ ہوتے تھے۔ نیلوفر میکے میں تھی ہائے افسوس کا جملہ صبح شام سنتی تھی۔ اور تعزیت کرنے والوں کا تانا بندھا ہوا تھا اور پھر رفتہ رفتہ ہجوم ختم ہونے لگا تو اب اُسے اپنے گھر کا خیال آیا پاپا کا گھر سرکاری تھا اُسے خالی کرنا تھا قاسم کا فون روز رات کو دعیٰ سے چند منٹ کے لیے آتا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔

”جان..... انور ڈر کرنا مشکل ہو رہا ہے میں ایک دن کے گپ سے فون کیا کروں گا۔ پھر دو دن ہوئے اور پھر تین چار ادھر نیلوفر کومی کا گھر ختم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ سامان بہت تھا۔ عزیز واقرباء تعزیت کے بہانے آتے اور ان کی حریص نظریں گھر کے سامان اور نیلوفر پر ہوتی تھی۔

بہت دن بعد نیلوفر نے ارحم کو غور سے دیکھا وہ بہت دبلا ہو گیا تھا۔

”پاپا کاں ہے؟“ اُس نے تو تلی زبان سے پوچھا تو ماں کے کلیجے پر چھری سی چل گئی۔ اب نیلوفر نے کلیجے پر پتھر رکھ کر مٹی کے کپڑوں کی الماری کھولی پھر اشکوں کا سیلاب در آیا سانس بحال ہوئی تو سوچا کہ آخر تک تک روؤں گی۔ مٹی کے پاپا کے شہزین اور گڈو کے کپڑے سب غریبوں میں دے ڈالے گھر کا سامان کچھ فروخت کیا کچھ پونہی دے ڈالا۔ پھر سسرال فون کیا تو ساس شمشاد بیگم نے اکھڑے لہجے میں بات کی۔

”آ جاؤ مگر قاسم تو اب ادھر نہیں ہوتا ہے۔“ وہ حسب عادت خاموش ہوئی۔

”آپ ڈرائیور سے کہہ دیں میں تیار ہوں۔“

دیکھتے تو سب شعوے مٹ جاتے تھے، مگر کہتے ہیں نہ۔ خورشید زیادہ پائیدار نہیں ہوتیں نیلوفر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سوتے سوتے اُس کی آنکھ کھلی تھی کوئی بھینک خواب دیکھا تھا۔ وہ پوری طرح پسینے میں نہانی ہوئی تھی۔

”کیا ہوا میری جان کیا ہوا؟“ قاسم نشو سے بیوی کے چہرے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔

”میں بھی خواب میں اس طرح نہیں ڈری۔“ نیلوفر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”جانو میں نے دیکھا کہ میرے ہر طرف لاشیں پڑی ہیں چیخ و پکار مچی ہے۔“ ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ دور نہیں دھماکے کی آواز آئی۔

”خدا ارحم کرے۔“ یہ کہتے ہوئے قاسم کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔ بہت دور سے واقعی چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور کچھ دیر بعد پتہ چلا تھا کہ قریب ہی واقع ساگنی ریلوے اسٹیشن پر بہت بڑا حادثہ ہوا ہے اور جاننا خبر یہی کہ اس حادثے میں نیلوفر کی ماں باپ اور بہن بھائی سب ختم ہو چکے تھے۔ پھر اُسے کچھ ہوش نہ رہا تھا اور جب آنکھ کھلی تو چار جنازے کفن میں لپٹے رکھے تھے اس نے اٹھنا چاہا لیکن ہمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اور پھر ہوش آیا تو سوائے آہ و فغاں کے کچھ بھی نہیں بچا تھا اور یہ تو اُس کے فرشتوں کو بھی نہیں پتہ تھا کہ واقعی کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

کیونکہ نیلوفر تو مٹی کی سیسکے میں ادھر ساس صاحبہ رسی سی تعزیت کر کے جانے کے بعد اسے مزید برباد کرنے کے منصوبے بنا رہی تھیں۔ اور اسی منصوبے کے تحت وہ ایک رات اپنی تمام آل اولاد کے ساتھ دعیٰ کے لیے روانہ ہو گئیں۔ جہاں ایک اچھا مکان ہی نہیں اُن کا خاصا کاروبار بھی موجود تھا۔ چند روز بعد قاسم کو بھی فون کر کے وہاں بلا لیا گیا۔

مرد کی فطرت یہ ہے کہ خاص کر شوہر کی کمصیبت میں وہ بیوی کا ایک حد تک ساتھ دیتے ہیں قاسم جب نیلوفر کے گھر جاتا اُس کا رونا شروع ہو جاتا وہ بیوی کے روز روز کے رونے پسینے سے ایک حد پریشان ہو چکا تھا۔

کہیں بھی فون کرنے کی اجازت نہیں تھی مگر کبھی کبھار وہ چھپ چھپا کر کہتی تھی، تو جس گھر میں پیسا پانی کی طرح بہایا جاتا تھا فون کے بل کے رونے شروع ہوجاتے، اُدھر اس کے بچوں کے خرچ کی باری آتی ادھر کال پڑا، بچوں کے فیڈر بنانے مشکل ہو رہے تھے حالانکہ کچن میں بڑے سے برتن میں دودھ ہوتا لیکن جانے کیا تھا کہ جب نیولوفر گھوم لینے جانی، بوا کہنے لگتیں۔

”ارے بھائی دودھ کم ہے یہ تو پینے کے لیے کمرہ میں جانے گا۔“ وہ ادھا ادھا فیڈر لے کر جب کمرے میں آئی تو خیال آتا کہ سب راج شوہر سے ہوتا ہے مگر شوہر تو بھائیوں کے بھی یہاں نہیں ہیں یہاں آ کر اس کا دل عجیب طرح دھڑکتا؟ اور پھر ایک دن ساس نے نیولوفر سے اس کا کرہ بھی لے کر اُسے تیسری منزل پر ایک ٹوٹا ہوا سا ٹھکانہ دے دیا۔

”ہمارے مہمان آرہے ہیں امریکہ سے، جب چلے جائیں تو لے لینا۔“ سوچا رونا چاروہ اوپر آگئی تھی۔

اوپر آنے کے بعد ارجم بھی چپ سا ہو گیا تھا۔ وہ اُسے بہلانے کی کوشش کرنی تو خود رو پڑنی، ذرا دل ٹھکانے آیا تو اُسے یاد آیا کہ آئی فضاء جو تھیر کے سلسلے میں اس کے پاس آئی تھیں کہا کرتی تھیں۔

”انسان کو چٹان کی طرح مضبوط ہونا چاہیے۔“ وہ خود جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں تب ایک بیٹا ایک بیٹی تھی بیٹا تین سال کا اور بیٹی چھ ماہ کی، گود میں تھی محنت مزدوری کر کے انہوں نے بچے پال لیے۔ بیٹی کی شادی کر دی اور بیٹا شادی کر کے الگ ہو گیا وہ پھر تنہا ہو گئیں۔ لیکن حوصلہ نہیں ہارا بہت حوصلے سے پھر مجبور ٹیکسٹری میں ملازمت کرنی۔ انسان جب دوسروں کے دکھ دیکھتا ہے تو اپنی معیبت پھیر آ جاتا ہے آئی فضاء کے بارے میں سوچتے ہوئے اُسے نیند آگئی تھی۔

دوسری صبح نیولوفر کے لیے قیامت کا نظام لائی تھی۔ وہ کچن میں بچوں کا دودھ لینے لگی تھی گھر میں سنانا چھایا ہوا تھا کہ اچانک اُس نے کچن کے سامنے سے ایک شخص کو گزرتے دیکھا، وہ چہرے سے ہی جرائم پیشہ معلوم ہوتا تھا، نیولوفر تیزی سے نیچے بیٹھ گئی اس طرح وہ اسے دیکھ نہیں پایا، وہ اس کی ساس کے

”اچھا بہت جلدی گھر کی یاد آئی؟“

نیولوفر کا دل دھک سے رہ گیا، وہ نہ جانتی تھی کہ ابھی تو ابتدا ہوئی ہے، آگے کتنی کڑی منزل اس کے لیے کھڑی ہے، گھر خالی ہو گیا، اُس نے مہی کے زبور سنبھال کے اٹیچ میں رکھے اور سسرال آگئی، کوئی استقبال کرینو الا نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی جہاں اُس کی دو قاسم کی مشترکہ تصویر نے اُسے ویلکم کیا۔ گھر میں عجیب قسم کا سناٹا تھا دونوں بھڑائیوں بھی کچھ بدلی ہوئی نظر آئیں۔ چند دن گزرنے تو ایک روز اچانک قاسم آگیا۔ مگر اتنا مصروف کہ اللہ کی پناہ اُسے یہاں سے مال دینی بھجوانا تھا۔ یہاں کی ٹیکسٹری بھی دیکھنی تھی اس لیے بیوی بچوں کی طرف دیکھنے کی زیادہ فرصت تھی۔ اُس پر تو نیولوفر کی سناٹی ہوئی اس خوش خبری نے بھی کچھ زیادہ اثر نہیں کیا تھا کہ وہ بہت جلد ایک اور بچے کا باپ بننے والا ہے۔

دو دن رہنے کے بعد وہ واپس چلا گیا، لیکن نیولوفر کے دل میں ایک عجیب سی غلش چھوڑ گیا، ارجم کی مرتبہ تو قاسم نے اُس کا بہت خیال رکھا تھا، اب نہ مہی میں نہ پاپا نہ بہن بھائی نہ قاسم، وہ اکیلی باہر چل گئی، ایک بیکے کی عزیزہ آئی فضاء جو رشتے میں اُس کی خال کئی تھیں اور بہت غریب تھیں، اُن کی مجبور ٹیکسٹری میں جا بگی جو کئی چھوٹی تھی اُس نے انہیں بلا لیا تھا۔ وہی ارجم کو سنبھال رہی تھیں۔

جب نیولوفر نے شبیر محمد کو جنم دیا تھا ایک مولوی صاحب اسپتال میں آئے تھے یہ نام انہوں نے ہی تجویز کیا تھا۔ بیٹا یہ نام رکھو گی تو تمہارے دل کو سکون ملے گا۔ خیر وقت کیسا بھی کڑا ہوا، لا خیر گز رہی جاتا ہے، سو یہ قیامت کی گھڑیاں بھی گزر گئیں۔ اور وہ گود میں پیارا سا بیٹا لے ہوئے خیریت سے گھر آگئی، کسی نے بڑھ کر مبارکباد بھی نہیں دی۔ حتیٰ کہ نوکر ماسیوں تک کا رویہ بدل گیا تھا، اب نیولوفر کا دل کسی خطرے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

چند ماہ انہی سرد رویوں میں گزر گئے، قاسم کا فون اب ہفتوں میں آنے لگا تھا، گھر کے فون سے اُسے

کرد اور پھر اتفاق سے اس وقت بہت سارے مہمان آگئے خالد ساس اپنے پورے خاندان سمیت آپہنچی تھیں۔ نیلوفر نیچے چلی گئی اُس نے اپنے چہرے سے بالکل یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اُس پر کیا گزری ہے؟ خالد کے ساتھ اُن کے چھ بیٹے، بہوئیں، چار بیٹیاں اور پتہ نہیں کتنے پوتی پوتا نواسے نواسیاں تھیں، ماسیاں بہت سا کھانا پکا رہی تھیں، دودھ کا بھی بہت بڑا برتن بھرا ہوا تھا، سب سے بات چیت کر کے وہ اپنا کھانا و بچوں کا بہت سا دودھ سب کی نظر سے بچا کر اوپر لے آئی اور آ کر پھر اس کی حالت خراب ہونے لگی بہت کرو اُس نے خود کو تسلی دی اور قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اپنے سینے پر دم کرنے لگی، حوصلہ مضبوط ہونے لگا۔ کپڑے تو پہلے ہی اٹیچی میں رکھے تھے اس وقت ضرورت ہے گرم کپڑے، کمبل اور پیسے، ایک لاکھ کی ایک گڈی جو قاسم نے منہ دکھائی میں دی تھی یونہی پڑی تھی، کچھ رقم پرس میں بھی تھی۔

اصل میں اُسے پیسے خرچ کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی، پاپا کے ہاں سبھی دلوانی تھیں اور یہاں قاسم اس لیے اتنے پیسے نکل آئے۔ نوٹوں کی گڈی اٹیچی کے خفیہ خانے میں محفوظ کی۔ مٹی کے زیور بھی سنہیال کر رکھے، کمبل تہہ کیا اس کے ساتھ ہلکی سی دلانی بھی تھی۔

رات ہوتے ہی نیلوفر نے بچوں کو گرم کپڑے پہنائے، خود موٹا سوئٹر پہنا اور شمال کو اچھی طرح پلیٹ کرتیار ہو گئی۔ نیچے سب کھانا کھا کر آرام کرنے لیٹ گئے تھے وہ لوگ دوسرے شہر سے آئے تھے اور جلدی سونے کے عادی تھے۔ اُس کی ساس شمشاد بیگم اپنی اس بہن کو بہت چاہتی تھیں، وہ بھی بہن کے ساتھ باتیں کرتے سوچتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ مکان پرانے وقتوں کا بنا ہوا تھا اس زمانے میں جمادارنی صفائی کرنے پچھلے دروازے سے آتی تھی، اس کے لیے لکڑی کا زینہ تھا جو اب خاصا بوسیدہ ہو چکا تھا۔ نیلوفر جانتی تھی کہ گیٹ پر چوکیدار بیٹھا ہے وہاں سے جانا

سارے کی طرف جا رہا تھا، نیلوفر کا دل دھڑک اٹھا جتن سے ایک گلی نما راستہ اُس کمرے کی طرف جاتا تھا، وہاں ماسی جھاڑو وغیرہ رکھتی تھی۔ وہ چپکے چپکے اس طرف چل دی، کھڑکی کھلی تھی اور بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”دولا کھ لگیں گے۔“

”دولا کھ؟“

”ہاں بی بی معاملہ ٹھکانے لگانے کا ہے۔“

”اگر ایسا ہو جاوے کہ بچے یتیم خانے میں اور لڑکی ہمارے بعد کوٹھے پر تو پیسے کم ہو جائیں گے۔“

”نہیں ختم کرتا ہے۔ میرا پاپا اس پر جان دیتا ہے، اس کے فون آ رہے ہیں کہ بات کرو، او میں اُسے کسی طرح ٹال رہی ہوں، یہ زندہ بچ گئی تو خطرہ ہے میں دوسری لاؤں گی تو کروڑوں کی جائیداد ساتھ لائے گی۔“

”بس.....!“ خود کروڑوں اور ہمارے دولا کھ بھی برے؟ بی بی پکڑے جاتے ہیں تو پھانسی ہوتی ہے۔ دوسے ایک پیسہ کم نہیں لڑکے کو بول دینا بھاگ گی۔“

”آدھے پیسے ابھی آدھے پیسے جب کام ہو جائے۔“ یہ تمام گفتگو سن کر نیلوفر پسینے میں نہا چکی تھی۔

کل تین بجے میں اُسے کسی بہانے بچوں کے ساتھ گلی کے کونے تک بھیجوں گی پھر تم نے اپنا کام کرنا ہے۔“

اب نیلوفر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لیکن وہ اُس حالت میں بھی اپنے بچوں سے غافل نہیں تھی بڑی مشکل سے بے آواز قدموں کے ساتھ وہ چپکے سے اوپر آ گئی تھی۔ نیچے سو رہے تھے اور وہ حواس باختہ۔

”میرے پاس چوبیس گھنٹے ہیں۔“ ایک ماں اس کے اندر سے بول رہی تھی۔

”دیکھو نیلوفر تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو، اور اب تو تم نماز بھی پابندی سے پڑھنے لگی ہو خدا سے مدد مانگو، اُس کی پٹنی مانتہ پڑنے لگی۔“

مصیبت میں گھبراتا خود ایک مصیبت ہے، بہت

مامور کیا گیا تھا، گاڑی جب چل پڑی تو گرم کپڑوں اور کپیل کی قدر بھی تب ہی پتہ چلی۔ سردی تھی کہ اللہ کی پناہ، کچھ کھانے کے لیے خریدنا بچوں کو دیا خود کھایا اور پھر جو کپیل اودھ کر اُسے نیند آئی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ فیصل آباد آ گیا۔ اس کے دل سے ڈر اب بہت حد تک کم ہو گیا تھا۔ اس کی برتھ اور پریکٹس بھی میرا ایک لڑکی نے بدل اسے نیچے کی دے دی تھی۔ اس کا بچوں کا ساتھ جو تھا۔ اس نے بچوں کا منہ ہاتھ دھویا اپنا حلہ ٹھیک کیا۔ لیڈ بڑے میں یہ آرام ہوتا ہے۔ اب اگلی منزل سامنے تھی۔ ماڈل ٹاؤن میں مئی کے بھائی ماموں قیصر الدین رہتے تھے نیلوفر نے انہی کے گھر جانے کا سوچا تھا۔ اور پھر لاہور آ گیا تھا قلی ڈبے کے اندر آگئے تھے۔

ایک قلی نے اس کا سامان اٹھالیا باہر آ کر رکشہ کر لیا، پتہ بھی با آسانی مل گیا لیکن اس دوران دل دھڑا دھڑا دھڑک کر اسے ہونے کا اعلان کرتا رہا، گھر پر ممانی تھیں، بہت رکی تھیں اور مذاق میں یہ بھی کہہ دیا۔

”خیریت، بیع ساز و سامان؟“ نیلوفر نے کہا
 مئی تھی، شام کو ماموں آگئے تھے۔ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

”بس ماموں جان! مئی یاد رہی تھیں، ویسے بھی قاسم دہی میں ہیں گھر میں سنا رہتا ہے تو میں نے سوچا کہ آپ سے مل لوں۔“

”ہاں ہاں! کیوں نہیں، خوشی سے رہو تمہارا مئی گھر ہے۔“ انہوں نے محبت سے کہا اور مائی انہیں گھورتی رہیں۔

نیلوفر بچپن میں سنتی تھی کہ کسی کا کسی کے گھر گزارہ نہیں اور یہ بات اب سمجھ میں آ رہی تھی۔

ماموں کی دو بیٹیاں تین بیٹے تھے ایک بیٹی شادی ہو کر کینیڈا چلی گئی تھی۔ ایک بیٹی مائی باہر ہی تھی۔ باقی دو پڑھ رہے تھے بس اس لیے اس کو بیٹی کا کمرہ دے دیا تھا۔

رات ہو چکی تھی سب سونے کے لیے لیٹ رہے تھے۔ نیلوفر بھی بچوں کو لے کر کمرے میں چلی آئی۔

ناممکن ہوگا۔ زینہ بچھلی گلی میں اترتا تھا جو دن میں بھی سنسان رہتی تھی اور اب تو رات ہو چکی تھی، لیکن بچوں اور سامان کے ساتھ میں کیسے اتروں گی۔ اگر ایک رسی سے اٹھی و کپیل نیچے اتار دوں تو.....!

”رسی کہاں سے لاؤں.....“ پھر اچانک اُسے کپڑے پھیلانے والے تار کا خیال آیا جو موڑی محنت کے بعد اُس نے کھول لیا، اُس میں اٹھنی کا ہینڈل باندھا، اور کپیل کے کیس کا ہینڈل بھی پھر بڑی ہی مشکل سے اُسے گلی میں اتار کر تار چھوڑ دیا خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ ارحم کا ہاتھ کپڑے شبر کو سینے سے لگا دے وہ گول زینہ اترنا قیامت سے کم نہ تھا، لیکن خدا اُسے ہمت دے رہا تھا، اس کے پیروں نے زمین کو چھوا لیا تھا۔ اُس نے جلدی سے اٹھنی سے تار الگ کیا تھا۔

”اصل منزل اب شروع ہوئی ہے دل پکارا.....“ پرس ایک کندھے پر تھا، دوسرے پر شبر سیدھے ہاتھ میں اٹھنی و کپیل کا ہینڈل پکڑ کر ارحم سے کہا۔

”پناتم میری شرٹ پکڑو اور چلو۔“ تین سالہ ارحم ماں کی شرٹ پکڑ کر چلنے لگا، جلدی سڑک آگئی تھی۔ ایک رکشہ آ رہا تھا۔

”اسٹیشن۔“ نیلوفر نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ رو پڑی اسٹیشن اُس کا دیکھا ہوا تھا۔

اسٹیشن پر رکشہ رکستے ہی ایک قلی بھاگ کر آیا تھا۔

”کہاں جاتا ہے؟“
 ”لاہور جاتا ہے۔“ اُس نے کچے لہجے میں کہا تھا۔

لاہور..... گاڑی کھڑی ہے لیکن ٹکٹ بلیک میں لے گا۔“

”برتھ چاہیے پہلے ٹکٹ لا کر دو پھر پیسے دوں گی۔“

قلی چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ٹکٹ لے کر آ گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر نیلوفر کے ہوش ٹھکانے آئے مگر باوجود اس کے کہ وہ ہبایا پہنچے ہوئی تھی اسے ہر شخص اُس غنڈے کی طرح معلوم ہوتا، جسے اس کے اور بچوں کے قتل پر

جائے گا؟“ عیسری کی آواز آئی تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سب کبھی اُس کی اور کبھی کمرے کی طرف دیکھ رہے تھے، اُن کی خوشیوں کے درمیان حامل شرم سے اُس کا سر جھک گیا۔

”تمہارے لیے ہم اپنا کمرہ خالی کر دیں گے۔“ ماموں نے خوشدلی سے کہا تھا۔

”نہیں ماموں جان! میں لاؤنج میں سو جاؤں گی۔“ مامی کی نظروں میں ملامت دیکھ کر بے اختیار نیلوفر کے منہ سے نکلا یہ کہہ کر وہ واقعی کمرے سے اچھی لاؤنج میں لے آئی۔

”ارے نیلو باجی! میں لاؤنج میں سو جاؤں گا۔“ عیسری بولا تھا۔

ماموں کے اشارے پر مامی اُس کا سامان پھر کمرے میں رکھ آئی تھی۔

رات کو یہ سوال اُس کے ذہن میں بری طرح سے سر اٹھائے ہوئے تھا۔

کہاں جاؤں؟ سچے سو گئے اور پھر اُسے اس طرح رونا آیا کہ پچھلی بندھی سانس آنا دوبھر ہو گیا، کون تھا جو اُسے چپ کرتا۔

وہ لوگ جو شروع سے مصیبتیں دیکھتے ہیں۔ انہیں اُس کا حل بھی آتا ہے، لیکن یہاں ایسا نہیں تھا، نیلوفر اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی، اس نے بھی دکھ مصیبت اور پرانے گھر کی پریشانی نہیں دیکھی تھی۔ صرف قاسم سے شادی پر تھوڑا سا غلغلہ ہوا تھا، اور مہی پاپا کیوں منع کر رہے تھے، یہ اُس کی سمجھ میں اب آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے کوئی مصیبت نہیں دیکھی تھی۔ اب یہ سوال کہ نئے بچوں کے ساتھ کہاں جائے۔ دماغ ہلا دینے کو کافی تھا۔

نیلوفر نے مامی کو اپنے اصل حالات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، ورنہ مامی تو مامی ماموں بھی چلتا کرتے۔ ہفتے ہونے کو تھا اُسے یہاں پناہ لیے ہوئے، اب مزید بڑا دشمن نہیں تھا۔

پھوٹی ٹیلی او باڈو میں رہتی ہیں اُسے اچانک اُن کا خیال آ پاجھلی رک گئی تھی۔ وہ اس پر غور کرنے لگی کہ آگھ لگ گئی۔ نیلوفر بچپن ہی سے خواب نہیں دیکھتی تھی

تھرات کا ایک طوفان تھا جو اس کی جانب چلا آ رہا تھا۔ پتہ نہیں جب صبح ہوئی ہوگی تو گھر میں کیا ہوا ہوگا؟ مجھے ڈھونڈنے کے لیے ہر طرف بندے دوڑا دیے ہوں گے، شکر تھا کہ شمشاد بیگم اس کے میکے کے لوگوں کو زیادہ نہیں جانتی تھیں، ویسے بھی انہوں نے اسے بہو تسلیم ہی کب کیا تھا۔ پھر تھوڑا یہ اطمینان ہی ہوا کہ ماموں ایف آئی اے میں آفسر تھے۔ ایک خیال آیا تھا کہ قاسم سے بات کی جائے، مگر قاسم سے امید کم ہی تھی، اُس نے تو شادی کی رات گھونگٹ اٹھا کر پہلی بات ہی یہ کی تھی کہ میرے گھر والوں کو کچھ نہ کہنا؟ اور ویسے بھی قاسم کون سا پہلے جیسا رہ گیا ہے تو پھر کیا کروں؟ ایک سرد آہ اس کے سینے سے خارج ہو گئی تھی۔

دو تین دن کے اندر ہی نیلوفر کو اندازہ ہو گیا کہ یہاں گزارہ مشکل ہے، ارحم ایسے ایسے سوال کرتا کہ دل ٹوٹ جاتا۔

”ماما ہم بابا کے پاس کب جائیں گے؟ آپ انہیں فون کریں نا؟“ ارحم ایسے امید بھرے لہجے میں بولا کہ اُس کی سلی کے لیے نیلوفر نے نمبر نکالنے کے لیے پریس کھولا، اور دل دھک سے رہ گیا، پھر سارا پریس کھنگال ڈالا، پورے دس ہزار روپے غائب تھے ساتھ میں قاسم کا نمبر بھی جان ہی تو نکل گئی، اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

”ماما فون.....“

”فون کہاں سے کروں بیٹا، نمبر کھو گیا ہے اور پھر گھبرا کے اُس نے اٹیچی کھولی، خفیہ خانہ کھولا تو لاکھ روپے اور چوہری موجود تھی۔ اُس کی جان میں جان آئی تھی پھر اُس نے اپنی ہر شلوار میں جیب لگائی تھی، ان چند دنوں میں اُس کو سبق پر سبق مل رہے تھے۔

ماموں کے گھر میں تیسرے روز صبح نیلوفر کی آنکھ کھلی تو بڑی چہل پہل نظر آئی۔

کمرے سے باہر نکلی تو معلوم ہوا کہ ماموں کا بیٹا عیسری اور بیٹی وطن واپس آ گئے ہیں۔ مامی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

”امی ہمارا سامان کون سے کمرے میں رکھا

تھیں جو نیلوفر کی سمجھ میں آرہی تھیں۔ اس کے زکے پر اُن کے گھر کا ماحول خراب ہو گیا اُسے منظور نہیں تھا۔
”اچھا ماما! ارانی، عمیر سب کو خدا حافظ۔“

”سب سامان رکھ لیا؟ ویسے بیٹیاں سسرال میں ہی اچھی لگتی ہیں۔“ ماما نے دوبارہ آنے کا راستہ بند کیا تھا۔ اُن کا ڈائیورگسلس ہارن دے رہا تھا۔

ٹرین میں بیٹھ کر نیلوفر کی آنکھیں بری طرح چمک پڑیں اب دیکھو سسلی پھوٹی کے ہاں کیا ہوتا ہے؟ بچپن میں ایک بار ماما کے ساتھ اُن کے گھر گئی تھی۔ بڑا سا گھر تھا کچا کچا؟ وہ کی بہت محبت سے تھیں۔ اسی لیے اس کڑے وقت میں اُن کا خیال آیا تھا، پھر سارے گھر کے مرنے پر بھی آئی تھیں اور اُسے گلے لگا کر بہت دیر روئی رہی تھیں یہی وہ باتیں تھیں جو نیلوفر کے لیے اُن کا دروازہ نظر آیا تھا۔ ٹکٹ تو اُس نے کھری کے منگوائے تھے لیکن اترنے کا فیصلہ ڈھری کر تھا۔

ساری رات کے سفر کے بعد ڈھری کی آنکھیاں اکیلے سفر آسان نہیں ہوتا، دل بہت دھڑک رہا تھا جب اس نے اسٹیشن پر قدم رکھا، تاکہ تیار تھا، بس اڈے پر پہنچ کر دین میں بیٹھے ہوئے وہ پسینے میں نہا چلی گئی، کنڈیکٹر کی اوبازا دوباؤڑو کی آوازوں کے ساتھ سب کی نظریں اس پر بھی تھیں، ننھے شبیر کو گلے لگا کر ارحم کا ہاتھ تختی سے پکڑے، نیلوفر کے کان میں ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

”لڑکی ہم سے گزر کر کوٹھے پر، بیچے بیچیم خانے میں۔“ پھر قرآنی آیات کا خیال آیا تو دل سکون مانے لگا۔ کچھ دیر گزری تو اس کی منزل آگئی۔ شکر ہے کہ گھر اسٹاپ کے بالکل نزدیک ہی تھا، لیکن یہ لوگ اپنے جیلے سے الگ معلوم ہوتے تھے اس لیے مقامی لوگ غور غور سے دیکھ رہے تھے کہ گھر آ گیا۔

”امی دیکھیں کون آیا ہے؟“ ثناء کی آواز پر سب گھر جمع ہو گیا۔ استقبال بہت اچھا تھا، دل کو تھرا کر آ گیا۔ گھر تو بہت بڑا تھا لیکن کمرہ ایک ہی تھا، سارا گھر دن زیادہ تر صحن میں وقت گزارتا، رات کو کمرے میں ہوتے، لیکن سردی کا زمانہ تھا، بچوں کی عادت نہ تھی پھر کمرے میں صرف افراد خانہ ہی کی گنجائش تھی

لہی اور سوگنی اگر دیکھا بھی تو صبح آنکھ کھلتی تو یاد ہی نہیں رہتا تھا، بس ایک وہی محسوس خواب یاد تھا، جو اس کا سارا گھر لے گیا تھا۔

اب جو آنکھ لگی تو اُس نے خواب میں دیکھا کہ کھلا آسمان ہے جیسے صحرا میں تخت بچھا ہے، وہ اس پر اکیلی بیٹھی ہے۔ سب گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں، شام کے سائے گہرے ہوئے تو پناہ کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی، بائیں ہاتھ پر ایک جمو پتڑی ہے، جب اندر میرا چھانے لگا تو اُس نے جمو پتڑی میں پناہ لے لی، وہاں کئی کا چولہا بھی تھا، ایک لائٹیں اور قریب ہی مچس بھی رکھی تھی، اس نے اُسے جلا لیا، کچھ ڈبے بھی تھے کھولا تو ان میں راشن رکھا تھا، سب کچھ ہے بس واش روم نہیں ہے غور سے دیکھا تو کونے میں دروازہ تھا۔ کھولا تو صاف واش روم تھا، یہ تو بہت اچھا ہے۔ استے میں لگا کہ بارش ہو رہی ہے، ہوائیں چلنے کی آوازیں بھی کان میں آئیں، اس کا دل دھڑک رہا ہے، پھر سوچتی ہے کہ دروازہ کھولی کر دیکھے کہ باہر کیا حال ہے، دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی، ہاں جمہری سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ طوفانی ہوائیں اور بارش خدا کی پناہ! اگر ذرا سا بھی دروازہ کھولا سب اندر آئیں گی اور یہ جمو پتڑی تنکا تنکا ہو جائے گی۔ سوائے خدا کے کوئی نہیں ہے جو طوفان میں اس جمو پتڑی کو بچا سکے۔ بس یہاں اُس کی آنکھ کھل گئی۔ یا خدا! دہشت سے اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ بس اس وقت نیلوفر نے سوچ لیا کہ سسلی پھوٹی کے گھر پناہ لی جائے۔

صبح اُس نے رواجی کا اعلان کر دیا، ماما کے چہرے پر بے بسی دوز گئی اُن کی بیٹی کے چہرے پر اطمینان نظر آیا ماموں گھر نہیں تھے۔
”اپنے ماموں سے مل لیتیں۔“ ماما نے خانہ پری کی۔

”جی ماما! انہیں فون پر خدا حافظ کہہ دوں گی۔“ وہ جانتی تھی کہ ماما نہیں چاہتیں کہ وہ ماموں کے سامنے جائے، وہ اُسے روکتے مگر اب نیلوفر کا فیصلہ اپنی جگہ پکا تھا۔ بیچے اُن کا رونا، کیا پتہ کیسے آئی ہے کہیں ماماں سے لڑائی تو نہیں ہوئی یہ ساری وہ باتیں

لائین سے کچھ اجالا ہوا اس کا دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا، جیسے کوئی بہت بڑی مصیبت منہ کھولے کھڑی ہو، آنکھیں پھیلیں، رخسار تر ہوئے دامن نم ہو گیا۔ ارحم خوفزدہ نظروں سے مٹا کو دیکھ رہا تھا، اُس نے سامنے نظریں دوڑائیں پھوپھو کے باروچی خانے میں سب کھانا کھا رہے تھے۔ خوب رونق تھی پھوپھو بھی اپنے بچوں میں خوش تھے، بس رہے تھے۔

”یہ تمہارے کمرے سے نکلنے کا جشن ہے۔“ اس کے اندر سے آواز آئی۔ کوئی کسی کے گھر میں کب تک رہ سکتا ہے؟ ویسے میری جگہ اگر پھوپھو کی بیٹی ہوتی؟ اُسے اس طرح اندھیری جھونپڑی میں رکھا جاتا؟

پھوپھو کے بچے کھانا کھا کر سونے جا رہے تھے، پھوپھو اُسے اُٹے میں کھانا دے گئیں، بچا ہوا نیلوفر کا دل بھر آیا تھا اور پھر جب وہ سونے لگی، آنسوڑکنے کے آثار ہی نہیں تھے یہاں سردی بہت تھی۔ ارحم بھی پہلے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ ماں کا کلیجہ شق ہو کر رہ گیا، اس بات سے بے خبر کرا بھی تو اس کے مقدر کے ترکش میں بہت سے تیر پاتی تھے۔

”ماما گھر چلیں، بابا کب آئیں گے؟“ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ دوسری صبح پھوپھو کی بڑی بیٹی آمنہ بمعہ دادی اماں تشریف لے آئیں، اُس کی دادی اماں تشریف لے آئیں، اُس کی دادی یعنی پھوپھو کی ساس اس کے ساتھ (سوئی) میں رہتی تھیں، اُسی کے دوسرے بھائی سے دوسری بہنِ ضامنہ کی شادی ہوئی تھی، وہ دوسرے گھر میں رہتی تھی۔ اس کا بھی فون آ گیا تھا کہ چینیچنے والی ہے، گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ حنا اور ثناء ان کے بچے اٹھائے خوش خوش پھر رہی تھیں، نیلوفر کے دل میں کچھ ٹوٹ رہا تھا کسی نے اس طرح اس کے بچے کبھی نہیں اٹھائے۔

”کوئی بات نہیں..... یہ اُن کی سبکی بہن ہے۔“ ایک بات یہ بھی گئی کہ وہ چاروں بہنیں نیلوفر سے کچھ جیلس بھی تھیں اس کی وجہ وہی شہر گاؤں کا پرانا مسئلہ تھا، دوسری جانب نیلوفر کے گھر کا اسٹیڈرڈ اُن

پھوپھو کے سات بچے تھے چار بیٹیاں، تین بیٹے، پھوپھو کا مزاج انتہائی کڑوا تھا، لیکن سب اسی کمرے میں کیسے سوتے تھے اسے روز حیرت ہوتی، پھوپھو کی دو بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں، وہ اپنے گھروں میں خوش تھیں باقی حنا اور ثناء تھیں۔ جواذ نواد اور چھوٹا عماد کمرے میں نکل پانچ چار بابائیاں بچتی تھیں۔ ایک پر پھوپھو چھوٹے عماد کو لے کر سوئیں، ثناء سے چار پانی لے کر اسے دے دی تھی، ایک پر پھوپھو ایک پر نواد ایک پر جواذ اب حنا اور ثناء ایک چار پانی پر سوئیں تو اُن کی لڑائی ہوتی جگہ کم تھی اور افراد زیادہ، خود اُسے دو بچوں کو سلانے کے بعد اپنے لیے جگہ کا کافی مشکل ہوتی۔

دو تین دن اسی عالم میں گزرے، چوتھے دن نیلوفر نے دیکھا ان کے صحن کے ایک کونے میں موجود ایک جھونپڑی کی پھوپھو صفائی کر رہی تھیں۔

”ہائیں پھوپھو یہ کیا کر رہی ہیں؟“

”ارے جگہ کم ہو جاتی ہے ہم یہاں سو جایا کریں گے، پہلے یہاں بکریاں باندھی جاتی تھیں، پھر وہ بک گئیں تو آمنہ یہاں پڑھانی کرنے لگی۔“

”ارے نہیں پھوپھو اچھی بھلی جگہ ہے میں بچوں کے ساتھ یہاں رہ جاؤں گی۔“

پھوپھو کا شاید پروگرام ہی یہ تھا، تھوڑی دیر میں نیلوفر نے اپنی اپنی یہاں رکھ لی۔ لائٹ کے نام پر پھوپھو کے ہاں صرف دو پہلے بلب تھے۔ اور ہوا کے لیے ایک ہیڈنٹل فین، خیر اچھی تو سخت سردی تھی، دسمبر کا مہینہ تھا، لیکن بہت بڑی پریشانی یہ تھی کہ اس کی جھونپڑی لائٹ سے محروم تھی، ایک بلب پھوپھو کے کمرے میں ایک صحن میں جلتا تھا، صحن بہت بڑا تھا۔

شام ہونے لگی، کیا ہم اندھیرے میں رہیں گے؟ بچے تو بہت ڈریں گے۔ پھر فوراً ہی نیلوفر کا دھیان اس کی طرف چلا گیا جو ستر ماؤں سے زیادہ شفیق و مہربان ہے۔ اُس نے ڈکے دل سے اس سے مدد طلب کی اور اس وقت پھوپھو لائین لے کر آتی ہوئی نظر آئیں۔

”لو بیٹا! اندھیرا ہو رہا ہے یہاں بلب نہیں ہے ان کے ابا نہ لگاتے ہیں نہ لگانے دیتے ہیں۔“ اسے پھوپھو کی خوشی آنکھیں یاد آ گئیں۔

جاہتی ہیں؟“ جی پھوپھو بولیں۔ نیلوفر نے دیکھا تے دل کے ساتھ کہا۔

”نہیں بس وہ.....“ پھوپھو کچھ معمول سی بیٹیں۔
 ”اگر تم برانہ مانو تو اپنا کھانا یہاں پکا یہ۔“

انہوں نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔
 ”تم اتنے میٹھے بھی خریج کرتی ہو، پھر بھی بھون رہ جاتی ہو کزور ہوئی ہو۔ ہم تمہیں برتن دے دیتے گے۔“ پھوپھو واقعی کچھ برتن لے آئیں اور اینٹوں کا چولہا بھی بنا دیا۔ نیلوفر نے چولہا جلا لیا، اُسے بیس پڑھا ہوا قوںل یاد آیا۔

”ہر بلا کے پیچھے رحمت ہے۔“ اپنے ہاتھ سے پکایا ہوا کھانا زمانے کے بعد پیٹ بھر کر کھایا اور تو اور بچوں نے بھی سیر ہو کر دو دھ بچا، اُس نے ٹھیکر پکادی بھی خوب خوش ہو کر کھائی تھی۔

نیلوفر کو یہاں آئے تیس روز کے قریب ہو رہے تھے۔ اب ہر روز ایک نئی کہانی اُس کی خنجر ہوتی، پھوپھو کی ساس نے اس کے یہاں رہنے پر پتہ نہیں کیا کیا فسانے تراش کر محلے میں پھیلادے تھے۔ اُس نے اپنی ساس کو مارا ہے جب ہی انہوں نے گھر سے نکال دیا ہے، مہاں نے چھوڑ دیا ہے جب ہی یہاں رہتی ہے۔ مجھے لگتا ہے دیور سے چکر تھا۔ واقعی اُن کا دماغ بے حد غلط تھا۔

یہ سب باتیں اُن کی طرف ہوتیں، تھوڑی بہت آوازیں ادھر آئیں تو وہ سر تھا م لیتی یا اس کی کوئی ہمدرد بناتی ہی تھی۔

پھوپھو کے پوچھنے پر اُس نے بتایا تھا کہ قاسم کا جن میں برنس ہے وہ وہ ہیں ہیں، گھر کی مرمت ہو رہی ہے اس لیے ساس اپنے میکے اور جھانٹیاں بھی اپنے اپنے میکے گئی ہیں میرا میکہ چونکہ ختم ہو چکا ہے اس لیے میں آپ کے گھر آگئی ہوں۔“ لیکن قاسم کے خیر خیر نہ لینے پر انہیں بھی تشویش تھی۔

بھی، بھی نیلوفر کا دل چاہتا کہ جمو پزوی سے قدم نہ نکالے، لیکن لکڑیاں فروخت کے لیے اونٹ پڑ آئیں، خریدنے دروازے پر جانا پڑتا۔ پانی کے بے صحن میں ہینڈ پمپ تھا، ایسا لگتا جیسے وہ پھر کے دور میں

سے الگ تھا، گلاب وقت بگڑ گیا تھا، خدا نے اسے اُن کے دروازے پر لاپھونکا تھا تو بدلا لینے کے لیے اس سے بہتر کون سا وقت ہوتا، ایسی طغیہ باتیں کی جاتیں کہ دل، باوجود مخالف کے ٹھہرے برداشت نہیں کر پاتا، اور کرچی کرچی ہو جاتا۔ باوجود اس کے نیلوفر اپنی ضرورت کی ہر چیز اپنے پیسوں سے منگواتی لیکن پھر بھی وادی یونہی کہتیں۔

”ہاں بھئی لنگر خانہ کھلا ہے۔“ ارحم اور شیر روتے رہتے، کوئی گود میں نہیں اٹھاتا۔ نیلوفر بھتی تھی کہ یہ سب اشارے تھے ہمارے گھر سے جاؤ۔ ان کے گھر کھانے میں مرچیں بہت ڈالی جاتی تھیں نیلوفر سے کھائی نہیں جاتی، پھوپھو پہلے جو چھینی میں تھوڑا سا اصلی مٹی ڈال کے دے دیتی تھیں۔ اب ساس کے ڈر سے خاموش تھیں۔ سالن دیکھ کر ہی اس کی سرخی سے اُسے خوف آتا وہ چپ چاپ کھانا چھوڑ کر اٹھ جاتی، کوئی یہ بھی نہیں کہا کہ بھوکی کیسے رہو گی؟“

یہ میدانی علاقہ تھا آندھیاں آتیں، ایک دن اس زور کی آندھی آئی کہ صحن میں رسی پر لٹکے ہوئے سب کپڑے اور چولے کے قریب رکھے سب برتن اڑ گئے، نیلوفر حیران رہ گئی، اُس نے ایسی آندھی کبھی نہیں دیکھی تھی، جلدی سے بچوں کو کس کر پکڑ لیا کہ کہیں اڑ نہ جائیں اب جمو پزوی کی بھی گھر ہوئی، مگر خدا نے رحم کیا۔ کچھ دیر کے بعد حالات معمول پر آ گئے۔

رات کو لالین میں تھیل نہیں تھا، اُس نے بھی روشنی سے انکار کر دیا۔ شکر ہے یہاں رات جلدی ہو جاتی تھی اس لیے بچے سو گئے تھے۔ مارے خوف کے وہ دونوں بچوں سے لپٹ گئی تھی۔

”قاسم اور کئی ٹھوکرین کھلاؤ گے؟“ اُس کے دل سے صدائنگلی پھر اُسے ٹنڈے سے ساس کا یہ کہنا یاد آیا کہ قاسم روز بوی بچوں کا پوچھتا ہے، اس کا مطلب قاسم ہمیں بھولے نہیں لیکن اب کوئی ٹنڈہ کوئی ایسا نہیں تھا جس سے قاسم کا اتہ پتہ مل سکے، اگر کہیں پتہ کرنے نکلوں بھی تو بیچ میں ساس اُن کے رشتہ دار ہیں، کون بتائے گا؟“ سردا نے کلچو بھی ہلا دیا تھا۔

اگلی صبح پھوپھو جمو پزوی میں آئیں، لگتا تھا کچھ کہنا

بڑا احسان تھا لیکن اس کے اگلے دن وہ ہوا جو نیلوفر کی سوچ سے باہر تھا۔ جواد بھائی کسی کام سے اس کی جھونپڑی میں آئے ہزار کا کھلا درکار تھا اس نے دے دیا عین اسی وقت دادی ادھر آ گئیں اور اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگیں کہ اللہ کی پناہ!

نیلوفر کو اپنی حالت پر بہت رونا آبارت کو اس پر بخار چڑھ دوڑا وہ بھی ایک سو چار ڈگری! اسے کچھ ہوش نہ رہا ہوش آیا تو صبح سے شام ہو گئی تھی بچے بھوک سے بلبلارہے تھے کوئی حلق میں پانی ڈالنے والا نہیں تھا وہ بمشکل نلکے تک آئی تنہا پانی بھر رہی تھی۔

”ابھی ٹہریں پہلے میں بھروں۔“ یہ دیکھ کر بھی بولی کہ اس میں کھڑے رہنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔
 اُن کی طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔
 ”یہ آخر کب جائے گی؟“

”یہ پانی جواد بھائی کے لیے لے جا رہی ہیں؟“
 یہ کہہ کر تباہے اختیار نہس پڑی۔ نیلوفر نے ایک لفظ نہیں کہا۔ تنہا کے جانے کے بعد پانی پیا جھونپڑی میں آئی چولہا جلایا دلپہ پکایا اور روتے ہوئے ارحم کے ساتھ اپنی بھوک بھی مٹائی، شبیر کو دودھ پہلے ہی دے چکی تھی۔ بخار اتر گیا تھا لیکن اُس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ زبان کے ذمہ کھال کر چکے تھے۔

اب رات بھی بچے سو گئے تھے۔ اُن کی ساری باتیں دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ جواد بھائی کو وہ سکے بڑے بھائی کی جگہ جتنی ہی اور وہ سب اُس کا رواں رداں رو رہا تھا۔

”نیلوفر چل خدا کے لیے یہاں سے چل پیسے بھی ختم ہو رہے ہیں۔“ دل نے آواز دی تھی۔

”کہاں جاؤں۔“ یہ کہہ کر اسے اس بری طرح رونا آیا تھا کہ سانس اکھڑی جاتی تھی پھر حواس ٹھکانے آئے تھے۔

”کراچی چلتے ہیں بابا کہتے تھے کہ کراچی کی زمین ماں کی کوڈی طرح ملک کے بچوں کو سیٹھتی ہے۔“ ذہن نے مشورہ دیا تھا۔

”سردی بہت ہے بچے چھوٹے ہیں۔“ اندر سے

سفر کر رہی ہو۔ ادھر پھوپھا صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد سے ہی عاجز تھے۔ تو پھر اس کا وجود سالے کی بیٹی! انتہائی نفرت بھری نگاہ سے دیکھتے اُن کے آتے ہی گھر میں سنانا چھا جاتا اُن کے بچے کو نے کھدروں میں چھپتے پھرتے، پھر آج کل تو بیٹیاں آئی ہوئی تھیں خرچ بڑھ گیا تھا لہذا ان کا چڑچاپن عروج پر تھا۔

ایک رات جب ہولناک سنانا چھاپا ہوا تھا سوتے ہوئے تمام خیالات جنوم بنا کر اس کے سامنے رقص کر رہے تھے۔ اُس کو خیال آیا بیشک کہ پھوپھا نفرت کرتے ہیں لیکن بد نظر نہیں ہیں اگر خراب نظر ہوتے تو یہاں رہنا کتنا مشکل ہو جاتا پتہ نہیں کب اُس کی آنکھ لگتی تھی۔

صبح شور سے آنکھیں کھلیں تھیں۔ رات چور آئے تھے انہوں نے بڑی نقب لگائی تھی لیکن شکر خدا کا سب بچ گیا تھا۔ اس کے پاس اپنے جینز بڑی اور می کے زیورات یعنی کل چوہری کم از کم ڈیڑھ کو سونا تھا، موٹے موٹے ٹھوس کڑے سونے کی بازب قاسم بڑے شوق سے لایا تھا۔ اُس نے اپنی چیک کی روپے اور چوہری سب موجود تھا۔ اُس نے تو کسی کو بتایا بھی نہیں تھا کہ میرے پاس اتنی بڑی مالیت کے زیورات موجود ہیں۔ دل بہت پریشان ہوا کہ ابھی تو بچ گئے آگے کیا ہوگا؟

لوگ کہہ رہے تھے چوروں نے پاڑ یعنی نقب لگائی تھی لیکن بچوں کی آوازوں سے بھاگ گئے ہوں گے۔ آمنہ کے بچے رات بہت دور رہے تھے خراب وہ چاروں بہنیں انتہائی طنز یہ باتیں کرتیں۔

”انسان کو خدا کے قہر سے ڈرنا چاہیے بڑے بڑے بنگلے کو بھی والے جھونپڑی میں رہنے لگے۔“ تنہا کہتی ٹٹا ٹٹھہ لگاتی۔ نیلوفر دل میں سوچتی کہ ”ڈرنا چاہیے تو پھر ڈرو؟“

دادی کی زبان ہری مریج تھی لیکن ہر انسان میں بری دونوں طرح کی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں ایک دن دادی نے اسے پاس بٹھایا پھر کلام پاک سنا چھوٹی موٹی غلطی ہوئی اُسے ٹھیک کر دیا یہ تو بہت

آواز آئی۔

”بچوں کے لیے ہی تو یہ سوچا ہے، مری تو رہی تھی بخار سے، کسی نے طلق میں پانی بھی نہ ڈالا۔ چل ہمت کر خدا کی ذات بہت بڑی ہے، اس کی زمین بہت بڑی ہے نیلوفر کو جمال چھا کا خیال آیا وہ ڈرگ روڈ پر رہتے تھے اُسے ان کے گھر کا راستہ بھی سمجھنا بہت یاد تھا۔ نمبر 4 میں پہنچ کر تو راستہ زبانی یاد تھا۔

نیلوفر اللہ کا نام لے کر اٹھ گئی سامان پیک کیا، تقریباً دو گلو دودھ بڑے قمراس میں رکھا چھوٹے قمراس میں جانے اور کھانے پینے کا کچھ سامان پیک کر کے بچوں کو بستر سے اٹھایا اور کیبل دلائی پیک کر لے، ارحم کو تیار کیا خود بھی پہنچ گیا ڈبل ڈبل سوسٹر خود پہنے اور بچوں کو پہنائے، اُپٹی بستر تھمیت کر دروازے تک لے آئی۔

”پھوپھا ٹیشن کے لیے گاڑی روک دیں۔“

اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے پھوپو داش روم کے لیے آگئی تھیں۔

”جاری ہو؟“

”جی پھوپو۔“ پھوپا دروازہ کھول کر نکل گئے

تھے۔

”پھوپو یہ رکھ لیں۔“ اس نے دودھ کے پیسے اُن کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ”دودھ والا آئے تو اسے دے دیجیے گا۔“

”اچھا.....“ کہہ کر انہوں نے پیسے رکھ لیے تھے۔ یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ بے خانماں مسافر کہاں کا ارادہ ہے۔

”گاڑی آگئی ہے..... اچھا خدا حافظ

خدا حافظ۔“ بس یہی وہ احساس تھا جسے وہ زندگی بھر بھلا نہیں سکتی تھی۔ اتنی پریشانی کے باوجود نیلوفر نے جو بھی قدم گھر سے باہر نکالا، لگانوں بوجھ اتر گیا۔ حتیٰ کہ ساس شمشاد بیگم کا خوف بھی جو ہر وقت اُس کے وجود کا احاطہ کیے رہتا تھا وہ پورے اعتماد سے بچوں کو لے کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ روپڑی دو گھنٹے میں آ گیا، ابھی اندھیرا تھا، کراچی کے لیے گاڑی تیار گئی۔ اکیلے سفر کر کے اس کا اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ گلی سے ہی سیٹ

غزل

اکیلا ہوں کہ تنہائی بہت ہے
کسی کی یاد بھی آئی بہت ہے

مجھے ہر جانی آنکھوں نے بتایا
مری آنکھوں میں بیتائی بہت ہے

محبت..... اور یہ عمر گریزاں
تعارف اور شناسائی بہت ہے

تعلق توڑنا آساں ہے لیکن
جدا ہونے میں رسوائی بہت ہے

تری سوچوں سے عاجز ہوں میں جاوید
تری سوچوں میں گہرائی بہت ہے

عبدالله جاوید

لے لی سیٹ پر بیٹھ کر بچوں کو فیڈر دی۔ بیچے بھی خوش تھے، ارحم نے خود بھی تالی بجائی، بھائی کو بھی سمجھانے وہ

گیا تھا چھوٹا لیکن ہوا دار تھا۔ نیلوفر اسی رات اس گھر میں شفقت ہو گئی تھی۔

وہ چھوٹا بچہ جو پڑھی لکھی یہ کرائے کا مکان، لیکن دل کی حالت اب بہت بہتر تھی۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھانا آسان نہیں تھا لیکن راحت چچی نے اس کی صحیح معنوں میں مدد کی تھی، ان کے لیے اس کے دل سے دعا نکلتی، گھر میں گیس بجلی پانی فون سب موجود تھا۔ زندگی بہت مشکل نہیں رہی تھی۔ لیکن رات کو اسے جب تنہائی میں اس غنڈے کا خیال آتا تو ڈر لگتا اور وہ قاسم سے ملنے کی دعا کرتی۔ ہر بلا کے پیچھے رحمت ہے، مصیبتوں نے اسے اللہ سے بہت قریب کر دیا تھا اب وہ پابندی سے نماز پڑھتا، گناہوں سے بچتا رہتا تھا۔ اس کی شہنائی رنگت بھی لوٹ آئی تھی۔ بڑوں میں میلاد تھا، وہ جانے کے لیے تیار ہوئی راحت چچی نے اسے دیکھا تو بس دیکھتی رہ گئیں۔ پھر کہنے لگیں۔

”میں نے جو بھی مشورے تمہیں دیے سب کارآمد تھے، اب آخری مشورہ یہ ہے کہ کسی اچھے عالم سے مشورہ کر کے شیخ نکاح کا فتویٰ لے کر دوسری شادی کر لو۔“

”چچی.....! اللہ نے میرے بچوں کو باپ سے الگ کر دیا ہے، میں ماں بھی چھین لوں۔“

”میرا کام سمجھانا تھا سمجھا دیا۔“ وہ اسی لہجے میں بات کیا کرتی تھیں۔

نیلوفر اب نماز کے بعد مسجدے میں پڑی روتے ہوئے پہلے اللہ کی ہر نعمت کا شکر ادا کرتی پھر دعا۔

”اے اللہ تو قادر ہے، سب کچھ کر سکتا ہے تو کوئی معجزہ کر دے کسی بھی طرح کسی بھی صورت مجھے میرے شوہر میرے بچوں کے باپ قاسم سے ملادے۔“

☆.....☆.....☆

ارحم اب اسکول جانے لگا تھا۔ وہ شام کو بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اس شام وہ بہت تیزی سے بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا اور کچن میں کھس گیا تھا۔

”ارحم بیٹا کیا ہوا؟“ مگر وہ تو ماں کی بات سنی ان سنی کر کے ایک جگہ میں پانی بھر کے باہر نکل گیا تھا۔

بھی بجانے لگا۔ نیلوفر نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے سینے پر دم کیا اور بچوں پر بھی پھر تو لگا کہ جیسے کچھ وزن ہی نہ ہو سارا وجود ہلکا ہو گیا۔

اللہ کہتا ہے..... میری رسی کو منبوٹھی سے تھامے رہو، پر میں نے تو کوئی رسی نہیں دیکھی جو آسمان سے لگتی ہو، یہی وہ رسی ہے انسان کا اپنے رب سے واسطہ اس کے نور کی رسی، ہمارے قلب تک پہنچتی ہے۔ بس میرے رب تو میری مدد فرما اپنے نبی ﷺ کے صدمے میں مصوم بچوں پر رحم فرما۔ نیلوفر نے قبیلے کا تعین کر کے نماز کے لیے نیت باندھ لی۔ ٹرین چل پڑی تھی۔ نماز تمام کر کے گھر ماں سے چائے نکالی پرس سے سبک غذا شام میں پہنچی تو سکون ملا..... ”اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

کراچی آ گیا تھا۔ وہ تو خیر پور کے بعد ہی سو گئی تھی، شبیر ایک زانو پر دوسرے پر ارحم پھر جو آنکھ کھلی ٹرین کراچی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ لائن می آ گیا تھا۔ لوگ اتر رہے تھے۔ اس نے بھی سامان سمیٹ لیا۔

”اب ڈرگ روڈ ہے۔“ کوئی بولا۔ اور واقعی کچھ ہی دیر میں اس کی منزل آ گئی تھی۔

جمال چچا کا گھر بھی آسانی سے مل گیا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح ملے، چچی راحت بھی خوش تھیں۔ رات کو انہوں نے نیلوفر سے کہا۔

”ہاں بھئی اب صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے؟“

نیلوفر نے کہنا شروع کیا۔ جھوٹ نہیں، بالکل سچ اور بری طرح اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ چچی راحت لیکچرار تھیں۔ مقامی کالج میں پڑھاتی تھیں۔ انہوں نے اس کا مسئلہ سنا اور کھردرے لہجے میں بولیں۔

”نہ یہاں کوئی کسی کے بچے رکھتا ہے نہ کسی کو اپنے گھر میں رکھتا ہے۔ میں تمہارے لیے کل کوئی مکان دیکھوں گی اور بچے ٹیوشن کے لیے۔“

صبح چھٹی تھی انہوں نے فون سمجھانا شروع کیا پھر اس کو لے کر نکلیں محلے ہی میں ایک کمرے کا مکان مل

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اور مایوس لوٹ آتا دل میں طرح طرح کے دوسرے جنم لیتے، دوسری طرف ہمارے کاروبار میں ترقی تو بہت ہوئی لیکن یہ پیسا بری چیز ہے، ہم بھائیوں میں پھوٹ بڑگئی میں اپنا حصہ لے کر پاکستان آ گیا، ادھر ماں نے سکھروالی کو بھی ڈی ڈی تو ہم کراچی شفٹ ہو گئے، میں نے یہیں کورنگی میں ایک چھوٹی آئل مل لگالی ہے۔

کچھ عرصے پہلے مجھے کہیں سے بھنگ ملی تھی کہ تم لاہور ماموں کے گھر رہو میں وہاں گیا تو وہ رنگ رہ گئے، کہا کہ تم تو سکھر کے لیے روانہ ہوئی تھیں، انہوں نے بھی بہت ڈھونڈا، وہ بھی بہت پریشان تھے کہ آپا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ خیر شکر ہے اللہ کا لاکھ بار کہ تم لوگ یوں مل گئے۔ اور پھر نیلوفر نے اپنی کہانی سنائی تو قاسم مرد ہو کر رو پڑا۔ خاص کر جمو نیوزی والی روداد سن کر.....!

”قاسم! پتہ نہیں کتنے لوگ ہیں جنہیں یہ بھی میسر نہیں ہے، پھر یہ دیکھیں اتنی بارش ہوئی، آندھی آئی، طوفان آیا، جمو نیوزی میں پانی نہ آنا اس بات کی دلیل تھی کہ خدا ہم پر مہربان ہے۔“

”مہربان نہ ہوتا تو آج ہم اکٹھے کیسے ہوتے؟“ قاسم نے اپنی بیوی اور بچوں کو گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ دوسری صبح قاسم نے کہا۔

”تیار ہو جاؤ چلنا ہے، میں تمہیں ایک بار ای سے لوانا چاہتا ہوں۔“ نیلوفر نے جواب میں کچھ نہ کہا اور خاموشی سے تیار ہو گئی۔ کوٹھی کے اندر سنا تھا، ایسا کہ دل ہول جائے، قاسم نے ماسی کو آواز دی۔

”ماں کولاؤ۔“ اور وہ جو آئی تو نیلوفر کا منہ کھلا رہ گیا۔ ذیل چیتر پر ایک بڑھیا، ہوش و حواس سے عاری سر پر ایک بھی بال نہیں، سیاہ رنگ دواؤں کے نشے سے سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ یہ اُس کی ساس شمشاد بیگم تھیں۔ بے شک اللہ خالم کو ڈھیل ضرور دیتا ہے معاف بھی نہیں کرتا ہے۔

☆☆.....☆☆

نیلوفر نے دروازے سے جھانک کر باہر گلی میں دیکھا تھا۔ ایک گاڑی گلی کے کونے پر کھڑی تھی۔ ”کسی آدمی نے پانی مانگا ہے، اس کی گاڑی بند ہو گئی ہے۔“ پڑوس کی خالد نے کہا تھا۔ ارجم بھاگتا ہوا واپس آ رہا تھا۔

”ماما.....!“ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ”ماما وہ بابا ہے۔“ یہ کہہ کر ارجم پھر جگ بھر کر نکل بھاگا تھا۔ نیلوفر تو جیسے اپنی جگہ پتھر ہو گئی تھی۔ ”بیٹے! تم تو بڑے پیارے ہو تمہارا نام کیا ہے؟“ گاڑی والے شخص نے پوچھا تھا۔ ”محمد ارجم اور میرے بابا کا نام قاسم علی شیخ ہے۔“ ”یہ یہ ارجم کیا کہہ گیا ہے؟“ نیلوفر کو مکھو کے عالم میں گھر کے دروازے پر گئی تھی۔ اور باہر گلی میں جھانکا تھا۔ اُسے ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ گویا مجروحہ روٹنا ہو گیا تھا۔ قاسم نیلوفر کا اپنا قاسم، اپنے سات سالہ بیٹے ارجم کو گود میں اٹھائے چلا آ رہا تھا۔

”ق.....ق.....قاسم!“ اور پھر قاسم کے لیے اُس نے دل و مکان کے دروازے کھول دے تھے کوئی لحاظ کیے بغیر وہ بے ساختہ اُس سے لپٹ گئی تھی آسودگی کی جھڑی لگ گئی تھی۔

راحت چچی دم بخود یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ”خوش رہو نیلوفر!“ اجسی میں چلتی ہوں، تم لوگوں کی تنہائی میں غل ہونا نہیں چاہتی۔“ انہوں نے مسکرا کر نیلوفر کو دیکھا تھا۔

”تمہاری لگن واقعی سچی تھی، تمہاری دعائیں بڑی طاقت ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی تھیں۔ اُس رات دونوں نے اپنی کہانی سنائی تھی۔

”میں ہر فون میں امی سے تمہارا اور بچوں کا پوچھتا تھا؟ تم میری جان میں اور ہو پتے میری زندگی میرا اٹھ تھے اُن کے بغیر میری زندگی لا حاصل تھی، شروع میں تو وہ بات نہیں کروائی تھیں، پھر کہا کہ تم بچوں کو لے کر کہیں چلی گئی ہو، میں پہلی فلائٹ سے گھر آ گیا، انہوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھالی۔ میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا، سب جگہ پتہ کیا مجھے جب بھی کوئی تمہارا سراغ ملتا میں بڑی امید لے کر وہاں جاتا

سستی جاگتی کہانیاں

ان سب سے بڑے گروہوں کی کہانیاں: عمارت اور گران کی کہانیاں

سکھتے رہے اربان

بلاک چورم کا خیال

ہو گیا آخر تلف وہ کاروان آرزو
مدتوں جس نے اڑائی دل کے دیوانوں کی خاک

حسین خواجہ

اس سے پہلے کہ میری آنکھیں اٹکبار: دتیں میں
جلدی سے چائے والے برتن اٹھاتے ہوئے بچن کی
طرف دوڑی برتن دھونے سے پہلے آنکھوں کے
راستے خوب دل کا غبار نکالا۔ پھر برتن دھوتے ہوئے
سوچتی رہی کہ امی نے ایسا کیوں کیا ہے، امی تو سب
جاتی ہیں کہ یا سر مجھے اور میں یا سر کو پسند کرتی ہوں
اور نہ تو یا سر میرے لیے غیر ہے اور نہ ہی میں یا سر کے
لئے، ویسے بھی انہوں سے بڑھ کر کون ہوتا ہے، اب
ایسی بات بھی نہیں کہ امی پھوپھو کو اچھا نہیں سمجھتیں، ہم
لوگوں اور پھوپھو میں فرق صرف دولت کی دیوار کا تھا
اُن کی دیوار تھوڑی اونچی تھی اور ہماری دیوار اس قدر
چھوٹی تھی کہ اکثر اُس کا سایہ کم بڑ جاتا تھا۔

گھر میں میرے علاوہ تین بھائی اور چار بہنیں
تھیں، جن میں سے دو اپنے گھر کی ہو چکی تھیں، ایک
بھائی بھی شادی شدہ تھا جو کہنے کو تو ہمارے ساتھ ہی
رہتا تھا لیکن حقیقت میں اس کو ہم سے کوئی سروکار نہ
تھا، اُس کی دنیا اور میری دنیا اور.....

اب میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا کہ میں کیسے
امی کو کہوں کہ آپ میرا اور یا سر کا رشتہ کر دیں یہ لڑکی
ہونا بھی کتنا عذاب ہوتا ہے میں تو مل کر اپنی خواہش کا

میں بچن میں کھڑی شام کی چائے بنا رہی تھی، صحن
میں امی اور پھوپھو بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک
میرے کانوں نے ایسی بات سنی کہ میرے پاؤں کے
نیچے سے زمین نکل گئی اور میرا دل خون کے آنسو
رونے لگا، یقین نہیں آ رہا تھا کہ امی ایسی بات کر سکتی
ہیں، خیر خود کو کٹر ول کیا اور دو کپ چائے ٹرے میں
رکھ کر پھوپھو اور امی کے آگے رکھ کر واپس بچن میں
آگئی، میں گہری سوچوں میں گم تھی، کچھ حد تک دماغ
بھی شل ہو چکا تھا، پتا ہی نہ چلا کہ کب پھوپھو چلی گئیں،
سوچوں کا تسلسل تب ٹوٹا جب امی کی آواز میرے
کانوں میں پڑی۔

”فصرت چائے والے برتن اٹھا لو۔“

جب میں امی کے پاس برتن اٹھانے کے لیے گئی
تو امی نے بتایا کہ پھوپھو اپنے بیٹے یا سر کی شادی کے لیے
سوچ رہی ہیں، میں نے امی سے پوچھا پھر آپ نے
مشورہ دیا۔ امی یا سر کی تعریفیں کرتے ہوئے بولیں۔

”بہت ہی اچھا بیٹا ہے۔ میرے خیال میں اس
کے لیے اُس کے تایا کی بیٹی بہت مناسب رہے گی،
میں نے تو تمہاری پھوپھو کو تجویز پیش کر دی، باقی جیسے
اُن کی مرضی۔“

ہے جو اعتبار اور اخلاق کے سامنے تلے پیدا ہوتا ہے
 ویسے بھی محبت تو اُس احساس کا نام ہے جو یہ یقین
 دلاتا رہتا ہے کہ اس خود غرض دنیا میں ایک فرد واحد
 ہے جو میرے لیے پوری دنیا کے ساتھ لڑ سکتا ہے۔ یعنی
 کہ اب میں یا سر سے اپنی محبت کا اظہار کروں اور پھر
 وہ اپنی امی کو ہمارے گھر بھیجے اور ساتھ ہی اس خیال نے
 بھی ذہن میں جنم لیا کہ اگر وہ بھی میری طرح اندر سے
 کمزور نکلا تو آخر میں لیا کروں گی میرے پاؤں میں تو
 زمانے کی بیٹری ہے سو دل میں یہ خواہش دہائی کہ کہیں
 یہ نہ ہو کہ میں یا سر سے اپنی محبت کا اظہار کر کے اپنا پیغام
 کھو بیٹھوں۔ میں گہری سوچ میں گم اپنے ہمسایے بھی
 اور پتا نہیں کب نیند کی وادیوں میں کھوئی۔

صبح دہی میں بھی اور وہی معمول کے کام، لیکن
 سوچ میں آج کچھ اضطراب زیادہ تھا بس یہی سوچ
 رہی تھی کہ میں نے اپنی محبت کا دفاع کیسے کرتا ہے
 بہت غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ کڑوا گھونٹ تو پینا ہی

اظہار بھی نہیں کر سکتی یہ معاشرے اور دین میں اتنا
 تضاد کیوں ہے؟ جس چیز کی دین اجازت دینا ہے
 معاشرہ اس کو غلط کیوں کہتا ہے؟
 میں خود امی کو کہہ دوں کہ مجھے یا سر پسند ہے؟ نہیں
 میں ایسا نہیں کر سکتی یہ بہت غلط بات ہوگی ویسے بھی
 میں اپنے اندر ہمت و جرأت ہاں سے لاؤنگی جو امی
 کی تربیت کا مقابلہ کرے۔

ایک طرف یا سر تھا جو مجھے پسند کرتا تھا اور دوسری
 طرف میری اپنی ذات کا سوال تھا کہ میں بھی تو یا سر کو
 پسند کرتی ہوں، اگرچہ آج تو ہم دونوں نے ایک
 دوسرے سے اس چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن
 ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر چل کر بات ضرور
 کر لیتے تھے کہ جس سے صاف، صاف ظاہر ہوتا تھا کہ
 ہم دونوں کے دلوں میں کچھ ہے اور یقیناً یہ بہت غلط
 بھی ہوتا اگر محبت کا اظہار کیا، اتنا کیونکہ وہ محبت، محبت
 ہی نہیں جو اظہار کی طلب گار، وہ محبت وہ پاک جذبہ



سے داخل ہوتے ہی آداب کہا تھا۔

خالہ نے ہمیں برآمدے میں بڑی محبت کے ساتھ خوش آمدید کہا تھا، انہوں نے ہمارے سر پر ہاتھ ہی نہیں پھیرا تھا بلکہ ہم دونوں بہنوں کے ماتھے بھی چومے تھے۔ خالہ کے گھر میں لی وی تھا، میری چھوٹی بہن جاتے ہی لی وی کے سامنے جا بیٹھی تھی۔

میں نے رسماً حال احوال کے بعد خاموشی اختیار کی تھی۔ سوچا تھا خالہ پوچھیں گی کیا مسئلہ ہے آج تم کچھ پریشان ہی لگ رہی ہو۔ تو میں سارا غبار باہر نکال دوں گی لیکن شاید خالہ نسرین نے میرے چہرے پر کوئی پریشانی محسوس ہی نہیں کی تھی۔ اور میں مایوس واپس لوٹ آئی تھی مگر میں ہمت ہارنے والی تو تھی نہیں، لہذا ایک دو دن ٹھہر کر پھر خالہ کے گھر جانے کا سوچا تھا، اور ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر خالہ نے میری پریشانی کا سبب نہ بھی پوچھا تو میں خود ہی بتا دوں گی۔

معمول کے سب کام جو میرے حصے میں آتے تھے نمٹا کے امی سے اجازت لی تھی۔ امی نے اس مرتبہ پھر چھوٹی کو میرے ساتھ بھیج دیا تھا، مگر ہائے افسوس خالہ نسرین کے گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں مایوس گھر واپس لوٹ آئی تھی اور سوچا تھا مجھے اب کوئی اور ہستی تلاش کرنی چاہیے۔ جو میرے مسئلے کو حل کر سکے لیکن پہلے ہی خالہ نسرین بڑے غور و فکر کے بعد ذہن میں آئی تھیں، اب اور کون ایسا ہودماغ کے گھوڑوں کو بہت دور تک بھگا یا، لیکن ہٹ ہٹا کر خالہ نسرین سے زیادہ مناسب اور کوئی نظر ہی نہ آیا۔

بس پھر صبر کا دامن تھامے رکھا اور تیسری مرتبہ خالہ نسرین کے گھر جانے کا سوچا، جلدی جلدی اپنے اور چھوٹی کے حصے کے کام نمٹا کے امی سے اجازت مانگی تو امی نے کہا تھا۔

”خیر تو ہے آج کل آپا نسرین پر بہت پیار آ رہا ہے، اُن کے گھر زیادہ مت جایا کرو ایسے اچھا نہیں لگتا کہیں وہ براندہ مان جائیں۔“

میں نے امی کو مناتا ہوئے کہا۔

”خالہ نسرین تو ہمیں ہماری سگی خالوں سے بھی

پڑے گا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، اب تو بس نظریں اس فرد واحد کی تلاش میں نہیں۔ جو میری ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے لگا دے اگرچہ ہم بہنوں میں بہت پیار اور بے تکلفی تھی لیکن میں اُن کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرتی یہ نہیں ہو سکتا تھا پیار اور بے تکلفی اپنی جگہ اور حیا کے تقاضے اپنی جگہ کہیں میری وجہ سے ان کے ذہن میں غلط سوچیں نہ جنم لینا شروع ہو جائیں۔

دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ کوئی میسا آئے اور میری بیٹری پارلگ جائے پر افسوس یہ میسا والا کردار تو صرف کہانیوں میں ہی ہوتا ہے، بھلا تحقیقی زندگی میں ایسا کہاں ہوتا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ خالہ نسرین کے ساتھ بات کی جائے۔

خالہ نسرین ہمارے محلے میں رہتی ہیں بڑی ہمدرد اور نیک خاتون ہیں، خداوند کریم نے انہیں ہر نعمت سے نوازا ہے سوائے اولاد کے اُن کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہمارا وہ بہت خیال رکھتی ہیں ممکن ہے اگر اُن کی اپنی بھی اولاد ہوتی تو وہ انہیں اتنا پیار نہ دیتیں جتنا ہمیں دیتی ہیں، خالہ نسرین کے ساتھ ہمارا صرف انسانیت کا رشتہ تھا لیکن پھر بھی بہت مضبوط تھا اگرچہ خالہ نسرین کے ساتھ میری زیادہ بے تکلفی نہ تھی لیکن یہ امید ضرور تھی کہ خالہ نسرین میرا مسئلہ بہت اچھی طرح سمجھ جائیں گی، ویسے بھی خالہ نسرین کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا، بس میں نے اب دل میں ٹھان لی تھی کہ خالہ نسرین کو اپنا سارا مسئلہ بتانا ہے، اور ساتھ ہی کہنا ہے کہ خالہ میرا نام نہ آئے بس آپ امی کو کہیں کہ یا سر کے ساتھ میرا رشتہ کر دیں۔“

معمول کے تمام کام نمٹا کے میں نے امی سے پوچھا۔

”کیا آج میں خالہ نسرین کے گھر چلی جاؤں۔ دو تین دن ہو گئے ہیں خالہ ہمارے گھر نہیں آئیں۔“

امی نے اجازت تو دے دی لیکن مجھ سے چھوٹی کو میرے ساتھ بھیج دیا، خالہ نسرین بڑی باذوق خاتون تھیں، اپنے فارغ اوقات میں کوئی نا کوئی کتاب اُن کے ہاتھ میں ہوتی، ہمارے گھر سے چار گھر چھوڑ کر بڑے سے گیٹ والا گھر خالہ نسرین کا تھا، دروازے

غزل

روشنی کا استعارہ کر لیا

دل نے ہر آنسو ستارا کر لیا

بے وفا دنیا سے کچھ تو نبھ گئی

ساتھ کیا تھا بس گزارا کر لیا

گلستاں اُس نے کیا تھا آگ کو

ہم نے شبنم کو شرارہ کر لیا

کم نہیں ہم بھی شہود و عباد سے

کیوں لحاظ آخر ہمارا کر لیا

تیری وحدت سے کچھ پائے تجھے

اور کثرت میں نظارہ کر لیا

کون ہے پھر اب مرے دکھ کا سبب

خواہشوں سے تو کنارا کر لیا

آج حیدر موڈ ہی کچھ اور تھا

سو غزل میں استعارہ کر لیا

حیدر قریشی (جرمنی)

زیادہ بیمار کرتی ہیں۔ بھلا انہوں نے کیا پرماننا دیے
بھی بچھلی مرتبہ جب میں خالہ کے گھر گئی تھی تو وہ گھر پر
نہیں تھیں اب کے بار مجھے جانے دیں۔“ امی نے کہا۔

”اچھا چلی جاؤ، میرا سلام بھی کہنا اور پوچھنا کافی
دن ہو گئے آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آئیں۔“ میں
نے چھوٹی کو ساتھ لیا اور خالہ نسرین کے گھر پہنچ گئی

خالہ وہی اپنے ذوق کے عین مطابق کسی کتاب کے
مطالعے میں مصروف تھیں، چھوٹی جاتے ہی ٹی وی پر
نوٹ بڑی بھی اور میں خالہ کے پاس بیٹھ گئی، پھر

بہت کوشش کی مگر لیکن اندر دے الفاظ اور جذبے باہر
آ ہی نہیں رہے تھے۔ کچھ کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے اندر
وہ ہمت کہاں سے لاؤں جو میری ذہنی کشش کو کنارے

پر لے آئے خیر پاس پڑے فریق میں سے پانی کی
پوٹل نکالی اور ایک ہی سانس میں آدھی سے زیادہ پی
گئی، پھر خالہ کے قریب ہو کر بیٹھ گئی اور آہستہ سے

بولی۔

”خالہ وہ میں پہلے بھی آپ کے گھر آئی تھی پر
آپ گھر پر نہیں تھیں۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور
بولتی خالہ نسرین بولی تھیں۔

”تمہارے اکل آتے ہیں تو اُن سے کہتی ہوں
مجھے ایک اور ٹی وی لادیں۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرانے
لگیں۔

میں نے بے تکلفی سے پوچھا۔

”خالہ نیانی وی کیوں؟ تو خالہ میرے سر پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے بولی تھیں۔

”اپنی بیٹی کے لیے..... بھی تم لوگوں کو بار بار
چکر لگانے پڑتے ہیں اور مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں
لگتی۔“

”ہائے افسوس! خالہ کیا سمجھ رہی ہیں اور مسئلہ کیا
ہے؟“ فوراً ہی خیال آیا کہ میرے پاس اب صرف
ایک ہی چانس ہے اور اسے گوانا نہیں ہے۔ میں نے
اور التجا آمیز لہجے میں کہا۔

”خالہ! ٹی وی کا مسئلہ نہیں ہے، دراصل میں نے
آپ کے ساتھ ایک ضروری بات کرنی ہے۔“
خالہ نے میری بات سن کر فوراً کتاب بند کر دی

”آپ آپ ذرا سوچو کہ میری نند کے منہ پر یہ بات سبھی ہے کہ وہ مجھے کہے کہ میں پاس کے لیے لڑکی تلاش کروں کیا اُس کو خود اپنے بھائی کی جوان اولاد نظر نہیں آتی ویسے کس ماں کا دل نہیں چاہتا کہ اُس کی بچیاں عیش کریں تو چلو اگر میں خود کہہ بھی دوں کہ وہ ہمارے ساتھ رشتہ کر لے اور وہ نہ کرے تو اس میں میری ناک کتنی ہے۔ وہ تو ہمیں ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے ہی نہیں دیتی۔ یہ تو اپنی تو قیر خود ہی کم کرنے والی بات ہے آپ مجھے بتا ہے کہ پاس میرے گھر کو پسند کرتا ہے بہت ہی پیارا اور باادب بچہ ہے لیکن میں تو ان کے معیار کا اپنی بچی کو جینے ہی نہیں دے سکتی باقی معاملات تو دور کی بات ہیں۔“ اسی نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے مجھے آواز دی تھی۔

”فصرت جلدی چائے لاؤ۔“ وہ چائے جو میں نے اپنے بیٹے آنسوؤں کے دوران تیار ہی تھی اب پیش کرنے کے لیے تیار تھی اور ساتھ ہی میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ملاں تو ماں ہوتی ہے اپنی اولاد کو بہت اچھی طرح سے سمجھتی ہے میرا یہ خیال غلط ثابت ہو چکا تھا کہ امی کو میری اور پاس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ماں تو سب جانتی ہے۔

☆.....☆.....☆

میں نے اُس روز پھر وہی سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جو اب سے پہلے چار شادیوں میں پہن چکی تھی اُس روز پاس کی شادی تھی وہ میرے سامنے اسٹیج پر اپنی دلہن کے ساتھ دلہا بنا بیٹھا تھا اور میں سب سے آخر والی کرسی پر بیٹھی کولڈ ڈرنک پی رہی تھی ایک کر کے کبھی رشتہ دار اسٹیج پر جا رہے تھے جبکہ امی تو پاس کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں اور اسٹیج سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ..... زبردستی ہنسنے سے چیزے ہی نہیں دل بھی دکھتا ہے۔ وہ ادھر بیٹھے جا رہی تھیں اور ادھر میں دل ہی دل میں امی کو داد دیے جا رہی تھی کہ امی آفرین ہے آپ پر آپ کی ہمت پر مجھ میں تو اتنا حوصلہ نہیں کہ میں پاس کو دلہا کے لباس میں آنکھ بھر کر بھی دیکھ سکوں۔

☆☆.....☆☆

اور مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے میری پیشانی چومی اور کہا۔

”میری بچی کیوں پریشان ہے۔“ یہ وہ لہجہ تھا جس میں اپنائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی بس پھر کیا تھا۔ میں نے اپنے دل کا سارا غبار نکال کر باہر پھینک دیا۔

”خالہ وہ میں پاس کو پسند کرتی ہوں اور وہ مجھے پسند کرتا ہے، پھوپھو آئی تھیں ہمارے گھر امی سے کہہ رہی تھیں کہ پاس کے لیے لڑکی تلاش کرنی ہے۔ تو امی نے کہا کہ آپ پاس کی شادی اُس کے تایا کی بیٹی کے ساتھ کر دیں خالہ آپ امی کو راضی کر دو کہ وہ پاس کا رشتہ میرے ساتھ کر دیں۔“

خالہ نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا پاس تم سے کہا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے؟“ میں نے امی میں سر ہلایا تو خالہ نے سوال کیا۔

”کبھی تم نے اُسے بتایا ہے کہ تم اس کو پسند کرتی ہو؟“ میں نے دوبارہ امی میں سر ہلایا تو خالہ نسرین نے مجھے سمجھایا۔

”بڑے جو فیصلہ کرتے ہیں مناسب کرتے ہیں۔“ مگر میں نے خالہ کو بہت مجبور کیا کہ وہ امی کے ساتھ بات کریں بالآخر خالہ مان گئیں اور اسی روز شام کو وہ ہمارے گھر آئی تھیں۔

صبح میں امی اور خالہ نسرین باتیں کر رہی تھیں میں کچن میں چائے بنانے آگئی پہلے تو امی نے خالہ نسرین کے ساتھ بہت کلمے شکوے کیے پھر خود ہی پاس کی بات کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”آپا چار پانچ دن پہلے میری نند آئی تو کہنے لگی۔ پاس کی اب شادی کرنی ہے کوئی لڑکی تلاش کرو میں نے سوچا کیوں نہ آپ سے کہہ دوں آپ کا تو کافی گھروں میں آتا جاتا ہے۔“ خالہ نسرین سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو تم اپنی بیٹی انہیں کیوں نہیں دے دیتیں ضرور غیروں کی ہی دلوانی ہے۔“ اس دوران کچن کی کھڑکی میں کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ امی نے ٹھنڈا سا نس لیتے ہوئے کہا تھا۔

گرچی سے دوری جتنی جائی کہانی

داغِ مقدر

داغِ کاغذ

جو گزرے ہیں	داغ پر	صدے
آپ بندہ	نواز کیا	جانیں

سید محمد ابوالآزاد

پڑھانے کے لیے جاتے۔ وہاں سے نوبے صبح اپنے اسکول میں فرائض پڑھی ادا کرتے۔ اسکول کے بعد مشکل سے کھٹے ڈیڑھ گھنٹے اپنے اہل خانہ کے ساتھ گزارتے۔ اس کے بعد ان کے ایک مخصوص کمرے میں ان کے مختلف کلاس کے طالب علم ٹیوشن پڑھنے آتے۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ رات دس بجے تک جاری رہتا۔ ماسٹر صاحب کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت رہی۔ اتنی محنت کے باوجود کئی مرتبہ بچوں کے حصول علم میں مالی پریشانی آئی۔ اُن کا بڑا بیٹا ندیم جب میڈیکل کر رہا تھا تو عین موقع پر اُس کی فیس کی ادائیگی میں ماسٹر صاحب کو بہت دشواری پیش آئی۔ دوست احباب ہونے کے باوجود جب مسئلہ حل نہیں ہوا تو مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق سئلے کو حل کرنے کے لیے اپنی چھوٹی سی زمین گروی رکھنی پڑی۔ اس طرح ان کا تیسرا بیٹا ایاز انجینئرنگ تھرڈ ایئر کر رہا تھا۔ اس کی فیس کا مسئلہ آن پڑا۔ بے حد اٹھک کوشش کے باوجود ہاتھوں میں کچھ نہ آیا تو تعلیم سرفراز کے زیورات بیچ کر ضرورت پوری کی گئی۔ بیٹیوں کی بھی تعلیم جاری تھی۔ بڑی بیٹی سلیقہ ماسٹر صاحب کے منج کرنے کے باوجود چھوٹی موٹی ٹیوشن کر رہی تھی۔ اس کے ایم بی

سرفراز احمد ایک گاؤں کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ ماسٹر صاحب نیک دل، ایماندار اور سادہ زندگی گزارنے کے حامل انسان تھے۔ اپنی حلال کمائی سے اپنی اولاد کو علم کی دولت سے مالا مال کیا اور تربیت بھی اچھی دی۔ ہر شخص اُن کی شرافت اور انسانیت کا قائل تھا۔ اس مہنگائی کے دور میں ماسٹری کی قلیل آمدنی میں اتنے کثیر نفس کی پرورش ناممکن تھی اور وہ بھی تعلیم یافتہ گھرانہ، لباس، خوراک اور اُن کی پڑھائی کے اخراجات کا سوچ کر ہی سرچکرا جاتے ہیں۔ ماسٹر صاحب نے اپنی اولاد کو معاشرے کا کامیاب انسان بنانے کے لیے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ انہوں نے کسی کام کرنے میں بھی عار نہ محسوس کیا۔ جہاں دو پیسے ملے اس کو بخوشی کیا۔

ماسٹر صاحب کے پاس Hercules نام کی ایک سائیکل ان کے طالب علمی کے دور کی تھی۔ اُس دور میں یہ اُن کے ٹیوشن کرنے میں مددگار تھی اور اب ان کی سِل کو پروان چڑھانے میں مددگار ہے۔ اس سائیکل پر کوسوں ڈورسٹرکٹ اینڈ سیشن بیج کے بچوں کو صبح ساڑھے سات سے ساڑھے آٹھ بجے تک

فارماسیونیکل کمپنی میں بحیثیت انجینئر لگا ہوا تھا۔ بیٹے اور بیٹیوں کے اچھے رشتے بھی آ رہے تھے۔ قدرت ان کو بہو اور داماد جیسے رشتے سے بزرگی کی بلندی پر پہنچانا چاہتی تھی۔ بالآخر وہ دن آ ہی گیا کہ ماسٹر صاحب نے اپنے بیٹے ندیم کو کسی پوش علاقے میں اچھا سا مکان رہائش کے لیے ڈھونڈنے کے لیے کہہ دیا۔ وہ اب پرانے مکان کو چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہ سن کر گھر والے فرط حیرت میں ڈوب گئے کہ ان کے پاپا کیسے دوسرے مکان میں جانے کے لیے تیار ہوئے۔ لاہور میں کئی پوش علاقے ہیں، ندیم کو ماڈل ٹاؤن پسند آیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد سات سو گز پر کرائے پر ایک کوچھی مل گئی۔ یہ ویسٹ اوپن ڈھیل اسٹوری کوچھی تھی۔ ہفتہ دس دن میں ریمنٹ ایگریمنٹ ندیم کے نام ہو گیا۔ کوچھی دیکھنے کے لیے ندیم کے والدین اور بہنیں گئیں۔ کوچھی کیا تھی ایک محل معلوم ہو رہا تھا۔ ایک بڑا سالانہ سبزہ آگاہا جس پر رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے، اُس کے درمیان میں

اے کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی، مٹھلی بیٹی رافہ نے ماسٹر ان اسٹیبل ایجوکیشن کیا۔ اللہ نے ماسٹر صاحب کو محنت کا خوب ثمر دیا۔ پانچوں بیٹے اور بیٹیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔

ماسٹر صاحب جہاں اور بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے وہاں ان کو جنم بھومی اپنے پرانے سے آبائی گھر سے بہت گہرا لگاؤ تھا۔ حقیقت میں خوشحالی و ترقی انتہائی تھی کہ وہ کسی پوش علاقے میں منتقل ہو جائیں مگر وہ کسی حال میں وہاں سے بس سے مس ہونے کو تیار نہ تھے۔ ان کا اپنے گھر سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ ان ہی پر یہ محاورہ صادق آتا ہے۔ ”زمین جینہ نہ جینہ گل محمد“۔

قدرت نے کو ہر طرف سے حالات کو ان کے لیے موافق کر دیا تھا کہ وہ اپنے پرانے مکان سے کسی نئے مکان میں منتقل ہو جائیں۔ ان کے پانچوں بیٹے برس روزگار ہو چکے تھے۔ ان کا بیٹا ندیم ایک



روم میں بٹھایا اور بیگ پر اچھے سے ان کی بیٹی کا رشتہ اپنے بیٹے ندیم کے لیے مانگا۔ بیگم پر اچھے نے مسکراتے ہوئے رشتے کو قبول کیا۔ اور دونوں طرف سے ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کی گئی۔ پر اچھے صاحب نے اپنی بیگم کے مشورہ کے بعد سرفراز صاحب سے شادی کی تاریخ مانگی۔ تاریخ کے تعیین کے لیے سرفراز صاحب نے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی۔ ایک ہفتہ کے بعد دونوں فریق نے متفقہ طور پر تاریخ مقرر کر دی۔ شادی کی تیاری دونوں طرف زور سے شروع ہو گئی۔ وقت مقرر پر ندیم کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ کوٹھی پر رنگ برنگے فٹھے سے سجائے گئے تھے۔ ان کی بیٹیاں اپنی ہونے والی بھائی اور دیگر خواتین مہمان کا خیر مقدم کیا۔ ان میں فائزہ بہت پر جوش آ رہی تھیں۔ وہ دن سرفراز صاحب کو پہلی بھودے کران کی بزرگی کو دہرایا کرتا تھا۔ واقعی اللہ ان کی محنت مستحق کا ثمر دے رہا تھا۔

سرفراز صاحب کی بہو کیسی ہے اس کے حسن کی بازگشت ہر چہار طرف سنی جا رہی تھی۔ اس کے حسن کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ واقعی وہ حسن کی پیکر ہے۔ جوں جوں عزیز واقارب (جو شادی میں شریک نہ ہو سکے تھے) کو اس کے حسن کی خبر ملتی گئی وہ ایک بار اسے دیکھنے ضرور آئے۔ اس کے حسن کی بازگشت ایک عرصہ تک سرفراز صاحب کے خاندان میں سنی جاتی رہی۔

سرفراز صاحب و بیگم سرفراز کے شب و روز بدل گئے تھے۔ ان کی ساری اولاد ڈیٹے اور بیٹیاں سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ سال ڈیڑھ سال کے اندر وہ سارے بیٹے پور بیٹیوں کی شادی سے فارغ ہو چکے تھے۔ انسان کی فطرت ہے وہ اپنی ٹٹی یعنی جہاں وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی سوندھی خوشبو سنی نہیں بھولتا۔ سرفراز صاحب کا گھر جہاں وہ پیدا ہوا ہے اور Hercules سائیکل کی سواری جو ذریعہ معاش تھی بھلائی نہیں جا سکی۔ جبکہ اب آرام و آسائش کی زندگی تھی، محل نما کوٹھی میں رہائش پذیر تھے۔ بیٹے بیٹیوں کی شادی کی ذمہ داری سے فارغ تھے۔ مگر یہ اپنے پرانے مکان کو

نوارہ جو پانی کی موٹی دھار کو چھوٹے چھوٹے قطروں کی صورت میں اوپر اچھال رہا تھا۔ بڑا خوبصورت منظر تھا۔ نظر کو خیرہ کر رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کی زندگی بہت خوشگوار اور سکون سے گزرنے لگی۔ سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں دو بیٹیوں اور بیٹوں کی شادی کے رشتے آئے۔ پانچویں بیٹے برسر روزگار، نیک اور فرمانبردار تھے۔ ایک دو بچوں کی شادی کے لیے ماسٹر صاحب کے پاس رقم پسماندہ تھی۔

آپس میں مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ بڑی بیٹی سلیقہ اور ندیم کی شادی کر دی جائے۔ رشتے کرانے والی ایک بڑی بی بی بیگم سرفراز کے پاس اکثر آتی تھیں۔ ان کے توسط سے دونوں بیٹے اور بیٹی کے لیے رشتے مل گئے۔ مذکورہ رشتوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے دونوں فیملی نے ایک دوسرے کو بھیننے کے لیے سلسلہ جنماتی شروع کر دی۔ ماسٹر صاحب کی بیگم کے ہمراہ ان کی بیٹیاں فائزہ وغیرہ اپنے ہمیا ندیم کے لیے لڑکی دیکھنے گئیں۔ بیگم پر اچھے اور اہل خانہ نے آنے والے مہمانوں کا استقبال کیا اور ایک دوسرے سے معاہدہ کے بعد بیگم پر اچھے اپنے مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ انہوں نے بیگم سرفراز سے رشتے کے موضوع پر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی اثنا میں لڑکی انگریزی رنگ کے سوٹ میں مہمانوں کو سلام آئی۔ کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلی گئی لڑکی کیسی حسن لی پیکر حسیناؤں میں حسینہ نظر آ رہی تھی۔ بیگم سرفراز اس کے حسن و جمال کو دیکھتی رہ گئیں۔ فائزہ سے پرہانہ گیا تو وہ سارے ادب و محفل کو چھوڑ کر ہونے والی دلہن کے پیچھے لپکتے ہوئے کمرے میں چلی گئیں۔ وہاں اُس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنی رہی وہیں بستر پر تصویروں کے اہم رکھے ہوئے دیکھے تو وہ نظر بچا کر اس میں سے دلہن کی تصویر نکال لی۔

بیگم سرفراز اور ان کی بچیوں کو پر اچھے صاحب کی بچی ندیم کے لیے پسند آئی۔ چند دنوں کے بعد پر اچھے صاحب ہمراہ بیگم سرفراز سے ملنے آئے۔ اتفاق سے ندیم گھر پر تھے۔ دونوں باپ بیٹے نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور بیگم سرفراز نے اپنے مہمانوں کو ڈرائنگ

ماسٹر صاحب کی دعوتیں ایک عرصہ تک چلتی رہیں،
بالآخر یہ عمل نہیں نہ کہیں تو رکنا تھا۔

صاحب علم ماسٹر سرفراز احمد صاحب کے ارد گرد علم
کے پیاسے پھر سے جمع ہوتے گئے اور علم کی روشنی جو
کچھ عرصے کے لیے معدوم ہو گئی تھیں وہ پھر سے آب
و تاب کے ساتھ ماحول کو روشن کرنے لگی۔ اُن کا
خاص کمرہ جو کتب کی حیثیت رکھتا تھا وہ پھر طالب
علموں سے آباد ہو گیا۔

اپنے گھر میں آ کر ماسٹر سرفراز کا دل اور روح
اب مطمئن ہو گئی ہے۔ ان کا گھر تو دیہات کا گھر ہے،
مگر یہاں کے ماحول میں والدین کا احترام موجود
ہے۔ جبکہ محل نما گھر بزرگوں کے احترام سے خالی
ہے۔ گو خوشنما گھر میں وہ مشعل ہو گئے تھے مگر وہ ہر وقت
اپنی جنم بھوی کو یاد کرتے رہتے تھے۔ اُس نئے گھر میں ان
کی بزرگی کو بری طرح بھجورج کیا گیا تھا۔ ان کے تصور
میں بھی نہیں تھا کہ ان کی اولاد ایک دن شفقت و محبت کا
صلہ نافرمانی سے دے گی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

”جس گھر میں بزرگوں کی عزت نہیں ہوتی اس
گھر کے لوگ تتر بتر ہو جاتے ہیں۔“

حال کو کامیاب بنانے کے لیے ماضی سے
رہنمائی حاصل کرنا دانشمندی کا شعار ہے۔ ماضی
زندگی کو وہ راہ دکھاتا ہے جو ہر قسم کے خطرے سے
پاک ہو، لیکن ماضی کے بغض پہلوا ستنے رخ اور تکلیف
دہ ہوتے ہیں کہ اچھی سے اچھی قوت برداشت رکھنے
والے اسے یاد کرنے سے اجتناب کرتے ہیں جبکہ
ماسٹر سرفراز احمد کا ماضی بہت شاندار اور تابناک ہے۔
انہوں نے محنت و شفقت سے پانچ بیٹے اور چار بیٹیوں
کو اعلیٰ تعلیم دلانی مگر اس پہلو سے بہت تکلیف دہ اور
دردناک ہے کہ اس کا شمر اُن کو کیا ملا۔ ان کی بزرگی کی
تذلیل کی گئی اور بالآخر وہ اپنے نخت جگر اولادوں
سے دور ہو گئے۔ اس حوالے سے شاعر نے کیا خوب
کہا ہے۔

دل کے پھوپھوے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی اس گھر کے چراغ سے

☆☆.....☆☆

یاد کر کے کبیدہ خاطر تھے۔

کچھ دنوں سے نہ جانے کیوں بڑی بہو اپنی ساس
سے کچھ چھٹی چھٹی سی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اس کا احساس
سرفراز صاحب کو بھی ہوا۔ حالانکہ بیگم سرفراز جوڑنا
جاتی تھیں توڑنا ان کو نہیں آتا تھا۔ وہ کام جو گھر کی
مافی کرتی تھی اس کے ہونے نہ ہونے کی ذمہ داری
اب بہو نے ساس کے سر تھوپ دی تھی۔ کہتے ہیں
تربوز کا رنگ دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ آہستہ
آہستہ دیگر بہوئیں بھی گھر کے کام کاج کی ذمہ داری
ساس کے سر تھوپتی چلی گئیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر
تکرار شروع ہو گئی۔ گھر میں مٹن بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ
کام جو گھر کا ملازم کرتا تھا یعنی بازار سے سودا سلف
لانا اب سرفراز صاحب کی ذمہ داریوں میں دے دی
گئی۔ حالات کے جبر سے پہلے ہی وہ کبیدہ خاطر
تھے۔ اب وہ دو آتشہ ہو کر اپنے دل و دماغ کو مفلوج
کر رہے تھے۔

جن ناگفتہ بہ حالات سے سرفراز صاحب گزر
رہے تھے اب بیٹے بہوؤں کے ساتھ رہنا بہت مشکل
تھا تو پھر وہ کیا کرتے۔ اپنے گھر واپس ہو جاتے تو پھر
احباب کے تعین نقشہ کا ڈر تھا۔ وہ شاگرد جنہوں نے ان
سے والدین کے ساتھ صلہ رحمی فرما کر بزرگی اور محبت کا
درس حاصل کیا ہے اُن کی ہمیشہ کے لیے گھر واپسی
جان کر ان کی اولاد کی نافرمانی کا گمان ہوگا۔ ان
ساری باتوں نے انہیں گفتگو میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ مگر
مرتا کی مانند کرتا کے مصداق انہوں نے اپنے گھر واپس
جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اسے بیٹے کو اپنے گھر لوٹ
جانے کے متعلق بذریعہ رقم مطلع کر دیا جب اُن کی
رواگی ہونے لگی تو صرف چھوٹی بہو گھنار نے جانے
سے روکا۔ جب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

☆☆.....☆☆

ماسٹر سرفراز احمد جب اپنے آبائی گھر پہنچے تو سارا
گاؤں ان سے ملنے آیا۔ جوں جوں اُن کی آمد کی خبر
ملتی گئی لوگ آتے رہے ان کی ہر ہمزبیری اور
انسانیت نوازی کا یہ عالم تھا کہ گاؤں کا ہر فرد اپنے لیے
اعزاز بکھ رہا تھا کہ آپ اس کی دعوت قبول فرمائیں۔

ذریعہ اسٹائل خان سے تیسری جینی جاگتی کہانی

سینگھوں

انٹرویو کا عنوان

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

سید عبادت کاظمی

دیکھنا چاہتی تھی۔ مجھے کپڑوں سے لے کر جیولری، جوتے، گھر کی گھڑکیاں، دروازے غرض ہر چیز نیلے رنگ کی چاہیے ہوتی تھی۔ میرے ابا جی میری نیلی رنگ سے بے تحاشہ رغبت دیکھ کر مجھے نیلی پکارنے لگے تھے اور پھر ان کی دیکھا دیکھی سب ہی مجھے نیلی کہنے لگے تھے اور میرا اصل نام ایمانے زارہ شاہ کہیں کھو گیا تھا۔

ہر انسان کے کئی شوق ہوتے ہیں اور یہ شوق اکثر جنون کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ مجھے نیلا رنگ بچپن سے پسند تھا۔ وادی کہتی تھیں جب میری پیدائش ہوئی تو میرا وجود نیلے رنگ کا ہو رہا تھا اور جب ہوش سنسلا تو مجھے نیلے رنگ میں بے پناہ کشش محسوس ہونے لگی تھی۔ شعوری طور پر میں اپنے ارد گرد نیلا رنگ ہی



وسط میں رکھے ڈربے کا دروازہ کھولا تھا۔ ننھے ننھے چوڑے جن پر میں نے پینٹ سے نیلا رنگ کیا ہوا تھا اور مرغی نے جس کی شکل میرے نیلا رنگ لگانے سے بگڑ کر عجیب سی ہو گئی تھی۔

صحن میں دوڑ لگا دی تھی۔ ذرا ہی دیر میں بارش تیز ہو گئی تھی اور میری مرغی اور چوڑے بارش میں نہا کر اصلی رنگ دروب میں آگئے تھے۔ اور میں دھوپ نکلنے کا انتظار کرنے لگی تھی کہ مرغی اور چوڑے سو گھیں تو میں انہیں دوبارہ نیلا رنگ کر دوں.....

ہوسکتا ہے آپ قادرین! اب تک میری نیلے رنگ کی جنونیت سے بے زار ہو چکے ہوں میری دادی تو میری اس پسند سے بہت بیزار تھیں۔ اور مجھے اکثر ٹوکا کرتی تھیں۔ ایک صبح میری دادی اچانک مر گئی تھیں۔ وہ سوتی کی سوتی رہ گئیں تھیں۔ میں بہت روئی تھی کہ اب مجھے کون نیلے رنگ پرٹوکے گا۔ تب مجھے احساس ہوا تھا کہ انسان نیلے رنگ سے زیادہ اہم ہیں۔ وقت ہرزخم کا مرتب ہے، بڑے سے بڑے صدمے کو بھلا دیتا ہے۔

جمہرات والے دن میں بیٹھا بنا کر محلے کے بچوں میں تقسیم کرتی تھی۔ اُس جمہرات بھی میں معمول کے کاموں میں مصروف تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ میں نے دروازے کے اندر سے پوچھا تھا۔

”کون.....؟“

”جی مجھے حاجی دین بخش صاحب سے ملنا ہے۔“ مقابل کی آواز آئی تھی۔

”لیکن بابا تو گھر پر نہیں ہیں، وہ دکان یا کارخانے میں ہوں گے۔“ میں نے دروازہ کھولے بغیر جواب دیا تھا۔

”جی میں ابھی وہیں سے آ رہا ہوں، وہ وہاں نہیں ہیں، میں سمجھاؤ گھر آگئے ہوں گے، آپ پلیز انہیں میرا یہ کارڈ دیتے گا، مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔“

میں نے کارڈ لینے کے لیے دروازہ کھولا تھا اور میری نظر اس کی نیلی آنکھوں پر پڑی تھی وہ آنکھیں دیکھ کر میری جو کیفیت ہوئی وہ معلوم نہیں میری نیلے رنگ سے محبت تھی یا مقابل کی آنکھوں کی شش ایک لمحے کے لیے تو میں جیسے سب کچھ بھول گئی پھر اچانک خیال آنے

میرے اباجی حاجی دین بخش کا فرنیچر کا کاروبار تھا اور ان کی قریبی موٹر پرکٹی دکانیں کارخانے اور ملازم تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے ہاتھ سے کام کرنا پسند کرتے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ایسی صفائی تھی کہ لوگ حیران رہ جاتے، لوگ اُن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ ہنر ایک بہت بڑی طاقت ہے۔

میرا کوئی بھائی بہن نہیں تھا، کیونکہ میری امی میری پیدائش کے کچھ دن بعد وفات پا گئی تھیں اور میری پرورش میری دادی نے کی تھی۔ ابانج سویرے دکان پر چلے جاتے اور شام کو واپس آتے۔ میں نے میٹرک تک اسکول میں پڑھا، کوئلہ قائم شاہ کے اکلوتے گریڈ ہائی اسکول میں نیلے رنگ سے میرے عشق کے خوب چرچے ہوتے۔ لڑکیاں مجھ پر خوب ہنسیں، میں پورے اسکول کے مذاق اور تنقید کا نشانہ بنتی۔ لیکن جانے کہا بات تھی کہ نیلے رنگ سے میری محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ اسکول کے بعد میں نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ دادی بیمار رہنے لگی تھیں اور گھر کے کام مجھے کرنا پڑتے تھے۔ اسی دوران مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کا چمکا لگا۔ سرورق پراگر ماڈل کے کپڑے نیلے رنگ کے ہوتے یا آنکھیں نیلی ہوتیں تو میں اسے کاٹ کر اپنی ڈائری میں لگا لیتی تھی۔

خیر یہ تو تھی میرے جنون کی کہانی، لیکن محبت مجھے اپنے اباجی سے ہی سے زیادہ تھی۔

☆.....☆.....☆

اُس روز موسم بڑا سہانا سا تھا۔ سفید سفید روٹی کے جیسے بادل نیلے رنگ کے آسمان کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں ٹپ ٹپ کرتی صحن میں گر رہی تھی۔ میں نے ایف ایم ریڈیو آن کر کے گلوبل ایف ایم ریڈیو لگایا ہوا تھا۔ جہاں

R-J مہراں خان امی سریلی آواز میں گارہا تھا
ماہی رورے سکون کر میری چاہت قبول
کر قبول رہے سکون مانے رومانے رو

میں گانے کی آواز مل کر کے ساتھ ساتھ سنگتاتی ہوئی دو پیٹھ کر کے گردس کے فرش سے پانی صاف کرنے لگی ہوئی تھی کہ مجھے خیال آیا تھا کہ آج تو میں چوڑوں کو ڈربے سے نکالنا بھولی گئی ہوں۔ میں نے صحن کے

چار بجے آئی تھی سب تیار یوں میں مصروف تھے۔ ابا اپنی بیٹی کو بڑی شان سے وداع کرنا چاہتے تھے۔ مجھے غلے کی رو بینہ آئی نے تیار کیا تھا کہ اچانک باہر سے چیخ و پکار کی بہت سی آوازیں ابھری تھیں اور ان میں سب سے زیادہ بلند ابا کے رونے کی آواز تھی۔ میرا دل اچانچے خدشے کے تحت لرز اٹھا تھا۔ میں بھاگ کر باہر آئی تھی۔ ابا اپنی پگڑی اتارے محن کے بچوں کو بیٹھے زور زور سے رورہے تھے۔

”ارے نیلے رنگ کی نحوست میری بیٹی کے سہاگ کو کھا گئی۔ بیچارے کو شادی والے دن سانپ نے ڈس لیا۔“
”لوگ بتا رہے ہیں، اُس کا پورا وجود نیلگوں ہو گیا ہے، بہت ہی زہریلا سانپ تھا، ہسپتال لے گئے ہیں بیچارے کو کھر.....“

مجھے جیسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ابا کے پاس آئی تھی تو وہ مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے تھے۔ میں اُلٹے قدموں اٹھ کر بھاگی تھی۔ سڑک پر لوگوں نے حیرت سے نیلوں نکل دہن کو دو پوانہ وار بھاگتے دیکھا تھا۔ جس وقت میں نے اسپتال کے ایمر جنسی وارڈ میں قدم رکھا تھا گو براہِ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے چکا تھا۔ اُس کا وجود نیلا ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں جیسے مجھ پر جمی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔

”دیکھ لو نیلی تمہیں نیلا رنگ پسند تھا نا..... میں نے تمہاری پسند پوری کر دی۔“

میں وہیں شش کھا کر گر پڑی تھی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں گھر اپنے بیڈ پر تھی۔

”زندگی رکتی نہیں، لیکن مجھے لگتا ہے میری زندگی ایک نقطے پر جامد ہو چکی ہے۔ میں اب زیادہ باہر نہیں نکلتی، اکثر کمرے میں ہی بند رہتی ہوں۔ مجھے اب ہر رنگ سے خوف آتا ہے، لیکن نیلے رنگ سے تو دشت ہوتی ہے۔ میں نے اپنی ہر وہ چیز جلا دی، اجاڑ دی جو نیلے رنگ کی تھی۔ میری زندگی سے اب نیلے رنگ کی اہمیت ختم ہو چکی ہے، میری نیلے رنگ والی جنونیت اب ختم ہو گئی ہے، لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ گوہر کی نیلی آنکھیں آج بھی میرے تصور میں مسکراتی ہیں۔

☆☆.....☆☆

پر میں نے جلدی سے کارڈ لے کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ یہ کیسا احساس تھا جس نے میرے رگ رگ میں بے چینی بھری تھی۔ رات کو اباجی گھر آنے تو میں نے انہیں کارڈ دے دیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں نے ابھی تک اُس کارڈ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ابا کو کارڈ دیتے وقت میں نے اُس کے نام پر نظر دوڑائی تھی۔ اُس کا نام گوہر تھا۔

اس رات ابا نے خاصی تشویش سے پوچھا تھا۔
”نیلے بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آج کوئی نیلا قصہ نہیں سنایا۔“

میں ہنس دی تھی لیکن مجھے محسوس ہوا تھا میری ہنسی کھوکھلی ہے۔

پھر گوہر اکثر ہمارے گھر آنے لگا تھا اور میں چوری چوری اسے دیکھا کرتی تھی۔ نہ جانے کب اور کیسے ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ اتنے قریب کہ دل ایک دوسرے کی لے پر دھڑکنے لگے تھے۔ ابا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایئر فورس میں ملازم ہے اور بہن کی شادی کے لیے فرنج پھر ابا سے ہوا رہا تھا۔ میرے دل میں جلتے رنگ بنتے لگے تھے کوئی انوکھی سی لذت کوئی انوکھا سا احساس دل میں چپکلیاں لینے لگا تھا۔

گوہر کی بہن کی شادی میں ہم لوگ بھی گئے اور اُس شادی کے کچھ دن بعد گوہر کے گھر والے ہمارے گھر رشہ لے کر آ گئے تھے۔ انہوں نے ابا سے میرا ہاتھ مانگا تھا اور ابا نے مجھ سے پوچھنے کے بعد ہاں کر دی تھی۔

باضابطہ طور پر رشہ ہو جانے کے بعد گوہر کے ساتھ اکثر میری بات ہو جاتی، وہ بھی نیلے رنگ سے میری جنونیت دیکھ کر حیران ہو جاتا۔

”پلو شکر ہے میری آنکھیں نیلی ہیں، ورنہ میں تمہیں کیسے پسند آتا۔“ وہ شرات سے کہتا۔ میں ہنس دیتی۔

کچھ ماہ بعد ہماری شادی کے دن مقرر ہوئے۔ تیاریاں عروج پر تھی، ہماری کھٹوں فون پر بات ہوتی، میری خواہش کے مطابق عروسی لباس نیلے رنگ کا ہی لیا گیا تھا۔ زیورات میں بھی نیلے رنگ کے سنگینے جڑے ہوئے تھے۔

شادی والے دن میرا دل عجیب دوسوں میں گمراہ ہوا تھا۔ میری آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ بارات

لاہور سے چلتی جاتی کہانی

محبت حل گئی تھی

شبگیر زویٰ کا خیال

محبت	میں	سارا	جہاں	جل	گیا
زمیں	جل	گئی	آساں	جل	گیا

نوٹین آراء

”میرا پاؤں جل گیا ہے آپ لوگوں کو کراہیت ہوگی اس لیے میں نے ایسا کیا ہے۔“ وہ واقعی اپنے نام کی طرح نہیں تھیں۔ بہت اچھے گھرانے سے تعلق تھا، دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اُس نازک سی سانوٹی سلوٹی لڑکی میں نہ جانے کیا بات تھی جو ایک بار اُسے دیکھتا وہ دیکھتا ہی رہ جاتا، بات کرنی تو لگتا منہ سے پھول چھڑ رہے ہوں۔ جی چاہتا کہ وہ باتیں کرتی رہیں اور سننے والا سنتا ہی رہے۔

☆.....☆.....☆

خالد صاحب کے دو بیٹے تھے اُن کی بیوی کی خواہش تھی کہ اس بار بیٹی ہو اللہ نے اُن کی یہ خواہش نفیہ کی صورت پوری کر دی تھی۔ وہ بہت خوش تھیں اب اُن کی پہلی مکمل ہو گئی تھی، گھر میں ہر آسائش تھی تھی تو بیٹی کی۔ وہ بھی پوری ہو گئی تھی۔

دونوں بھائی بھی گڑیا سی بہن نفیہ کی آمد پر بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ اکثر چھوٹی بہن کو چھیڑتے، وہ رونے لگتی تو بڑے لاڈ پیار سے اُسے مناتے، نفیہ جب بڑی ہوئی تو اُس نے بھائیوں کے ساتھ اسکول جانا شروع کیا وہ بڑھائی میں بھی بہت اچھی تھی۔ اُس زمانے میں لوگوں کو قلموں کا بہت شوق تھا۔ ٹی وی

”رضیہ خالہ! آپ سے کافی سال بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ ٹھیک تو ہیں۔“ خالہ مجھ سے جب بھی ملتی بہت تپاک سے ملتی تھیں اور ہم کافی دیر تک ایک دوسرے سے کہیں لگاتے تھے۔ وہ رشتے میں تو خالہ تھیں۔ لیکن ہم سہیلوں کی طرح ملتے تھے۔

خالہ آپ کی ایک بہت پیاری سی دوست تھی نفیہ، وہ کہاں ہیں آج محل اور کبھی ہیں؟“ خالہ میرے منہ سے نفیہ کا ذکر سن کر اُداس ہو گئیں اور بولیں۔

”وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“ یہ سن کر مجھے بھی بہت دکھ ہوا اور پھر خالہ نے اپنی دوست نفیہ کی جو کہانی مجھے سنائی اُس نے مجھے بھی بہت زیادہ دکھی کر دیا تھا۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب ابی اور ہم سب بہن بھائی ثانی کے گئے ہوئے تھے۔ ثانی دو پہر میں ہمارے لیے دسترخوان لگا ہی رہی تھیں کہ خالہ کی دوست نفیہ اچانک ہی آگئی تھیں۔ اور سب نے اصرار کر کے انہیں بھی کھانے میں شریک کر لیا تھا۔

وہ کھانا کھانے بیٹھی تھیں تو اپنا رومال نکال کر اپنے پاؤں کو ڈھانپ لیا تھا۔ رضیہ خالہ نے پوچھا تھا۔ یہ کیا ہوا ہے تو وہ بولی تھیں۔

کروں گی شادی۔“
 نفیسہ کی مٹی چاہتی تھیں کہ اُس کی شادی اپنی ہی
 برادری میں اُسے ہی جیسے کسی اچھے گھرانے میں ہو وہ
 جس برادری سے تعلق رکھتی تھیں وہ بہت امن پسند لڑائی
 جھگڑے اور سیاست وغیرہ سے دور رہنے والی تھی۔
 وہ اپنی بیٹی کو بھی محبت امن پسندی اور خلوص کے
 ساتھ رہنے کا درس دیتی رہتی تھیں۔ مٹی اکثر نفیسہ کو یہ
 سمجھاتی رہیں۔

”بیٹی کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا حقیقت کی دنیا میں
 آؤ اور اپنی ہی برادری میں شادی کے لیے راضی
 ہو جاؤ۔“

نفیسہ کی سمجھ میں یہی بات نہیں آتی تھی۔ وہ اپنی
 خیالی دنیا میں گمن مٹی کی فلموں کی طرح اُس کی پسند کا
 ہیرو آئے گا اور اسے بیاہ کر لے جائے گا۔
 ایک روز وہ اپنی مٹی کے ساتھ شاپنگ کے لیے مٹی
 تھی کہ اُس کی نظر وہاں ہائیک سے ٹیک لگائے
 کھڑے ایک بہت خوبصورت نوجوان پر پڑی تھی۔

وغیرہ تو تھے نہیں لوگ فلموں سے دل بہلایا کرتے
 تھے۔ نفیسہ کو بھی فلموں کا شوق تھا۔ اس کے گھر میں کسی
 چیز کی تو نہیں تھی جب بھی وہ فرمائش کرتی۔
 ”مٹی مجھے فلم دیکھنے جانا ہے۔“ دونوں ماں بیٹی
 فلم دیکھنے چلی جاتیں، سینما مٹی ان کے گھر سے قریب
 ہی تھا۔ نفیسہ کو وحید مراد کی فلمیں دیکھنے کا جنون کی حد
 تک شوق تھا۔ وہ اُس کی فلمیں دیکھ دیکھ کر اپنے آپ
 کو بھی ایک ہیروئن سمجھنے لگی تھی۔ نفیسہ نے بی اے
 کرنے کے بعد بڑھائی چھوڑ دی تھی بھائی اکثر کہتے۔
 ”اب تمہیں کیا کرنا ہے پڑھ کر شادی وادی کرو
 اور اپنے گھر جاؤ۔“ تو وہ ہنر جاتی ماں سے شکایت
 کرتی۔

”مٹی بھائی مجھے گھر سے نکالنے کا سوچ رہے
 ہیں۔“ مٹی اس کی بات سن کر مسکراتی رہیں۔
 نفیسہ نے شادی کے لیے شوہر کے حوالے سے
 اپنا ایک آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ وہ اکثر کہتی۔
 ”جب تک مجھے اپنا آئیڈیل نہیں ملے گا میں نہیں



دیکھا دیکھتے ہی ان کی امی کو شاید یہی شیراز بھائی کی دلہن بن جائے ویسے بھی لگتا ہے شیراز بھائی اسے زیادہ پسند آگئے ہیں جو اس کی بولتی بند ہوگئی ہے۔“
 اُدھر شیراز بھی نفیسہ کو دیکھتے ہی دل ہار گیا تھا نہ جانے اس لڑکی میں کیا بات تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی، کون سی کشش تھی کہ اس کا دل بھی نفیسہ کے لیے چھلنے لگا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ نفیسہ اور شیراز آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب گئے تھے۔ اکثر فون پر محبت بھری باتیں ہوتی رہتیں اکثر ساتھ گھومنے پھرنے بھی جاتے رہتے۔ شیراز نے اپنی امی کو اپنی پسند بتاتی تھی تو وہ لڑکی کو دیکھنے کے لیے راضی ہوگئی تھیں۔ مگر جب دونوں فہمیلیز ایک دوسرے سے ملی تھیں تو دونوں کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی، کیونکہ وہ مختلف ذات برادری کے لوگ تھے۔ وہ دونوں فہمیلیز اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھیں، لیکن دوسری جانب دونوں کے والدین اپنی اپنی اولاد کی محبت کے آگے مجبور بھی تھے۔ نفیسہ کی امی نے کہہ دیا تھا۔

”تم اپنی ضد کے آگے ہماری بات نہیں مان رہی ہو، اُن کا رکن سہن، زبان سب کچھ تو الگ ہے اور سب کچھ الگ ہو تو پھر ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“

نفیسہ نے ماں کی بات سنی اُن سنی کر دی تھی۔

”آپ ہی تو ہر ایک سے محبت کا درس دیتیں ہیں۔ تو اب کیوں مخالفت کر رہی ہیں؟“

”بیٹی ہم تو ہر ایک بات کو نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن دوسری طرف سے بھی تو ہمیں یہی توقع ہو کہ وہ بھی ہماری طرح سوچ رکھتے ہیں۔“

مٹی بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں دوسری طرف اس رشتے کے لیے سخت مخالفت چل رہی تھی، وہ بھی اپنے بیٹے کو سمجھا رہی تھیں۔

”بیٹے تم الگ برادری سے لڑکی لا رہے ہو۔ یہ شادی ہماری آگے کی نسل پر اثر انداز ہوگی اور پھر ہماری برادری کے لوگ کیا نہیں گئے ویسے بھی بچے ماں کی تربیت کا اثر لیں گے۔“

نفیسہ اُسے بس دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ نوجوان پہلی ہی نظر میں اُس کے دل کو بھا گیا تھا۔

نفیسہ گھر آنے کے بعد بھی اُس نوجوان کا خیال اپنے دل و دماغ سے نہ نکال سکی تھی۔ رہ رہ کر اُس کا چہرہ نظروں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اب وہ اُس مقام سے اکثر کزرتی کہ شاید نوجوان پھر نظر آ جائے لیکن وہ دوبارہ نظر نہ آیا تھا۔

اس واقعہ کے تقریباً ایک ماہ بعد نفیسہ اپنی ایک بہت قریبی دوست فرزانہ سے ملنے اس کے گھر گئی تھی اور وہ دونوں باتوں میں مصروف تھیں کہ وہاں فرزانہ کے بھائی سلیم اور اس کے ایک دوست کی آمد ہوئی تھی وہ اچانک اپنے سامنے اُسی نوجوان کو دیکھ کر حیران ہوگئی تھی۔ جو اُسے شاپنگ کے دوران نظر آیا تھا۔ نفیسہ کے دل میں تو ایک پچھلی سی جھج گئی تھی۔ اس کے منہ سے کچھ نکل نہیں پارہا تھا وہ دونوں نفیسہ کو سلام کر رہے تھے اور وہ جیسے سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر اُس کی دوست فرزانہ نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلایا تھا۔ تو نفیسہ چونک گئی تھی۔

فرزانہ ہنس کر بولی تھی۔

”کیوں بھئی کہاں کھوئی ہوئی ہو؟ کیا ارادہ ہے؟“ نفیسہ اُن تینوں کے سامنے جیسے شرمندہ سی ہوگئی تھی۔

فرزانہ کے بھائی سلیم نے اپنے دوست کا تعارف کروایا تھا۔

”اس کا نام شیراز ہے۔ اس نے میرے ساتھ

ایم بی اے کیا ہے۔ اب جلد ہی اس کی امی شادی کی شکل میں اس کے پاؤں میں زنجیر ڈالنے والی ہیں۔

بے جاری لڑکیوں کی شامت آئی ہوئی ہے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکالتی رہتی ہیں۔“

نفیسہ یہ ساری باتیں سن کر سوچ رہی تھی۔

”کاش میں ہی اس کی پسند ہوتی یہ میرا شو ہوتا

وہ خدا سے دعا مانگتے لگی۔“

”اے اللہ یہ شخص میرا ہو جائے۔“ شاید ہو

قبولیت کی گھڑی تھی کہ فرزانہ بولی۔

”ارے سلیم بھائی آپ میری دوست نفیسہ کو

سردیوں کی بارش

سردیوں کی بارش بھی
 کیا عجیب بارش ہے
 آتم ہیں نہ جمولے ہیں
 بھگینے کی خواہش بھی
 جاگتی نہیں دل میں
 بند بند کمرے میں
 گرم گرم بستر میں
 چسکیوں کی آوازیں
 ہیٹروں کی گرمائش
 اور بند کھڑکی سے
 جمناکتی ہوئی بوندیں
 جیسے کہتی ہوں آؤ
 اس طرح نہیں کرتے
 سردیوں کی بارش میں
 اس طرح نہیں ڈرتے

قاضی اعجاز محبور

بہت مخالفت، کافی بحث و مباحثے کے باوجود
 نفیسہ اور شیراز اپنی جگہ ٹال رہے تو دونوں کے والدین
 اس شادی پر مجبور ہو گئے تھے۔ اُن کے دلوں میں کوئی
 خوشی نہیں تھی۔ اور آخر کار یہ شادی ہو گئی تھی۔

شیراز کے گھر اُس کی دلہن بن کے آنے کے
 تیسرے دن سے ہی ساس نے نفیسہ کو گھر کے کام سے
 لگا دیا تھا۔ وہ ساس کی خوشی کے لیے گھر کے تمام کام
 کرنے لگی تھی جبکہ اپنے گھر میں تو ماں بھائیوں کی
 لاڈلی ہونے کی وجہ سے وہ کوئی کام نہیں کرتی تھی اب
 یہاں پر نفیسہ ساس کی خوشی کے لیے ہر کام پر رضامند
 ہو جاتی، وہ چاہتی تھی کہ ساس اور تمام گھر والے مجھ
 سے خوش رہیں، وہ اپنے پیار، محبت، خلوص سے اُن
 سب خاص خاص کاموں کو دل جیت لے۔

نفیسہ کی تمام تر کوشش کے باوجود بھی ساس اس
 کے ہر کام میں نقص نکالتی رہتیں اور اس کی برادری کو
 بنیاد بنا کر طعنے دیتی رہتی تھیں، نفیسہ کبھی بھی اپنے شوہر
 سے کسی بھی بات کی شکایت نہیں کرتی تھی وہ سارا دن
 کام میں لگی رہتی اپنے شوہر کے سامنے مسکراتی رہتی اور
 جب وہ اُس جاتا تو چپکے چپکے اُن سو بھا کر اپنے دل کا
 بوجھ کم کر لیتی، وہ اپنے والدین کو بھی کچھ نہیں بتا سکتی تھی
 کیونکہ اس تمام صورت حال سے تو اُس کی مُمی نے پہلے
 ہی آگاہ کر دیا تھا، لیکن اُس وقت وہ محبت میں اندھی
 ہو چکی تھی اُسے اُس وقت کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

محبت میں تو نفیسہ اب بھی اندھی تھی سارے ظلم
 خاموشی سے برداشت کر رہی تھی۔ سارے گھر کا کام
 کپڑے دھونا، استری کرنا، برتن دھونا، کھانا پکانا اور
 اس کے باوجود اپنے ماں باپ کے گھر جانے کی
 اجازت نہ ملتا، اور بے ساس کی بھڑکیاں اور طعنے سنتا
 یہ سب برداشت کرتی رہی تھی اُس کی زبان پر کبھی
 حرف شکایت نہ آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

نفیسہ کو اس ظلم کی چکی میں پتے ہوئے سات ماہ کا
 عرصہ گزر گیا تھا۔ نفیسہ کی ساس کے لیے یہ صورت
 حال ناقابل قبول تھی کیونکہ وہ تو یہ سمجھ رہی تھیں کہ
 دھان پان سی لڑکی پر زیادہ ظلم کروں گی تو یہ میرے

جائے گا۔

نفسیہ بہت زیادہ جلنے کی وجہ سے زیادہ بات نہیں کر رہی تھی۔ پولیس کے بار بار پوچھنے اور کہنے کے باوجود بھی اس نے اپنا بیان نہیں بدلا تھا، آخری وقت تک وہ یہی کہتی رہی تھی کہ میں جائے سے جلی ہوں، میرے اوپر چائے کر گئی تھی۔ پولیس کو اس بیان پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وہ نہ جانے کیوں سچ چھاپ رہی تھی اس لیے پولیس کی کارروائی بھی نہیں ہو سکی تھی۔

اُس کے والدین بھی خاموش ہو گئے ممبر کے بیٹھ گئے تھے کہ جب اُن کی لڑکی ہی کچھ نہیں کہہ رہی تھی تو وہ بھی کیا کرتے ممبر تو کرنا ہی تھا۔ اور پھر تین دن شدید اذیت کی کیفیت میں رہنے کے بعد نفسیہ اس دنیا سے اپنی موت کا راز ساتھ ہی لے گئی تھی۔ اُس نے سب کو بچالیا تھا، وہ مرتے وقت بھی محبت کا درس نہیں بھولی تھی۔ شاید یہی بات اُس کی بخشش کا سبب بن گئی ہو۔

نفسیہ نے تو سب کو بچالیا تھا لیکن قدرت تو سب دیکھ رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد شیراز کی دوسری شادی ہو گئی وہ اپنی بیوی کو لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔ رفتہ رفتہ سب بچے الگ ہو گئے تھے اب ساس گھر میں اکیلی رہ گئی تھیں اور پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ ساس اب جب بھی کچن میں جاتیں فوراً ہی خوف زدہ سی باہر آ جاتیں آہستہ آہستہ نفسیاتی مر ایض بن گئیں، چیختے لگتیں۔

”مجھے نفسیہ کی چیخوں کی آواز آرہی ہے مجھے سونے نہیں دیتی ہیں یہ آوازیں کچن میں کام نہیں کر سکتی، مجھے لگتا ہے میں اسی طرح آگ میں جل جاؤں گی۔“ وہ زور زور سے چیختی چلائی راتیں خود ہی بزدلانی راتیں ایسی بیزباہت نے اُن کا راز کھول دیا تھا اب وہ اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑی ہو تیں اور منہ ہی منہ میں نفسیہ کی روح سے معافی مانگتی راتیں چند سال بعد اُن کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔

نفسیہ کے والدین بھی زیادہ عرصہ اپنی بیٹی کا صدمہ برداشت نہ کر سکے اور جلد ہی وہ اپنی بیٹی سے جا ملنے، نفسیہ کے بھائی آج بھی اپنی پیاری بہن کو یاد کر کے روتے ہیں۔

☆☆.....☆☆

بیٹے کو چھوڑ دے گی، پھر میں اپنے بیٹے کی اپنی ہی برداری میں شادی کر دوں گی۔

اُس روز نفسیہ صبح ناشتہ بنانے کے لیے کچن میں گئی تھی اُس نے چائے بنانے کے لیے پتلی میں پانی گیس والے چولہے کا ایک برنز جلا کے رکھا تھا اور پتی چینی وغیرہ ڈال کر اپنے کمرے میں شوہر کو اٹھانے کے لیے گئی تھی یہ اُس کا روز کا معمول تھا وہ شوہر کو اٹھا کر کچن میں واپس آئی تو اُس نے اپنی ساس کو کچن سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا۔

”امی آپ کچن میں کیوں آئیں، کچھ چاہیے تھا تو مجھے کہہ دیا ہوتا۔“

”میں یہ دیکھنے آئی تھی تم نے چائے بنانے کے لیے رکھ دی ہے یا نہیں؟“ یہ کہہ کر وہ کچن سے باہر نکل گئی تھیں۔ چائے تیار ہو گئی تھی۔ نفسیہ نے چائے نکالنے کے لیے پتلی چولہے کے ایک برنز سے اٹھائی ہی تھی کہ دوسرا برنز خود بہ خود بھڑک گیا تھا اور نفسیہ کے دوٹپے نے آگ پکڑ لی تھی، اُس نے گھبراہٹ میں چائے کی پتلی ہاتھ سے چھوڑی تھی تو ساری چائے اُس کے اوپر گر گئی تھی۔ وہ بری طرح سے چیخ رہی تھی سب دوڑتے ہوئے کچن میں آئے تھے، نفسیہ کے شوہرنے جلدی سے اس کے اوپر پانی ڈالا تھا۔ آگ تو بجھ گئی تھی لیکن اس عرصے میں اُس کا جسم بہت زیادہ جل چکا تھا، اُسے بہت بڑی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا، جہاں نفسیہ کے والدین بھی آ گئے تھے اور اپنی بیٹی کی بری حالت دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اسپتال کی انتظامیہ کے بلانے پر پولیس بھی پہنچ چکی تھی۔ نفسیہ سے پولیس نے پوچھا تھا کہ آگ کیسے لگی۔

نفسیہ نے بیان دیا تھا کہ چائے بناتے ہوئے اپنی غلطی سے جل گئی۔

بھائی اور والدین کو شک تھا کہ یہ حادثہ نہیں تھا اُسے جلا یا گیا ہے لیکن اُن کی بیٹی ہی اس بارے میں کچھ اور بتانے کو تیار نہیں تھی، نفسیہ اپنے شوہر شیراز سے بہت پیار کرتی تھی، اُس نے تو شیراز کو بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ حادثے سے پہلے اس نے اپنی ساس کو کچن سے نکلنے دیکھا تھا صرف اس لیے کہ وہ پریشان ہو

مرگ و دھارے پانچویں جیتی جاگتی کہانی

دیر آئے در سیرت آئے

احسان دانش کا خیال

شاید اسی مقام کی مجھ کو تلاش تھی
دریافت کر رہی ہے یہاں زندگی مجھے

ممتاز احمد

سے نیچے اترو۔“ اور ساتھ ہی مجھے گاڑی روکنے کا کہا۔
میں نے اپنے اوپر لگے شیشے سے لڑکی طرف
دیکھا تو وہ حقیقتاً پریشان نظر آ رہی تھی اب تو اُس کے
بچے نے بھی رونانا شروع کر دیا تھا۔ میں چند سیکنڈ تک
اُس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا مجھے وہ سچی معلوم
ہو رہی تھی۔ کنڈیکٹر نے مجھے دوبارہ آواز دی۔
”استاد جی گاڑی روکو۔“ مگر میں نے گاڑی
روکنے کے بجائے کنڈیکٹر سے کہا۔

”تم اس لڑکی کا ٹکٹ کاٹ دو اور پیسے مجھ سے
لے لینا۔“ جس پر اُس نے ٹکٹ کاٹ کر لڑکی کو دے
دیا۔ لڑکی نے احسان مند نظروں سے میری طرف
دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اُس کے بیٹے نے
زور زور سے رونانا شروع کر دیا اور وہ اُسے چپ
کرانے میں لگ گئی۔

میرا نام صفدر ہے اور میں اپنے والدین کی اکلوتی
اولاد ہوں۔ میرا باپ ایک غریب آدمی تھا وہ سارا
دن محنت مزدوری کرتا اور شام کو اتنا کما کے لاتا کہ ہم
گھر کے تین افراد بمشکل تین ٹائم کا کھانا کھاتے، میری
عمر اُس وقت سات یا آٹھ سال تھی جب میرے ابا کا
انتقال ہو گیا۔ میری ماں بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی

میں نے جب بس کو لاری اڑے سے نکالا تو اُس
وقت آنٹھ یادیں سواریاں بیٹھی تھیں چنانچہ ہر اسٹاپ
سے سواریاں بھٹانی شروع کر دیں شہر سے پندرہ
کلومیٹر دور تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ اب تمیں کے
قریب سواریاں بیٹھ چکی تھیں لہذا میں نے گاڑی کی
رفتار تیز کر دی۔ کنڈیکٹر نے سواریوں سے کرایہ لینا
شروع کر دیا۔

مجھ سے پچھلی سیٹ پر ایک جوان خوبصورت اور
خوبرو لڑکی اپنے ایک سال کے بیٹے کے ساتھ بیٹھی تھی
اور اپنے بچے کو پیار کر رہی تھی جب کنڈیکٹر نے اُس
سے کرایہ طلب کیا تو وہ اپنا پرس بیگ میں تلاش کرنے
لگی۔ پورے پانچ منٹ تک اُس نے اپنے بیگ کو ٹولا
مگر اُس کا پرس ہمیں مل رہا تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں
کہنے لگی۔

”اپنا پرس گھر بھول آئی ہوں۔“ کنڈیکٹر نے
نوراً جواب دیا۔ ”بی بی ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں
ہے، جلدی سے کرایہ دو۔“ وہ لڑکی کہنے لگی۔

”بھائی میں بیچ بول رہی ہوں میرا پرس گھر رہ گیا
ہے۔“ اس پر کنڈیکٹر کچھ غصے سے بولا۔

”بی بی اگر کرائے کے پیسے نہیں ہیں تو چلو گاڑی

چارپائی پر لیٹی رہتی، پھر وہ اٹھ کر رات کا کھانا بناتی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میری ماں بہت جلد سو جاتی جبکہ میں دس بجے تک پڑھتا رہتا۔ اسکول اور محلے میں میرا کوئی دوست نہ تھا شاید ہماری غربت کی وجہ سے میری دوستی کسی بھی لڑکے کے ساتھ نہ ہو سکی تھی یہی وجہ تھی کہ میں بچپن سے ہی ایک بہت حساس دل رکھنے والا بندہ تھا۔

☆.....☆.....☆

وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے سات سال کا عرصہ اسی روٹین میں گزر گیا میرا میٹرک کا سالانہ امتحان سر پر آ گیا تو میں نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اب میں اسکول سے سیدھا گھر آ کر دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرتا پھر پڑھنے لگ جاتا۔ میری ماں پورا مہنہ لوگوں کے گھروں میں کام

اب اتفاق سے میرے دوھیال اور نھیال میں سے کوئی بھی نہ تھا میرے ماں باپ دونوں اکیلے تھے تو باپ کی وفات کے بعد ہم ماں بیٹے پر تنگی اور مصیبت کے پہاڑ گر گئے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے میری ماں نے عذت میں بیٹھنے کی بجائے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ میں اُس وقت تیسری کلاس میں سرکاری اسکول میں پڑھتا تھا۔ میری ماں صبح کی گئی شام کو تھک ہار کر گھر آ کر چارپائی پر گر جاتی، جبکہ میں دن ایک بجے اسکول سے آ جاتا تھا اور اپنی ماں کا انتظار کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا ماں بنا کر رکھ جاتی جسے میں آ کر کھا لیتا۔ ہمارا گھر لاری اڈے کے بالکل قریب تھا تو اسکول سے واپس آ کر میرا زیادہ تر ٹائم لاری اڈے میں گزرتا، جب ماں کے آنے کا ٹائم ہو جاتا تو میں گھر چلا جاتا۔ ماں گھر آ کر پورا ایک گھنٹہ



سلام بھی ساجد سے ہوگئی۔ جب میری عمر اٹھارہ سال ہوگئی تو ساجد نے ہی میرا شناختی کارڈ بنوایا تھا۔ کچھ دن گزرے تو ساجد کہنے لگا۔

”یار میں تمہارا ڈرائیونگ لائسنس نہ بنوادوں؟“
تو میں نے کہا۔

”میں نے کیا کرنا ہے لائسنس بنوا کر اور دوسرا یہ کہ اس پر اچھی خاصی رقم خرچ ہوتی ہے۔“ ساجد کہنے لگا۔

”تم رقم کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارا ڈرائیونگ لائسنس بنوادیتا ہوں۔ تمہارے کام ہی آئے گا۔“
میرے نہ نہ کرنے کے باوجود ساجد نے میرا LTV اور HTV ڈرائیونگ لائسنس بنوادیا اور مجھ سے ایک روپیہ بھی نہ لیا۔ میں نے ڈرائیونگ لائسنس گھر لاکر رکھ دیا اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ساجد کا تبادلہ کسی اور شہر میں ہو گیا۔

جب میں سینکڑا ایئر میں پڑھ رہا تھا تو ایک روز میری ماں جلد گھر آگئی اور ٹڈیالہ مار کر چار پائی پر گر گئی۔ میں نے اپنی ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اُسے بہت شدید بخار تھا اور اسے جوڑوں کا شدید درد بھی لاحق تھا۔ پورا مہینہ ماں گھر میں رہی اور اُس کا علاج ہوتا رہا۔ جب اُس کی حالت کچھ بہتر ہوئی اور وہ چلنے پھرنے کے کچھ قابل ہوئی تو دوبارہ اپنے کام پر گئی، جب پتہ چلا کہ سب گھروں نے نئی کام والیاں رکھ لی تھیں۔ میری ماں کو جواب مل گیا تھا۔ پاس ایک روپیہ نہ تھا جس کی وجہ سے اُس کا علاج چھوٹ گیا، ادھر کالج والے ایف اے کا داخلہ بیچنے کے لیے فیس مانگ رہے تھے ہمارے پاس چھوٹی کوڑی تک نہ تھی تو میرا داخلہ کالج والوں نے نہ بھیجا، میں نے کالج جانا چھوڑ دیا اب میں سارا دن خدا بخش کے پاس لاری اڈے میں بیٹھا رہتا تھا۔

میں اُن دنوں بہت پریشان رہتا تھا۔ میری پریشانی کی وجہ خدا بخش نے پوچھی تو میں نے اُسے اپنے سارے حالات بتا دیے۔ اُس نے مجھے کچھ روپے دیے جن سے گھر میں راشن ڈالا۔ دو یا تین دن گزرے تو اخبار میں ’آری میں ڈرائیونر کی بھرتی کا

کرتی‘ اُس کی کوئی چھٹی نہیں تھی۔ صبح سے لے کر رات تک وہ کام کرتی۔ اُس وقت ماں کی عمر اڑتیس سال تھی مگر دیکھنے میں وہ پچاس پچھن کی نظر آتی تھی۔ سارا دن وہ اپنے مالکوں کی باتیں تو خاموشی سے سنتی رہتی مگر گھر آ کر وہ اُن باتوں کا سارا غصہ مجھ پر نکالتی۔ میں چونکہ اپنی ماں کے حالات سے بخوبی واقف تھا تو ماں کی بھلی کٹی باتیں بڑی خاموشی سے سن لیا کرتا تھا۔

ماں بہت چڑچڑی ہوگئی تھی ایک تو شروع سے ہی غربت دیکھی تھی دوسرا وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی اور تیسرا یہ کہ بغیر چھٹی کے پورا مہینہ وہ کام کرتی، تو یہی وجہ تھی کہ اُسے کئی چھوٹی موٹی بیماریوں نے گھیر لیا تھا چڑچڑی ہونے کے باعث وہ بات بات پر لڑنے لگی تھی۔ اسی لیے وہ پورے محلے میں لڑاکی ماسی کے نام سے مشہور ہوگئی۔

میں نے میٹرک کا امتحان پوری محنت کے ساتھ دیا، جس دن میرا آخری پیمہ تھا اُس روز میں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا چھلکا محسوس کیا اور اُسی دن سے لاری اڈے جانا شروع کر دیا۔ وہاں اپنے ہی جیسے ایک بندے، جس کا نام خدا بخش تھا سے دوستی ہوگئی وہ گاڑیوں کی مرمت وغیرہ کرتا تھا۔ میٹرک کا رزلٹ چاہ ماہ کے بعد آتا تھا تو رزلٹ آنے تک میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی۔ میں صبح سے لے کر شام تک خدا بخش کے پاس رہتا۔

جب میٹرک کا رزلٹ آیا تو اُس وقت میری عمر سترہ سال تھی میں نے ہائی سینڈ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جس دن رزلٹ آیا اُس روز میری ماں بہت خوش ہوئی اُس نے مجھے اپنے گلے لگا کر خوب پیار کیا اور مٹھائی منگوا کر محلے میں تقسیم کی۔ میں نے سرکاری کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا، کالج جانے کے ساتھ ساتھ میرا لاری اڈے میں خدا بخش کے پاس آنا جانا بھی رہا۔ خدا بخش کے پاس پولیس کے ایک بندے ساجد کا آنا جانا بھی تھا۔ وہ ٹریک پولیس میں ڈرائیونر تھا اور اپنی گاڑی کا کام خدا بخش سے کروانے آتا تھا تو اسی نسبت سے میری دعا

اشتبہار شیخ ہوا تھا۔ میری پڑھائی تو چھوٹ گئی تھی، ماں بیمار تھی تو میں نے کچھ سوچ کر درخواست دے دی۔ بہت جلد مجھے کال آ گئی۔ جب میں بھرتی کے لیے پیش ہوا تو میرا شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس چیک کیے گئے جو کہ بالکل ٹھیک تھے میرا قدم بھی لسا تھا میٹرک پاس تھا اور جب میری ڈرائیونگ چیک کی گئی تو وہ بھی بالکل پرفیکٹ تھی چنانچہ مجھے پاک آری میں ڈرائیور بھرتی کر لیا گیا تھا۔

اتفاق سے میری پوسٹنگ میرے ہی شہر میں ہوئی تھی۔ روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوتی جو کہ میں بہت اچھے طریقے سے کر رہا تھا، میں نے اپنی ماں سے کہا کہ اب آپ کو کہیں بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بس آپ آرام سے گھر رہو۔ ویسے بھی میری ماں جس نے ساری زندگی محنت مشقت کی تھی اب وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو گئی تھی، سب سے بڑا مسئلہ اُسے جوڑوں میں شدید درد کا تھا۔ وہ بمشکل واش روم تک آتی جاتی تھی سارا دن چار پائی پر پڑی جینٹی چلائی رہتی میں جیسے ہی گھر آتا وہ بولنا شروع ہو جاتی اور پے مکان بولتی رہتی۔ میری کیونکہ اب ملازمت لگ گئی تھی تو میری ماں کو میرے پیار کی فکر لاحق ہوئی اور اُس نے میرے لیے لڑکی تلاش کرنا شروع کر دی، مگر میرے رشتے میں میری ماں کا لڑنا جھگڑنا اور بہت زیادہ بولنا آڑے آتا جو رشتہ بھی آتا وہ میری ماں کی بد مزاجی دیکھ کر پلٹ کر نہ آتے تھے۔

وقت کا کام ہے گزرتا اور وقت گزرتا جا رہا تھا، اسی دوران میری پوسٹنگ دوسرے شہر میں بھی ہوئی مگر جلد ہی کینسل ہو جاتی اور میں واپس اُسے شہر میں آ جاتا، اسی طرح اٹھارہ سال کا عرصہ بیت گیا۔ میری ماں میرا رشتہ تلاش کرتی رہی مگر ہر طرف سے ناکامی ہوئی۔ اب میری عمر تقریباً پچیس سال ہو گئی تھی، مگر میں ابھی تک کنوارا ہی تھا، اور پھر ایک دن میری پوسٹنگ کے آرڈرز کوئیڈ کے آگئے، میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح یہ آرڈر کینسل ہو جائیں۔ مگر میرے آرڈرز کینسل نہ ہوئے، چنانچہ میں نے کوئیڈ جانے کی بجائے اپنی ماں کی وجہ سے ریٹائرمنٹ

غزل

زندگی خاموش پلکوں پر دھری رہ جائے گی
دیکھنا اک روز دنیا دیکھتی رہ جائے گی

خواب ہو جائیں گے سارے چاہتوں کے سلسلے
روشنی تاریک غاروں میں پڑی رہ جائے گی

کوچ کر جائے گا اک دن آخری ہمدرد بھی
اور پھر تا عمر کھڑکی ادھ کھلی رہ جائے گی

تیرا ملنا آخری خواہش ہے لیکن دیکھنا
تجھ سے مل کر بھی عجب سی تنگی رہ جائے گی

بند کردوں گی میں اک دن روح کی سب کھڑکیاں
اور پھر اک رات مجھ میں بھاگتی رہ جائے گی

عکاشہ سحر

گاڑی سے اترنے لگی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ آگے اُس نے کدھر جانا ہے، تو اُس نے اُس شہر کی ایک ہستی کا نام بتایا میں نے اُسے دو سو روپے دیے کہ رکھ لو کیونکہ آپ اپنا پرس گھر بھول آئی ہو تو اُس نے ہلکی سی مسکان کے ساتھ وہ روپے لے لیے اور ساتھ ہی میرا موبائل نمبر مانگا جو کہ میں نے اُسے دے دیا۔ اُس نے میرا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا اور کہنے لگی۔

”ایک ہفتے بعد میں ان ریلوں اور چوکر اب آپ نے ادا کیا ہے اتنی مالیت کا موبائل بیٹلنس آپ کو بیچ دوں گی۔“ مگر میں نے اُسے منع کر دیا۔

”پلیز آپ ہرگز مجھے موبائل بیٹلنس نہیں بھیجیں گی۔“ تو وہ جب کر کے گاڑی سے اتری اور ایک رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی۔

اس واقعے کے بعد آٹھ دس دن خاموشی رہی تھی، اُس لڑکی کی طرف سے کوئی کال یا پیج نہ آیا۔ مجھے بہت مایوس ہوئی میں نے سوچا کہ وہ لڑکی فراڈ ہی تھی۔ گیارہویں روز اُس لڑکی کی کال آگئی تو اُس نے میرا نام پوچھا جو میں نے اُسے بتا دیا، پھر فوراً ہی اُس نے اپنا نام شازیہ بتایا میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

”اب وہ مجھے موبائل بیٹلنس بھیجے گی ہے تو میں نے اُسے سختی سے منع کیا کہ پلیز آپ ایسا نہ کریں۔“ تو وہ بولی۔

”کیوں ایسا نہ کروں؟“ تو میں نے کہا۔

”بس چھوڑیں آپ رہنے دیں۔“ اس پر ہماری ہلکی سی ٹھکر ہوئی اور بالآخر وہ بیٹلنس نہ بھیجے پر آمادہ ہو گئی۔ جب وہ کال ختم کرنے لگی تو میں نے اُس سے ریکورسٹ کی کہ کبھی کبھی بات کر لیا کریں۔ وہ ٹھوڑی دیر خاموش رہی اور پھر کہنے لگی۔

”اچھا سوچوں گی۔“ یہ کہہ کر اُس نے کال کاٹ دی تھی۔ میں نے شازیہ کے نام سے اس کا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا تھا۔

کوئی دو دن گزرے تھے تو رات کے گیارہ بجے شازیہ کی کال آگئی، مجھے اُس کی کال کا آنا بہت اچھا لگا

اپلائی کر دی۔ میری ریٹائرمنٹ کی درخواست منظور کر لی گئی اور مجھے ریٹائرڈ کر دیا گیا۔ مجھے گرجو بیٹی کی مد میں پانچ لاکھ روپے ملے اور ماہانہ بارہ ہزار پنشن مقرر ہوئی۔ میں نے پانچ لاکھ روپے بینک میں جمع کروا دیے تھے۔ اب میں بالکل فارغ ہوتا تھا تو سارا دن اپنی ماں کی بک بک جھک جھک سنتا رہتا جس سے میں چند روز ہی اکتا گیا اور دوبارہ لاٹری اڈے جانا شروع کر دیا۔

میرا پاک آرمی میں اٹھارہ سالہ ڈائریکٹ کا تجربہ تھا اور انیس سال پرانا ایل ٹی وی اور ایچ ٹی وی کا ڈرائیونگ لائسنس تھا جو کہ میرے بہت کام آیا اور مجھے خدا بخش کے توسط سے ایک بڑی گاڑی میں ڈائریوری کی نوکری مل گئی۔

میں صبح نو بجے گاڑی کو لاری اڈے سے نکالتا اور دوسرے شہر لے جاتا جس کی مسافت چار گھنٹے کی تھی وہاں ایک گھنٹہ رکتا اور پھر گاڑی واپس لے آتا اس طرح مجھے روزانہ شام کے چھ ساڑھے چھ بج جاتے۔ معقول تنخواہ تھی بارہ ہزار روپے پنشن ہر ماہ مل جاتے تو گزر بسر بہت اچھی ہو رہی تھی۔

اتفاق سے ابھی تک کوئی لڑکی یا عورت میری زندگی میں نہ آئی تھی۔ خدا بخش میرا ہم عمر ہی تھا مگر اُس کے چار بچے تھے جو کہ اب جوان ہو رہے تھے مگر میری ابھی تک شادی نہ ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اب جو میں نے گاڑی میں اپنا پرس گھر بھول آنے والی لڑکی کو دیکھا تھا وہ پہلی نظر میں ہی میرے دل کو بھانگی تھی، حالانکہ اُس نے ایک سال کا بچہ بھی اٹھایا ہوا تھا۔ جس سے لگتا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے مگر وہ میری آنکھوں کے رستے میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میں گاڑی چلانے کے دوران وقتے وقتے سے اپنے سامنے لگے شیشے میں اُسے دیکھتا رہا، تقریباً ایک بجے کے قریب ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے میں نے گاڑی لاری اڈے میں کھڑی کی تو سواریاں اترنے لگیں مگر وہ لڑکی اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی۔ جب مساری سواریاں اتر گئیں تو اُس نے میرا لشکر یہ ادا کیا اور بیک لے کر

شادی اب تک نہ ہو سکی ہے۔ وہ میٹرک پاس ہے اور
سلائی کڑھائی کی بہت ماہر ہے وہ سارا دن گھر میں
بیٹھ کر لوگوں کے کپڑے سکتی ہے یہی اُن کا ذریعہ
آمدنی ہے۔ جس میں وہ اپنے بھانجے کو پال رہی
ہے۔

میں نے بھی اُسے اپنے سارے حالات شروع
سے لے کر اب تک بتا دیے تھے۔ اور سچ بتایا تھا کہ
میری ماں کی بد مزاجی کی وجہ سے اب تک میری شادی
نہ ہو سکی تھی۔ اس پر شاز یہ بولی تھی۔

”جن حالات کا شکار آپ کی والدہ ہوئیں تو ان
حالات میں کوئی بھی عورت ایسے ہو جاتی ہے۔ اس
میں آپ کی والدہ کا بھی کوئی قصور نہیں ہے وہ بے
چاری تنہائی کا شکار ہیں کسی کے ہاں اُن کا آنا جانا نہیں
ہے تو اس وجہ سے وہ بد مزاج ہو گئی ہیں۔

☆.....☆.....☆

اس کے بعد حالات بہت جلد تبدیل ہوئے میں
نے سب سے پہلے اپنا مکان تبدیل کیا اور نسبتاً بہت
بہتر آبادی میں زمین کروں کا گھر کرائے پر لیا، پھر ایک
شام انجمنی سادگی سے میرا نکاح شاز یہ سے ہو گیا
تھا۔ ہم شاز یہ کی ماں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے
شاز یہ کا بھانجا جس کا نام فیضان ہے وہ بھی ہمارے
ساتھ رہتا ہے حیرت انگیز طور پر میری ماں کی بد مزاجی
ختم ہو گئی ہے شادی کے چھ ماہ بعد شاز یہ کے مشورے
سے ہم نے ایک بوتیک سینٹر کھول لیا۔

شاز یہ کے پاس سلائی کڑھائی کا دس سالہ تجربہ
ہے جس کی وجہ سے اُس نے نت نئے ڈیزائن کے
کپڑے تیار کیے تو الحمد للہ بوتیک سینٹر بہت اچھا چل
رہا ہے اور کافی منافع بخش کاروبار ہے۔ میں
ڈرائیوری کرتا ہوں ساتھ آرمی کی پینشن بھی مل رہی
ہے۔ تو ہمارا گزارا بہت اچھا ہو رہا ہے۔ اب میں نے
اپنے ذاتی مکان کے لیے پانچ مرلے کا پلاٹ بھی
لے لیا ہے۔ جب سے شاز یہ میری زندگی میں آئی
ہے تو سچ پوچھیے کہ بہار آئی ہے کسی نے سچ کہا ہے کہ
دیر آئے درست آئے۔

☆☆.....☆☆

پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر میں نے اُس
سے پوچھا کہ اُس کا خاوند کیا کرتا ہے؟“ اُس پر وہ بولی

”میرا خاوند؟“ میں نے کہا۔
”جی ہاں آپ کا خاوند.....“ تو وہ ایک دم ہنس
پڑی اور کہنے لگی۔

”ابھی اُس کی شادی نہیں ہوئی یہ خاوند کہاں
سے آ گیا۔“ اُس نے خوشی اور حیرانگی سے پوچھا۔
”کیا واقعی آپ کی شادی نہیں ہوئی۔“ تو وہ
کہنے لگی۔

”جی ہاں صغیر صاحب میری شادی نہیں
ہوئی۔“ تو میں نے پوچھا۔

”وہ بچہ کس کا ہے۔“ تو اُس نے بتایا کہ وہ بچہ
اُس کا بھانجا ہے۔ اس پر اُس نے بتایا کہ پانچ سال
قبل اُس کی بڑی بہن کی شادی ہوئی تھی تین سال تک
اُس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور ایک سال پہلے اللہ
نے اُسے بیٹا دیا۔ جب بیٹا دو ماہ کا ہوا تو اُس کی بہن
خاوند اُس کی ساس اور ایک نند ایک ٹریک کے
حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

یہ بچہ معجزانہ طور پر بچ گیا اسے خراش تک نہ آئی۔
میری بہن کا سارا سسرال اُس حادثے کی نظر ہو گیا
ایک دن میں چار جنازے اٹھے تو کھرام بچ گیا۔ اُن
چاروں کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ میری بہن کا خاوند
بہت اچھا انسان تھا وہ میری بہن سے بہت پیار کرتا
تھا چنانچہ بہن بہنوئی کے مرنے کے بعد وہ بچہ اب
میں پال رہی ہوں۔

جب وہ اپنی بہن کے بارے میں بتا رہی تھی تو وہ
بہت غمگین ہو گئی اور رونے لگی۔ میں نے اُسے چپ
کر دیا اور سلی دی کہ جن کا کوئی نہ ہو اُن کا خدا ہوتا ہے
اس کے بعد بہت جلد ہماری دوستی ہو گئی اور یہ دوستی
پیار میں بدل گئی۔

شاز یہ نے اپنے بارے میں مزید بتایا تھا کہ اُس
کی عمر تیس سال ہے اُس کے باپ کا انتقال دس سال
پہلے ہو گیا تھا۔ وہ صرف دو بیٹیں ہی تھیں اب وہ اپنی
ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ غربت کی وجہ سے اُس کی

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ایڈفرس لنکس ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
 ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
 ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔
 اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



ان کہانیوں میں پڑھنے والے کے لیے عبرت کا کوئی ٹکڑا کوئی سدا سن ضرور موجود ہے

عبرت کی لکیریں

عبداللہ چادری کا خیال

ہمیں پہچان ہوتی ہے خدا کی
ارادے جب ہمارے ٹوٹتے ہیں

رضوانہ آفتاب

مشین اور کپڑے سائیز کیے تھے اور دوپٹہ سر پر لپیٹا تھا۔

”آگنی حرم.....“ حرم کو کمرے سے نکلتا دیکھ کر کھلیلہ بیگم گویا تھیں۔

”السلام علیکم خالہ جان کیسی ہیں آپ؟“ اس نے نہایت گرم جوشی سے کہہ کر خالہ کا ہاتھ اپنے سر پر رکھوایا تھا۔

”وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں بیٹا جیتی رہو میری بچی اللہ تمہارے نیک نصیب کرے۔“ حرم کے سر پر ہاتھ رکھتے زبیدہ بیگم کا انداز دلہانہ تھا۔

”بیٹا خالہ جان کے لیے شربت بنا لاؤ۔“ کھلیلہ بیگم نے بیٹی کو محبت باش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ حرم نے فوراً ہی ٹیمن کارخ کیا تھا۔

”ارے کھلیلہ رہنے بھی دو۔“ زبیدہ بیگم کے انداز میں اٹھاری گئی۔

”آپ اذیکموند تھی گری ہے آپ تو پیسے پیسے ہو رہی ہیں ایسے موسم میں تو آپ کا بی بی لوہو جاتا ہے۔“

کھلیلہ بیگم کے انداز میں شیرینی کھلی تھی وہ ہولے ہولے بہن کو پچھلا کر رہی تھیں۔

”آپ آپ نے اتنے دنوں بعد چکر لگایا۔“ کھلیلہ

دروازہ مسلسل بچ رہا تھا، ظہر کی نماز ادا کر کے کھلیلہ بیگم تھوڑی دیر ستانے کی غرض سے لیٹی تھیں، مسلسل بجتے دروازے کی وجہ سے انہوں نے دروازے تک جا کر نووارد سے استفسار کیا تھا۔

”کون ہے؟“

”کھلیلہ دروازہ تو کھولو۔“ زبیدہ بیگم کی آواز کھلیلہ کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

”ارے آپ! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ کھلیلہ بیگم نے بڑی بہن کو گلے لگاتے ہوئے گرم جوشی سے کہا تھا۔

”بس ٹھیک ہی ہوں۔“ زبیدہ بیگم کے انداز میں بیزاری تھی۔

”آئیں آبا بیٹھیں۔“ ان کے ہاتھوں سے چادر لیتے ہوئے کھلیلہ بیگم نے برآمدے میں چھٹی چار پائی کی جانب اشارہ کیا تھا۔

”حرم بیٹی کہاں ہے؟“ چار پائی پر بیٹھتے ہوئے زبیدہ بیگم نے ادھر ادھر نظر دوڑا لی تھی۔

”حرم! آؤ تمہاری خالہ آئی ہیں۔“ کھلیلہ بیگم نے بیٹی کو آواز دی تھی، انداز بے حد مسرور تھا۔ سلائی کرنی حرم نے ماں کی بڑ جوش آواز بنو رہی تھی۔

بیگم نے استفسار کیا تھا۔
 ”بس کیا تاؤں، جواد کی طبیعت کچھ خراب تھی میں
 تو گھر کی ہی ہو کر رہ گئی۔“ زبیدہ بیگم نے چارپائی پر
 پیر پھیلاتے اچانک عایان کیا تھا۔

”کیوں کیا ہوا جوادیے کو؟“ ٹھیکیلہ بیگم کے انداز
 میں تشویش کے ساتھ ساتھ محبت بھی تھی۔
 ”ہونا کیا ہے وہی موسیٰ بخار ذرا سا بخار ہو جائے
 تو یہ لڑکا مجھے پریشان کر دیتا ہے۔“ زبیدہ بیگم نے
 تفصیلات گوش گزار کیں۔

”کوئی لڑکی ہے نظر میں؟“ ٹھیکیلہ بیگم کا انداز
 پُر تجسس تھا۔
 ”خالیہ یہ لیس شربت۔“ شربت کا گلاس ماں اور
 زبیدہ بیگم کو تھماتے دیکر لوازمات چارپائی پر رکھتے
 حریم ماں اور خالیہ کے درمیان بر اجماع ہوتی تھی۔

”اللہ بچے کو شفا دے۔“ ٹھیکیلہ بیگم نے محبت سے
 گندھے لہجے میں کہا تھا۔
 ”بس دعا کیا کرو میں تو چاہتی ہوں جلد از جلد
 جواد کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں، اس کی شادی
 کروا کے پُر سکون ہو جاؤں۔“ زبیدہ بیگم نے سرد آہ
 بھرتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے تو اپنے جواد کے لیے ہمیشہ سے حرم ہی
 پسند ہے، مجھے دید و حرم کو۔“ حرم کو شفقت بھری نظر سے
 دیکھتے زبیدہ بیگم بہن سے ہمکلام تھیں۔

”آپ حرم آپ ہی کی تو ہے۔“ ٹھیکیلہ بیگم نے
 مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
 زبیدہ بیگم نے بٹوے سے ایک نٹلا نوٹ نکال کر
 حرم کے ہاتھوں میں تھما دیا تھا اور اس کے ماتھے پر
 بوسہ لیتی وہ غامسی خوش تھیں۔
 ”حرم آج سے تمہارے گھر میں میری امانت
 ہے۔“ حرم کو اپنائیت سے دیکھتے وہ ٹھیکیلہ بیگم سے
 مخاطب تھیں۔
 ”بالکل آپا۔“ ٹھیکیلہ بیگم بے حد خوش تھیں جبکہ حرم
 سرور ہوئی تھیں۔

”آپ حرم آپ ہی کی تو ہے۔“ ٹھیکیلہ بیگم نے
 مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

زبیدہ بیگم نے بٹوے سے ایک نٹلا نوٹ نکال کر
 حرم کے ہاتھوں میں تھما دیا تھا اور اس کے ماتھے پر
 بوسہ لیتی وہ غامسی خوش تھیں۔
 ”حرم آج سے تمہارے گھر میں میری امانت
 ہے۔“ حرم کو اپنائیت سے دیکھتے وہ ٹھیکیلہ بیگم سے
 مخاطب تھیں۔
 ”بالکل آپا۔“ ٹھیکیلہ بیگم بے حد خوش تھیں جبکہ حرم
 سرور ہوئی تھیں۔



ہو گئی تھی۔ وہ بائیک محن میں پارک کر کے ماں کی جانب بڑھا تھا جو چن میں مصروف تھیں۔

”کیا ہوا آج دیر ہو گئی تمہیں؟“ اپنے عقب میں جواد کی موجودگی پر زبیدہ بیگم نے استفسار کیا تھا۔
 ”بائیک خراب ہو گئی تھی خیر ان سب باتوں کو چھوڑیں آپ بتائیں آج اتنی خوش کیوں ہیں؟“ جواد نے ماں کے سرور انداز کو ملاحظہ کرتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

”ہاں آج تو میں واقعی خوش ہوں۔“ زبیدہ بیگم نے برز جلاتے ہوئے جواد کی تاکید کی تھی۔
 ”اوہو آج خروچہ کیا ہے کچھ پتا تو چلے؟“ جواد نے بھی گرجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔
 ”سب بتاؤں گی پہلے ہاتھ منہ دھولو کھانا لگاتی ہوں۔“ (امی سے آج تماشہ کے متعلق بات کر رہی تھیں چاہیے) جواد نے سوچا تھا۔
 ”امی آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“
 ”آخر ایسی کیا بات ہے بیٹے؟“ زبیدہ بیگم کا انداز استغہا مایہ تھا۔

”امی آپ تماشہ کو جانتی ہیں ناں جو میرے ہی ساتھ جا کر رہتی ہے؟“ جواد نے خاصے دھیمے لہجے میں پوچھا تھا۔

”ہاں جانتی ہوں کیا ہوا اُسے؟“ چائے کا پانی چولہے پر رکھتے زبیدہ بیگم نے استفسار کیا تھا۔

”امی اسے کچھ نہیں ہوا آپ باہر آئیں۔“ برز بند کرتے وہ ماں کا ہاتھ پکڑے باہر لے آیا تھا۔ اور زبیدہ بیگم حیرت سے بیٹے کو ٹوک رہی تھیں۔

”امی مجھے تماشہ سے شادی کرنی ہے۔ آپ کو اس کے گھر رشتہ لے کر جانا ہوگا۔“ جواد نے نظریں جھکا کر نہایت عاجزی سے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟“ زبیدہ بیگم نے جواد کا ہاتھ جھٹکا تھا۔

”امی اس میں پاگل ہونے والی کیا بات ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“ جواد کے انداز میں عاجزی تھی۔

”مگر مجھے وہ لڑکی ذرا پسند نہیں ہے جو تمہاری

کا چہرہ تاثر سے برا تھا، وہ بے دھیانی میں اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

زبیدہ اور ٹھیکلہ بیگم سکی بہنیں تھیں۔ زبیدہ کے گھر جواد کی پیدائش ہوئی تھی جب جواد دو سال کا تھا اسی وقت جواد کے والد بمشتر رحمانی ایک حادثے سے دو چار ہوئے اور یہ حادثہ اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ وہ جانبر نہ ہو سکے اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ زبیدہ بیگم اب بالکل تنہا ہو گئی تھیں۔ اُن کے ماں باپ تو بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے میکے کے نام پر صرف ایک بہن تھی جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ بمشتر رحمانی نے ہی اُن کی شادی اپنے ایک عزیز دوست مظہر احمد سے کروائی تھی۔ ٹھیکلہ اور مظہر احمد نے اس کڑے وقت میں زبیدہ بیگم کا ہر طرح سے ساتھ دیا تھا۔ مظہر احمد کی مدد سے ہی زبیدہ بیگم کو گارمنٹس فیکٹری میں معقول ملازمت مل گئی تھی۔ جواد کو وہ ٹھیکلہ بیگم کے سپرد کر کے ہی جاتی تھیں۔

ٹھیکلہ بیگم نے جواد کو بہت محنت سے پالا تھا، اسی دوران ٹھیکلہ بیگم کے یہاں حرم کی آمد ہوئی تو زبیدہ بیگم کی یہ دل خواہش تھی کہ وہ حرم کو جواد کے لیے مانگ لیں۔ اور وہ مناسب موقع کا انتظار کرنے لگیں۔ جواد نے اکثر کے بعد ہی ماں کو نوکری کرنے سے منع کر دیا تھا اور خود پڑھائی کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کر رہا تھا۔ اب وہ ایم کام کر چکا تھا اور ایک اچھی فرم میں ملازمت کر رہا تھا۔ حرم کا رشتہ مانگنے کے لیے اس سے بہترین موقع زبیدہ بیگم کو نہ ملتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ٹھیکلہ بیگم کے گھر دامن پھیلانے چلی آئی تھیں۔ برسوں سے دل میں دہی خواہش کو بالا خراہوں نے زبان دے ہی ڈالی تھی۔

بہن کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا اور مظہر احمد کو بھی وہ خوب جانتی تھیں کہ وہ کبھی انکاری نہ ہوں گے وہ آج بے تحاشا خوش اور مطمئن تھیں انہیں شدت سے جواد کی آمد کا انتظار تھا۔

☆.....☆.....☆

جواد رحمانی کو آج آفس سے آنے میں تاخیر

”کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ نتاشہ کے انداز میں محبت کے ساتھ فکر مند سی جھلک رہی تھی۔
”پرسوں میرا نکاح ہے۔“ جواد کا انداز ندامت سے لبریز تھا۔

”کیا؟“ نتاشہ نے متحیر نظروں سے جواد کو دیکھا تھا اسے اپنی سماعت پر شبہ ہوا تھا۔

”امی نے میری خالد کی بیٹی سے میری بات طے کر دی ہے۔ میں نے تمہارے متعلق ان سے بات کی تھی، مگر وہ یہ سب سن کر خاصی برہم ہو گئی تھیں۔“ جواد کے انداز میں پریشانی تھی۔

”میں تو کب سے کہہ رہی تھی امی کو بتا دو، مگر تم نے ہی کہا تھا امی فوراً مان جائیں گی۔“ نتاشہ نے غصے سے کہا تھا، اس کے انداز میں برسوں کی محکم تھی جواد کو اُس کی آواز کی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوتی تھی۔
”میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ امی ایسے ری ایکٹ کریں گی۔“ جواد کا انداز متشکر تھا۔

”خیر اب ہم کیا کر سکتے ہیں بڑوں کی رضا میں راضی ہو جاؤ، کیا پتا اسی میں ہماری بھلائی پوشیدہ ہو۔“ نتاشہ نے جمل سے جواد کو سمجھایا تھا اور اپنی سیٹ کی جانب بڑھ گئی تھی۔ مگر اس کے دل میں اب پھاس سی چھ رہی تھی، آنکھوں کو پھٹکی کی پشت سے رگڑتے اُس نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو سنھالنے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔ جواد نے پس مردگی سے نتاشہ کو خود سے دور جاتا ہوا دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی درد رقم تھا۔ کچھ پا کر کھو دینے کا گہرا رنج اُس کی آنکھوں میں بھلورے لے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

جواد دو لہا بنا بیٹھا تھا، حرم اس کے برابر براجمان تھی۔ جواد کا چہرے تاثر تھا، وہ جی بنی حرم کو دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی، جبکہ زبیدہ بیگم بہو کی بلائیں لیتے نہیں تھک رہی تھیں۔ ان کے ہر اک انداز میں دلہانہ محبت پنہاں تھی۔ جواد نہایت کوفت میں جھلا تھا، ماں کو بہو پر واری صدمے جاتا دیکھ کر اس کی چشمانی میں لکیروں کا جان بن آیا تھا (کیا جاتا اگر حرم کی جگہ میری من پسند

ناسازی طبیعت میں پھول لے کر آئی تھی اُسی کی بات کر رہے ہونا؟“ زبیدہ بیگم کا انداز استغما میہ تھا۔ انہوں نے بیٹے سے تصدیق چاہی تھی۔
”جی امی.....“ جواد نے تائیدی لہجے میں جواب دیا تھا۔

”اسی وقت سے کھٹک رہی تھی وہ مجھے تجھے اپنے چال میں پھنسا لیا، شکل سے ہی چالاک لگ رہی تھی۔“ زبیدہ بیگم کے انداز میں نفرت تھی، ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے جو ادانگشت بدنماں رہ گیا، اس نے ماں کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔
”امی وہ بے حد اچھی لڑکی ہے۔“ اُس نے ایک بار پھر انہیں منانے کی سعی کی تھی۔

”مگر وہ مجھے ذرا بھی پسند نہیں ہے، میں آج ہی تمہارا رشہ حرم سے طے کر آئی ہوں، بہت پیاری اور نیک بچی ہے میری بھانجی۔“ زبیدہ بیگم کا انداز غمزہ تھا۔
”مگر میں نتاشہ کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گا۔“ جواد نے ہٹ دھرمی سے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے کر لو اس سے شادی، اگر تم نے اس سے شادی کی تو میرا برا ہوا چہرہ دیکھو گے۔“ زبیدہ بیگم ہتھے سے اکھڑ گئی تھیں جواد کے لیے یہ سب برداشت کرنا بے حد مشکل تھا، وہ شعلے برسائی آنکھوں سے اُسے گھورتے تن فن کرتی اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھیں۔ جواد نے بند دروازے کو دیکھ کر بے اختیار مٹھیاں سمجھ لی تھیں۔

☆.....☆.....☆

جواد کو آتا دیکھتے ہی نتاشہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیگر اسٹاف کی توجہ اپنے کام پر مرکوز تھی۔ جواد نتاشہ کو بے حد الجھا بھرا لگا تھا۔
”کیسے ہو جواد؟“ نتاشہ کے انداز میں اپنائیت تھی۔

”ٹھیک ہوں۔“ جواد نے نظریں چرائی تھیں اور اپنی سیٹ کی جانب بڑھا تھا۔

”ٹھیک لگ تو نہیں رہے۔“ نتاشہ اس کے پیچھے آئی تھی۔ جواد نے اپنی نشست سنبھالی تھی اور نتاشہ کو دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

جواب دیا تھا۔ عین اسی وقت دروازہ بجے گا تھا۔ پاؤں میں چپل اڑتے زبیدہ بیگم نے دروازے کا رشتہ کیا تھا۔

”کون ہے؟“ زبیدہ بیگم نے دروازہ کھولتے سے قبل نووارد سے استفسار کیا تھا۔

”خالہ دروازہ کھولیں میں جواد کا دوست ہوں۔“ آنے والے نے نہایت محل سے جواب دیا تھا۔

زبیدہ بیگم نے جیسے ہی دروازہ وا کیا، چھ سرت لڑکے گھر کے اندر داخل ہو گئے، ایک لڑکے نے انیس اس قدر بری طرح سے دھکلا تھا کہ وہ اپنا توازن قائم نہ کر سکیں اور بری طرح دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑیں۔ سر بری طرح ٹکرانے کی وجہ سے وہ بالے ہوش ہو چکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

ہسپتال کے کمرے میں زبیدہ بیگم بے ہوش بڑی تھیں جواد خاصا پریشان تھا۔ شکلیہ بیگم اور مظہر احمد بھی مضطرب کھڑے تھے۔ اسی وقت زبیدہ بیگم کو ہوش آیا تھا، انہوں نے بوجھل آنکھوں سے باری باری سب کو دیکھا تھا مگر حرم انہیں بھی نظر نہ آئی تھی۔

”میری حرم بیٹی کہاں ہے؟“ زبیدہ بیگم نے دکھتے سر کو پلڑے بہت دقت سے استفسار کیا تھا۔ شکلیہ بیگم نے فوراً ہی زور و شور سے رونانا شروع کر دیا تھا، زبیدہ بیگم کے سوال کا جواب کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

”سب لوگ باہر جائیں مریف کو رو کر پریشان نہ کریں، وہ پہلے ہی خاصی ڈپریشن میں ہیں۔“ زبیدہ بیگم کو نیند کا گلشن لگاتی نرس نے معمولی جھکی سے کہہ کر سب کو باہر بھیج دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جواد ہسپتال کے ریسیپشن میں بیٹھا تھا مگر آپ کا ذہن کہیں اور ہی پرواز کر رہا تھا، اس کا دماغ مستحق ہچکچاہٹوں کی زد میں تھا۔ ناپسندیدہ ہستی ہی سہی، عمروہ بھی تو اس کی بیوی، کچھ دنوں کا ہی ساتھ رہا تھا۔ عمروہ اس کے نام سے منسوب تھی، وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ اسے حرم کی فکر تھی، وہ پولیس میں رپورٹ بھی درج

لڑکی متاثرہ موجود ہوتی تو (رہ رہ کر وہ یہی سوچے جا رہا تھا اور حرم پر اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

شادی ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ جواد محن میں موجود واٹس مین میں نصب آنے کے سامنے شیو بنا رہا تھا، حرم کو بچن سے جانے کی ٹرے لیے لکھتا دیکھ کر اسے کوفت محسوس ہوئی تھی۔

”خالہ چائے۔“ حرم نے تخت پر بیٹھی زبیدہ بیگم کے آگے چائے رکھی تھی۔

”میری بچی دو دن بھی نہیں ہوئے تھے اس گھر میں آئے ہوئے اور کام کرنے لگی مجھے تو کسی کام میں ہاتھ ہی لگانے نہیں دیتی جیتی رہو میری بچی۔“ حرم کے سر پر ہاتھ رکھتے زبیدہ بیگم نے وارفتگی سے کہا تھا۔

”خالہ جان آپ کی عمر کام کرنے کی نہیں بلکہ آرام کرنے کی ہے۔“ حرم نے ان کے پیر دباتے ہوئے محبت سے کہا تھا۔

”میری بچی مجھے معلوم تھا اسی لیے تو میں تمہیں بیاہ کر لائی ہوں، نکلے نکلے کی نوکریاں کرنے والیوں کو خوب جانتی ہوں لڑکوں کو اپنے جال میں پھنسا کر گھر میں آ جاتی ہیں اور لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اپنی تو آخر پائی ہی ہوتی ہے۔“ جواد پر ایک کاٹ دار نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے طنز کیا تھا۔

جواد کو شے میں ماں کا واضح عکس نظر آ رہا تھا، اس نے جھلا کر ریزر رخساروں پر پھیرا تھا، غلٹ کی وجہ سے گہرا کٹ آ گیا تھا۔ رخساروں سے ذرا نیچے نکلنے خون کو وہ لمس دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”حرم جواد ب آئے گا بیٹا؟“ زبیدہ بیگم کو کچھ دیر قبل ہی نماز عشا سے فارغ ہوئی تھیں، وہ تخت پر لیٹی بیچ پڑھتے ہوئے حرم سے استفسار کر رہی تھیں، جو بچن میں رات کے لیے ساکن تیار کر رہی تھی۔

”خالہ آج ان کو دیر ہو جائے گی، صبح بتا کر تو گئے تھے۔“ حرم نے نرمی سے جواب دیا تھا، مگر آواز میں کی گھبراہٹ بھی تھی۔

”اچھا بیٹا.....“ زبیدہ بیگم نے آنکھیں موندے

غزل

بیار دل میں میرے رہا ہی نہیں
تجھ سے ملنے کا حوصلہ ہی نہیں

ڈھونڈتا ہے وہ جس ڈگر پہ مجھے
وہ مرے گھر کا راستہ ہی نہیں

جس کو اک بار ہم نے چھوڑ دیا
اُس سے پھر رکھا رابطہ ہی نہیں

دل لگاتا پھرے کسی سے بھی
اب ہمیں اُس سے واسطہ ہی نہیں

اُس نے پھیری ہیں اس طرح نظریں
جیسے وہ مجھ کو جانتا ہی نہیں

کوئی مظلوم مر بھی جائے اگر
کوئی بھی اُس کو دیکھتا ہی نہیں

ذہن نے تو بھلا دیے وعدے
دل گھگھتے کا ماننا ہی نہیں

شگفتہ شفیق

کروا چکا تھا اور اسے اتنے تئیں بھی تلاش کرنے کی ہر
ممکن کوشش کر ڈالی تھی، مگر اس کا کہیں اتنا پتا نہ تھا
بظاہر وہ ایل ای ڈی میں نیوز چینل دیکھ رہا تھا، مگر اس
کی سوچ کا محور حرم ہی تھی۔ اسی اثناء میں اس کا موبائل
فون بج اٹھا اسے تھانے سے کال موصول ہوئی تھی۔
”السلام علیکم!“ کال پک کرتے ہی جواد نے
سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام! مسٹر جواد میں ایس ایچ او اظہر بات
کر رہا ہوں، آپ نے اپنے گھر میں ڈبیتی کی واردات
اور اپنی اہلیہ کے اغواء کا مقدمہ درج کروایا تھا۔“ انداز
پیشہ وارانہ تھا اور تصدیقی لہجے میں استفسار ہوا تھا۔
”جی ایس ایچ او صاحب۔“ جواد نے اکتے
ہوئے حاشی بھری تھی۔

”وہ ڈبیتی کروائی گئی تھی سارا منصوبہ آپ کی
اہلیہ اور ان کے آشنا زاہد کا تھا اور اس زاہد نامی شخص
نے آپ کی اہلیہ سے تمام زیورات چھین لیے اور اُسے
گولی مار کر فرار ہو گیا، فی الحال پولیس اس کے تعاقب
میں ہے، جبکہ اس کا ایک ساتھی ارشد ہماری تحویل میں
ہے۔ دوران ریماڈر اس نے ہمیں تمام تفصیلات سے
آگاہ کیا ہے آپ تھانے آ کر مزید معلومات حاصل
کر لیں۔“ ایس ایچ او نے تمام تفصیلات جواد کے
گوش گزار کر کے فون بند کر دیا تھا۔ یہ تمام تفصیلات
سن کر وہ کم م م بیشارہ گیا تھا، جیسے اسے اپنی ساعتوں پر
یقین نہ آیا ہو۔

☆.....☆.....☆

زبیدہ بیگم تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اُن کے چہرے پر
نداہت کے گہرے سائے تھے، نٹاشا ان کی مزاح پر سی
کے لیے آئی تھی۔ وہ متواتر اسپتال میں بھی ان کی
تیمارداری کرتی رہی تھی۔ وہ نٹاشا کو اس طرح خدمت
کرنا دیکھ کے زار و قطار روئے لگی تھیں۔

”اماں جی ایسے کیوں رو رہی ہیں؟“ انہیں
سوچ پلائی نٹاشہ نے پریشانی سے استفسار کیا تھا۔

”میں تم دونوں کی گناہ گار ہوں بیٹا، ہو سکے تو
مجھے معاف کر دینا۔“ زبیدہ بیگم نے نٹاشہ کے آگے
ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

گھر کے مالی حالات کی وجہ سے مجھے باہر نکل کر رہنا پڑا۔ کرنے کی ضرورت پیش آئی، ورنہ میں کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالتی یہ جب میری مجبوری تھی۔ تانی نے طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، میری ٹیوشن کی آمدنی سے میرا ان کی اتنی ہنگامی ادویات نہیں لاسکتی تھی۔“

نتاشہ نے اپنا آپ کھول کر بیان کر دیا۔ تہہ زبیدہ بیگم کو نتاشہ کے حالات جان کر گہرا رنج ہو گیا اور انہیں اپنا وقت یاد آیا تھا جب ان پر بیوی کی پوری توجہ تھی تو انہوں نے بھی چار دیواری سے باہر قدم نہ نکالا تھا، انہیں نتاشہ کے متعلق اپنی سابقہ سوچ پر بے طرح شرمندگی ہوتی تھی۔

”بیٹا! مجھے معاف کر دینا، میں نے تمہارا دل دکھایا، میں جلد ہی اس سلسلے میں تمہاری تانی امی سے ملاقات کروں گی۔ انشاء اللہ اب تم اور تمہاری تانی ہمارے ساتھ اسی گھر میں رہیں گی۔“ زبیدہ بیگم نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے یقین دلایا تھا۔

نتاشہ نے نشکر بھری نظروں سے زبیدہ بیگم کو دیکھا تھا۔ جو ادکچھ وقت پہلے ہی گھر آیا تھا، ماں کے الفاظ اس نے بخور سنے تھے۔ یہ سن کر جو اد بھی قدرے مطمئن ہوا تھا، اُسے اپنے دل سے اک بھاری بوجھ سرکٹا ہوا محسوس ہوا تھا اس کی دلی آرزو یوں پوری ہوئی، اسے تو گمان تک نہ تھا۔ اسے نتاشہ کی کبھی ہونے بات یکدم یاد آئی تھی۔

”بڑوں کی رضا میں راضی ہو جاؤ یقیناً اسی میں ہماری بھلائی پوشیدہ ہوگی۔“ اس نے مسکراتی نگاہ نتاشہ پر ڈالی تھی جو ہلے ہلے زبیدہ بیگم کا سر دبا رہی تھی اور وہ نیند کی گہری وا دیوں میں جاھونے لگی۔ زبیدہ بیگم پر چار ڈڑالتے اس نے اسے مہر کا ریش کیا تھا۔ اسے اب شدت سے زبیدہ بیگم کی آمد کا انتظار تھا۔ اسے یقین تھا جو اد کی ہمراہی میں وہ ایک پُر مسرت زندگی بتائے گی اس کی بدلتی قسمت نے اسے خوشی سے سرشار کر دیا تھا۔ اور پھر بس دور و بعد ہی نتاشہ کا انتظار بھی ختم ہو گیا تھا۔ زبیدہ بیگم نے موسم بہار کے موسم کی صورت اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔

☆☆.....☆☆

”اماں جی آپ تو شرمندہ کر رہی ہیں جو ہوتا ہے اللہ کی رضا سے ہوتا ہے، آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں، آپ تو بالکل میری امی جیسی ہیں۔“ نتاشہ نے ان کے جڑے ہاتھوں کو نرمی سے کھولتے ہوئے انہیں حوصلہ دیا تھا۔

”نہیں بیٹا! میں غلط تھی، میرا انتخاب غلط تھا، جو اد کی خوشی کا خیال کر لیتی تو شاید حرم بھی جسے پسند کرتی تھی اسی سے شادی کر لیتی، تمہارا بھی نقصان نہ ہوتا، سب میری وجہ سے ہی ہوا ہے۔“ زبیدہ بیگم سخت نام نظر آ رہی تھیں۔

”اماں جی آپ فکر نہ کریں میرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا، اور جہاں تک بات حرم کی ہے اگر وہ شخص حرم سے محبت کرتا تو کب کا اس سے شادی کر لیتا اور ایسی بے دردی کے ساتھ اسے موت کے گھاٹ تو نہ اتار دیتا۔ حرم نے جو کچھ کیا وہ نادانی میں کیا، وہ جسے اپنا رہبر سمجھ رہی تھی وہ راہزن نکلا، آپ خود کو مورد الزام نہ ٹھہرائیں۔“ نتاشہ نہایت ہلکے پھلکے انداز میں انہیں سمجھا رہی تھی۔

”ہم نادان لوگ اکثر اوقات جسے اپنا رہبر تصور کیے ہوتے ہیں وہ دراصل رہبر کے لبادے میں راہزن ہوتے ہیں اور ہمیں اس بات کا گمان تک نہیں ہوتا کہ رہبری کے سائے میں نہیں دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ جب محبت و اعتبار کا بت پاش پاش ہوتا ہے تب حقیقتوں کا درہم پر وا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس وقت ہمیں ہماری اوقات پتا لگتی ہے، اور اس وقت ہمارے پاس کوئی جانے پانا نہیں ہوتی سوائے اللہ کے بے شک اللہ نہایت رحم کرنے والا ہے۔“

زبیدہ بیگم پر بھی نتاشہ کے سمجھانے کا اثر ہوا تھا اور اب وہ خاصی پُر سکون نظر آ رہی تھیں۔

”بیٹا میں تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہوں۔“

زبیدہ بیگم نے نتاشہ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

”میری تو فیملی ہی نہیں ہے میری پیدائش کے ایک ماہ بعد ہی امی ابو ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کر گئے تھے، مجھے تانی امی نے بالائے میں انہی کے ساتھ رہتی ہوں، فیملی کے نام پر آگ عدد تانی ہی ہیں۔“

دوری عبرت از کہانی چھوٹی سے

انجام تو کبھی تھا

نیم قطر تین کی خیال

صرف شیطان کی دوستی کے سبب
یہ اپنے خالق سے کفر کرتا ہے

عبدالغفار عابد

برتن تیار ہو جاتے تو پھر ان کو پکانے کے لیے بھٹی کا
اہتمام کیا جاتا۔ جسے مقامی زبان میں 'آدی' کہتے ہیں
یہ آدی زمیندار مہر شاہ دین کی زمین پر بنائی جاتی تھی
آدی کو جلانے اور برتنوں کو پختہ کرنے کے لیے
جانوروں کے گوہر کی تھاپاں اور لکڑی وغیرہ مہر شاہ
دین کے ڈیرے سے حاصل کی جاتی اور پھر جب برتن
پک کر تیار ہو جاتے تو ضرورت کے مطابق کچھ برتن
مہر شاہ دین کی حویلی میں بھی پہنچائے جاتے اسی طرح
اردگرد علاقے کے گھروں میں برتن دیے جاتے
بدلے میں پیسے یا گندم لی جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

دینو کہہاری بیوی بر دین اور بیٹی بشری مہر شاہ
دین کی حویلی میں کام کرتیں جبکہ بیٹا رشید اسکول سے
آنے کے بعد باپ کا ہاتھ بنا تا اپنے ذاتی کام سے
فارغ ہو کر دونوں باپ بیٹا مہر شاہ دین کی حویلی کی
صفائی کرتے، مہمانوں کے لیے کھانا لانا بھی ان کی
ڈیوٹی تھی، دینو کہہارا اپنی زندگی سے پوری طرح مطمئن
تھا۔ مگر اس کا بیٹا رشید اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔
وہ میٹرک میں پہنچا تو اس کی خواہشات کا دائرہ وسیع
ہونے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرے پاس بھی بہت ساری

رشید ایک معمولی سرکاری آفیسر تھا جو اپنے سینئر
آفیسروں کا اعتماد حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب
ہو گیا۔ وہ آفیسروں اور ایجنٹوں کے درمیان ڈیل
کرا کے اپنا کمیشن وصول کرتا، دولت کے نشے نے
اُسے حیوان بنا دیا تھا۔ جیسے غریب کے گھر سے سکھ، بیوہ
کے مکان سے روغن اور جموٹے کے چہرے سے نور
ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اُس کا
دل انسانیت سے خالی ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں ہر رائی کی
ایک حد ہوتی ہے، جب آدی وہ حد عبور کرتا ہے تو
زوال کی سرزمین کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی
رشید کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

دینو کہہارا دوی کنارے ایک چھوٹی سی نما مکان
میں رہتا تھا، وہیں پر اس نے مٹی کے برتن بنانے والا
'چاک' لگا رکھا تھا۔ یہاں اُسے اس کام کی پیرسولت
حاصل تھی۔ اعلیٰ معیار کی مٹی دریا سے مل جاتی، جب
پانی کناروں سے ٹکرا کے واپس ہوتا تو پختہ چلی مٹی کے
ڈھیر چھوڑ جاتا، دینو کہہارا مٹی کو اکٹھا کرتا اور پھر
اچھی طرح گوندھنے کے بعد 'چاک' پر چڑھا کر مختلف
برتنوں کی شکل میں ڈھال لیتا، جب کافی تعداد میں

نوکری دلا دیں اور پھر سفارش سے رشید کو ایک سرکاری محکمے میں اس کی قابلیت سے زیادہ کی ملازمت مل گئی اور پھر جلد ہی رشید نوکری کے سارے گریسکھ گیا اور رشوت سے جیبیں بھرنے لگا۔ گھر میں روپے پیسے کی ریل چیل ہونے لگی تو سب سے پہلے اس نے اپنے باپ کے برتن بھانے کا کام بند کروایا اور اس جگہ کو چھوڑ کر کسی اور علاقے میں شفٹ ہو گیا کچھ عرصہ کرائے کے مکان میں رہا، اس دوران رشید نے دس مرلے کا پلاٹ خرید کر خوبصورت کوٹھی بنوائی اور مستقل طور پر وہاں رہائش اختیار کر لی۔ رشوت کی ریل چیل نے اُس کی حیثیت ہی بدل دی تھی۔

☆.....☆.....☆

رشید نے آسیہ نامی ایک لڑکی سے پسند کی شادی کی تھی۔ آسیہ ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری کرتی تھی۔ اُسے پیسا اور شہرت حاصل کرنے کا جنون تھا۔

دولت ہو جس طرح ہم مہر شاہ دین کی حویلی میں کام کرتے ہیں اسی طرح ہمارے گھر میں بھی نوکر ہوں جب وہ اپنی خواہش کا اظہار اپنے باپ سے کرتا تو وہ اسے سمجھاتا کہ..... ”بیٹا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، تم اونچے محلوں کے خواب نہ دیکھا کرو، میں نے بھی ایسے بہت سنے دیکھے تھے، سبھی تعبیر سے خالی نکلے جس طرح میں اپنے غریب باپ کا بیٹا تھا اسی طرح تم بھی غریب باپ کے بیٹے ہو اپنے کام میں دلچسپی رکھو میرے بعد تم نے یہی کام کرنا ہے۔“

☆.....☆.....☆

مقامی اسکول سے رشید نے امتیازی نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اُسے مزید پڑھانے کی دینو کہہ کر اسے کت نہ تھی، اُس نے مہر شاہ دین کی منت کی کہ آئے دن آپ کے ڈیرے پر دُزیر، فخر اور دیگر افسران آتے رہتے ہیں آپ میرے بیٹے کو کہیں



☆.....☆.....☆

وقت گزرنے کے ساتھ رشوت خور افسران نے درخت کی شاخوں پر موجود چوٹوں کی طرح رشید پر سایہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ ایجنٹ اور افسران کے درمیان رابطے کا کام سرانجام دیتا اور اپنا حصہ وصول کرتا۔ رشوت خور آفیسر اکثر رشید کے گھر کی رونق بڑھانے آتے آئے روز ان آفیسروں کے اعزاز میں پارٹیاں منعقد ہوتیں، شراب، شباب کا جی بھر کر اہتمام اور استعمال کیا جاتا، ساری رات شور و غل میں گزر جاتی، اب تو ان پارٹیوں میں جسم فروش تیلیوں نے حصہ لینا شروع کر دیا تھا آفیسر اس موجِ طیلے میں خوب لذت انداز ہورہے تھے، ہر ہفتے کے اختتام پر ایک شاندار پارٹی کا اہتمام ہوتا ناجائز کام کروانے والے پارٹی کی خوب رونق بڑھاتے، وقت گزرنے کے ساتھ رشید نے محسوس کیا کہ ایجنٹ تو مجھ سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں۔ یہ سوچ آتے ہی اس نے ایجنٹ کے فرائض بھی خود ادا کرنے شروع کر دیے۔ پسا انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے رشید اور اس کی بیوی آسہ کو بس پسا چاہیے تھا۔ اس پسی کی خاطر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے اور پھر اسی حوالے سے رشید اور اس کی بیوی نے راتوں رات لاکھوں کی وصولی کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ڈاکٹر صاحب! امیری بیوی کے پیٹ میں سخت تکلیف ہے اسے فوراً اپنے اسپتال میں داخل کر کے ٹریٹمنٹ کریں۔“ رشید ایک منصوبے کے تحت اپنی بیوی کو ایک اسپتال کے مالک مشہور ڈاکٹر کے حوالے کر کے چلا گیا تھا۔ رات کو آسہ نے اپنے پرائیویٹ روم میں ایک مخصوص جگہ خفیہ کیمرا فٹ کیا اور شدید درد کی آہیں گیتنگ کر کے چیخنے چلانے لگی۔ نرس وغیرہ بھاگ کر آئے تو انہیں کہا کہ ڈاکٹر کو بھیج مجھے بہت سخت تکلیف ہے جو صرف ڈاکٹر ہی دور کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کمرے میں آئے تو مریف نے کو آرام آنا شروع ہو گیا کچھ دیر بعد ہی وہ کافی حد تک سنبھل کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پھر چاک ڈاکٹر کو بھیج کر اپنے ساتھ بٹھالیا اور

اُن کے ساتھ اوٹ پناہگ حرکتیں کرنے لگی، ڈاکٹر اُس کی حرکتیں دیکھ کر گھبرا گیا بڑی مشکل سے جان بچا کر کمرے سے باہر آیا۔ جبکہ آسہ کے کیمرے میں یہ سب مناظر ریکارڈ ہو گئے تھے۔ اسی رات آسہ نے اپنے شوہر رشید کو فون کیا تھا کہ ہمارا کام ہو گیا ہے، آپ مجھے صبح آ کر لے جائیں۔“ اور اگلی صبح رشید اپنے دو جعلی ویڈیوز بنانے کے باہر دوستوں رئیس اور انعام کے ساتھ اسپتال آیا۔ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر گھر آ گیا، گھر آتے ہی کیمرے میں موجود مواد سے بھرا پھیری کی اور یوں ڈاکٹر کو بلیک میل کرنے کا منصوبہ مکمل ہو گیا۔

ایک ہفتے بعد رشید اپنے چند دوستوں کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس اسپتال آیا اور تنہائی میں ملنے کو کہا۔ ڈاکٹر نے اُن کو الگ کمرے میں بٹھایا، چائے پانی وغیرہ سے خدمت کی رشید نے اپنی جیب سے سو بائبل نکالا اپنی بیوی کی فحش فلم چلا کر سو بائبل میز پر ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیا۔ یہ سب دیکھتے ہی ڈاکٹر کے تو اوسان خطا ہو گئے تھے۔

”اگر یہ سارا مواد ہم میڈیا والوں کو دے دیں کہ تم اپنی خواتین مر ایضاؤں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو۔ تو بتاؤ تمہارا اور تمہارے اسپتال کا کیا بنے گا؟“ ان جھوٹوں کی بنا پر ہم تمہارے خلاف پولیس میں کیس دائر کرنے کا حق بھی رکھتے ہیں۔ تم اگر اپنی بہتری اور روشن مستقبل ڈاکٹری کے شیعہ کو یو بی جاری و ساری رکھنا چاہتے ہو تو پندرہ لاکھ روپے دے دو، ہم یہ سارا مواد تمہیں کو دے کر یہ قصہ ہمیں ختم کر دیں گے۔“

ذوقی ناؤ کو کنارے لگانے اور آنے والی مشکلات سے بچنے کے لیے ڈاکٹر نے فوری طور پر رشید اور اس کے ساتھیوں کو پانچ لاکھ روپے نقد بینک سے نکلا کر دیئے اور باقی دس لاکھ کے لیے ایک ہفتہ کا وقت مانگا۔ رشید نے بڑی زحمتی کام مظاہرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کو دس دن کا وقت دے دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اُن لوگوں کے روانہ ہونے کے بعد ڈاکٹر سخت پریشانی کے عالم میں اس مصیبت ناگہانی سے نجات کا راستہ سوچتا رہا، ڈاکٹر کا ایک بھائی وکیل تھا اُس نے بھائی کے ساتھ براہ راست بات کرنے کے بجائے

غزل

اک خواب ہے، اس خواب کو کھونا بھی نہیں ہے
تعبیر کے دھاگے میں پردنا بھی نہیں ہے

لپٹا ہوا ہے دل سے کسی راز کی صورت
اک شخص کہ جس کو برا ہونا بھی نہیں ہے

رکھنا ہے سر چشمِ اسے ساکت و جامد
پانی میں ابھی چاند بھگونا بھی نہیں ہے

ہر چند ترے نقشِ کفِ پا میں ہے لیکن
یہ دل کسی بچے کا کھلونا بھی نہیں ہے

وابستہ ہے مجھ سے کہ تُو ہے بھی کہ نہیں ہے
جب میں نہیں تجھ میں، ترا ہونا بھی نہیں ہے

یہ عشق و محبت کی روایت بھی عجب ہے
پایا نہیں جس کو، اُسے کھونا بھی نہیں ہے

جس شخص کی خاطر ترا یہ حال ہے خاد
اُس نے ترے مرجانے پہ رونما بھی نہیں ہے

ایوب خاور

بھائی کے دوست ایک دوسرے وکیل سے یہ بات کی
اُس نے فوراً ڈاکٹر کے بھائی کو تمام معاملہ بتایا تھا۔

تمام وکیل سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اس مسئلے کو کس طرح
حل کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ
ٹوٹے، اگر تو اُسے ہلا کر مار پیٹ کی جائے تو وہ حالات و
واقعات سے مکر جائے گا۔ منصوبہ ایسا بنایا جائے کہ اُس کا
بچ کر نکلنا مشکل ہو جائے، آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ رشید کو
کلینک بلایا جائے کہ اپنے بقایا دس لاکھ لے جاؤ اور جب
اس کو پیسے دیے جائیں تو ویڈیو بنانی جائے پھر بلیک
میلنگ کا کس درج کر دیا جائے۔

پر ڈراما کے تحت اگلے دن ڈاکٹر نے رشید کو فون
کیا کہ اپنے بقایا دس لاکھ لے جاؤ۔ دوسرے دن رشید
کے آنے سے قبل پانچ وکیل ڈاکٹر کے کمرے میں
آ کر پردوں کے پیچھے چھپ گئے۔ رشید آؤ ڈاکٹر سے
سلام دعا کی اور پیسے مانگے ڈاکٹر نے میز کی دراز سے
پیسے نکال کر رشید کو دیے۔ ابھی وہ پیسے گن ہی رہا تھا
کہ پردوں کے پیچھے چھپے وکیل باہر آ گئے پہلے تو اُس
سے روپوں کے بارے میں پوچھا۔

”یہ کس سلسلے میں لیے ہیں۔“ ڈاکٹر نے فوراً ہی بتا دیا
کہ یہ رقم کس سلسلے میں لی اور دی جا رہی ہے۔ بس اتنا سننا
تھا کہ وہ رشید پر ٹوٹ پڑے مار مار کر اس کا بھر کس نکال دیا
تھا۔ رشید پاؤں جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا۔

”میری گاڑی اور یہ پیسے بھی رکھ لو دس لاکھ
پینک اکاؤنٹ میں پڑے ہیں وہ بھی نکھو کر دیتا ہوں
مجھ سے لکھو لو کہ میں اپنی مرضی سے دے رہا ہوں
لیکن مارنا بند کر دو اور تھانے میں رپورٹ درج نہ
کروانا۔“ مگر وہ اِس ناسور کو ہمیشہ کے لیے معاشرے
کے جسم سے کاٹ دینا چاہتے تھے۔ جب مار مار کر
تھک گئے تب تھانے فون کیا۔

پولیس آئی اور رشید کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔
دورانِ گفتیش رشید نے کتنے ہی گناہوں کا اعتراف
کیا تھا۔ اس کے خلاف باقاعدہ کیس رجسٹرڈ کر کے
عدالت میں پیش کیا اور پھر جلد ہی اُسے سزا بھی ہوگی
اور جیل بھیج دیا گیا۔

☆☆.....☆☆

تیسری عبرت از کہانی ملتان سے

عذاب آیا تو ایوں آیا

اساتھ کنول کا شہر

ہوس نے بنائی ہیں سب داستائیں
ایسی راہ میں لوگ پاگل ہوئے ہیں

مجید احمد جانی

جکڑ دیا۔

سلطان اپنے علاقے، گاؤں کا امیر ترین سلطان لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ ڈرتے تھے اس کے نام کی طرح اس کا رُوب تھا۔ اس کی مربیوں زمینیں تھیں۔ دولت کی ریل چل تھی، اور یہ قدرتی امر ہے جس کو اللہ تعالیٰ دولت سے مالا مال کر دے، وہ بمشکل اسے سنبھال پاتا ہے۔ اکثر کوپڑی سے اترتے دیکھا ہے۔ دولت کو درست استعمال کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ دریا عذاب کا دریا اس میں جو ڈوب جاتا ہے وہ ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ لیکن جس نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا وہ سُرخرو ہوتا ہے ورنہ زمانے نے بڑے بڑے دولت مند فنا ہوتے دیکھے ہیں۔

دولت کا نشہ شراب سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ انسان اس کے نشے میں ڈوب کر غرور، تکبر کے آخری اَنج پر پہنچ جاتا ہے۔ دولت زہری تو ہے جو رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے اور پھر انسان کو عقل و شعور سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ اُس کی دُنیا اور آخرت برباد کر دیتا ہے۔ آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھ جاتی ہے کہ پھر نیکی کا راستہ نظر نہیں آتا۔ انسان دولت سے ہر

وہ بہت شور شرابے اور مارا ماری کے بعد یکے فرس پر بیٹھا اپنی اُنکلیوں سے زمین پر اُلٹی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ بندھے اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ اُس کا چہرہ اجاز باغ کی طرح ویران تھا۔ سر کے بال آپس میں کسی جال کی طرح اُلٹھے ہوئے تھے شیو بڑھی ہوئی تھی اور لباس بھی میل کچیل سے اٹا ہوا تھا۔

یہ پاگل خانے کی بیرک ہے، جس کی سلاخوں کے پیچھے یہ شخص قید بیٹھا ہے۔ سلاخوں کے پیچھے قید ہونے کے باوجود اُس کے ہاتھ، پاؤں جکڑے ہوئے ہیں کیونکہ یہ وحشی پاگل شخص ہے۔ اس کی حالت اچانک بگڑ جاتی ہے اور پھر پیٹھے پیٹھے اٹھ بھاگتا ہے اپنی بیرک میں دوسرے پاگلوں کو مارنے لگتا ہے۔ دانتوں سے کانٹے لگتا ہے۔ پاگل خانے کے عملے نے مجبوراً اسے بیڑیوں میں جکڑ دیا ہے۔ سلطان نامی اس قیدی کی زندگی کی روداد بہت عجیب اور عبرت آمیز ہے۔ اس بیرک میں آئے ہوئے اسے تیسرا دن ہے۔ اب شام ڈھلنے کو ہے، یہ دو روز پہلے صبح دس بجے کے قریب یہاں لایا گیا تھا۔ سارا دن اس نے اُدھم چائے رکھا پھر یہاں کے عملے نے اسے زنجیروں میں

تھا۔ بہت رحم دل اور انسانیت سے محبت کرنے والا تھا۔ اُس کی سخاوت اور دریا دلی کے پورے گاؤں بلکہ اُس پاس کے گاؤں تک چرچے تھے۔ غریبوں کی مدد کے لیے ہر دم تیار رہتا، جس کی کو کوئی بھی مجبوری ہوتی، مسئلہ ہوتا، وہ اُس کے پاس بے خطر و خوف چلا آتا اور اپنا مسئلہ حل کروا کر جاتا۔ چھوٹے بڑے کے لبوں پر اُسی کا نام رہتا اور وہ اللہ کا نام لیا کرتا۔ اُس کے دور میں گاؤں میں ہر سہولت موجود تھی اور گاؤں کا ہر مکین، غریب، کمی مین سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ سلطان کی ماں بہت پہلے فوت ہو چکی تھی، سلطان

چیز خریدنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنے منصب سے ہٹ کر خدا بننے لگتا ہے، تب وہی خدا ان کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

دوسری طرف ایک طبقہ وہ بھی ہوتا ہے، جو دولت کے نشے میں نہیں رہتا، وہ دولت کو حقیر سمجھتا ہے اور اس کو دامن میں نہیں بھرتا۔ دو وقت کے لیے روٹی کی جدو جہد میں مگن رہتا ہے، اور حق سچ کی باتیں کرتا ہے۔ وہ اپنے پاس کھونے سکے نہیں رکھنا چاہتا، جو کچھ رب دیتا ہے وہ اُسی کے نام پر لٹانے پر مگن رہتا ہے۔ سلطان کا باپ بھی ایسے ہی طبقے سے تعلق رکھتا



روکا تھا۔ بخشو کی بیٹی قرآن کی حافظ تھی۔ وہ گاؤں کے بچوں، بچیوں کو قرآن پڑھاتی تھی۔ اُس دن بھی بچیوں کو قرآن کا سبق دے کر اپنے گھر کو جا رہی تھی کہ اس خدیث عرفان نے راستا روک لیا تھا۔ یہ کیونکہ کنی دونوں سے بخشو کی بیٹی کے لیے مورچے لگائے ہوئے تھا اور اُس نصیبوں بیٹی کو یہ خبر نہ تھی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے لیکن بخشو کی بیٹی گھر نہ پہنچی تو ماں باپ کو گھر ہوئی۔ اُنہوں نے وہاں پتا کیا جہاں وہ بچیوں کو پڑھانے جاتی تھی لیکن جب یہ سنا کہ یہاں سے تو کب کی جا چکی ہے اُن کی فکریں بڑھ گئیں۔ انجانا خوف اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ دیوانگی میں وہ اپنی بیٹی کو ڈھونڈتے رہے اور پھر یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں والے بھی اس تلاش میں شامل ہو گئے۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا جب اُس کی لٹی پٹی لاش کھیتوں سے ملی تھی۔ جب قیامت برپا تھی۔

گاؤں بھر میں کہرام مچ گیا۔ سب کو یقین تھا کہ اس پاک دامن لڑکی کی عزت سے کھیلنے والے سلطان اور اُس کا ماموں زاد عرفان ہیں۔ مگر گاؤں والوں کو سنا بے سوچے گیا تھا کیونکہ وہ سلطان کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتے تھے۔ رو دھو کر خاموش ہو گئے تھے جبکہ بخشو اور اُس کی بیوی کے ہاتھ نیلے آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے اور لٹوں سے دُعا کر رہے تھے۔

”اے رحمان، ہماری بیٹی حیرتی ہی پاک کتاب، پاک کلام کی تعلیم دیتی تھی، اُس کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا ہے ہماری بیٹی کی عزت سے کھیلنے والوں کو عبرت کا نشان بنانے انہیں تباہ و برباد کر دے۔“

وقت کا سفر جاری رہا دن، ہفتوں، ہفتے مہینے اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ سلطان اور عرفان کی نظر میں عورت مرد کے پاؤں کی جوتی سے بھی لٹی گزری تھی۔ عورت تو صرف عیش و عشرت کے لیے بنائی گئی تھیں، سلطان کی بیوی ایمان شوہر کی اِن حرکات کے سخت خلاف تھی۔ مگر وہ اپنی جگہ مجبور تھی۔ اُس کی ایک نہ چلتی تھی۔ اکثر سلطان کو اِن کاموں سے منع تو کرتی مگر سلطان کب کان دھرتا تھا۔ سلطان

کا بچپن بہت عیش و آرام میں گزرا تھا۔ گھر میں ہر شے میسر تھی، کسی چیز کی کوئی کمی بیشی نہ تھی اور اُس کے ایک اشارے پر نوکر جا کر بھاگتے پھرتے تھے۔ لیکن حد سے زیادہ پیار بھی سچے کو بیگاڑ دیتا ہے اور اسی طرح سلطان بھی بگڑ گیا۔ وہ جو جوانی کی سیزم کی چڑھا تو اس کی شادی، اس کی چاچا زاد ایمان سے ہوئی۔

جس روز سلطان ذلہا بنا تھا اُس دن غریبوں، مسکینوں، کمی کین لوگوں کو نذر و نیاز سے خوب نوازہ گیا۔ درجنوں تیل ذبح ہوئے۔ انواع و اقسام کے کھانے پکے اور عام و خاص کو کھلائے گئے یہ دلہہ دو دن چلتا رہا اور اسی جشن میں موج و مستی کی تحفیلیں بھی جستی رہی تھیں۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد سلطان کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی۔

اور بچی کی پیدائش کے چھ ماہ بعد ہی سلطان کا باپ وفات پا گیا تھا۔ سلطان ماں باپ کا اکلوتا تھا اور اُس کی جائیداد میں کوئی شریک نہیں تھا۔

کہتے ہیں بزرگ گھر کی برکت ہوتے ہیں۔ سلطان کا باپ فوت ہوا تو تمام برکت اُٹھ گئی اور بڑائیوں نے اِس گھر کی راہ دکھ لی۔ شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا، سلطان اُس کے جاں میں پھنس چکا تھا۔ سلطان کی دوستیاں ایسے بُرے کردار کے لوگوں سے تھیں جو شراب کے رسیا تھے۔ ایسے میں سلطان کا ماموں زاد بھائی عرفان لندن سے لوٹ آیا تھا۔

عرفان وہاں کے آزاد ماحول میں پلا بڑھا تھا، جہاں خاندان کی کوئی روایت نہیں، جہاں ماں باپ، بہن، بیٹی کی تیز نہیں جہاں سچے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور شادیاں بعد میں ہوتی ہیں۔ جہاں عزت، عصمت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اِس گندے ماحول میں پلا بڑھا عرفان جب مشرق کی سر زمین پہ آیا تو یہاں کے خُسن کو دیکھ کر تو جیسے دیوانہ ہی ہو گیا۔

سلطان بھی کچھ اسی کردار کا مالک تھا، دونوں نے مل کر بے شرعی اور بے غیرتی کی انتہا کر دی تھی۔ ایک روز دن ڈیہاڑے عرفان نے بخشو کھار کی بیٹی کا راستا

تھا اور اُس کی بیٹی نیچے فرش پر مُردہ پڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اُس کے دماغ کی نیس پھٹنے لگیں۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں بیٹی کے لاشے پر گر پڑی تھی۔

جب سلطان کو ہوش آیا تو گھر کا نقشہ بدل چکا تھا۔ اُس کا شہین اُس کے ہاتھوں پر بادل ہو چکا تھا۔ تب اُسے ہوش آیا کہ یہ میں نے کیا کر دیا لیکن اُس وقت، پانی سر سے گزر گیا تھا۔ سلطان اپنے بالوں کو نوچنے لگا، خود کو مارنے لگا اور پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ وہ عقل و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔

یہ قدرت کا عذاب ہی تھا کہ اسی رات جب سلطان اپنے ڈیرے سے گھر کی طرف آیا تھا تو کہیں سے جنگلی وحشی کتوں کا غول ڈیرے پر آ گیا تھا۔ سلطان کا ماموں زاد عرفان اور اُس کے دوست وہاں نشے میں دھت پڑے تھے۔

کتوں نے اُن پر حملہ کر دیا اور اُن کو اپنا شکار سمجھ کر چرچہ بھاڑ کرنے لگے۔ اُن کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ کتوں سے مقابلہ کرتے اور اپنی جان بچا سکتے۔ چند گھنٹے پہلے عیاشیاں کرتے، ان درندوں کی لاشوں کے ساتھ وحشی جنگلی کتوں کا غول انصاف کر رہا تھا۔

ایمان ہسپتال میں تھی اور

گاؤں والوں نے سلطان کو پاگل خانے میں داخل کروا دیا تھا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے اُس کو نشانِ عبرت بنا دیا تھا۔

ایمان جو ہسپتال میں داخل تھی کچھ دنوں بعد صحت یاب ہو کر واپس گاؤں آ گئی ہے، لیکن اُس نے اُس بنگلے میں رہائش اختیار نہ کی، کیونکہ اُسے اُس جگہ سے خوف آتا ہے۔ اُس بنگلے کی جگہ اب درس گاہ بنی ہوئی ہے اور اُس میں بچوں کو پاک کتاب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایمان، بخشو اور اُس کی بیوی کے ہاں رہتی ہے اور سلطان کی زمینیں بخشو نے سنبھال رکھی ہیں۔ سلطان کی زمینوں کی آمدنی سے گاؤں والے فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

☆☆.....☆☆

تو گناہوں کی اس دلدل میں دھنستا ہی چلا جا رہا تھا۔ دوسری طرف گاؤں والے بھی خاموش تھے کیونکہ وہ غربت کی چکی میں پس رہے تھے پیارے دودھت کی روٹی کو ترستے تھے۔ پیٹ کا دودھ خراب نہیں تھا، اس فکر سے آزاد ہوتے تو دوسری طرف سوچتے۔ جن کو روٹی کے لالے بڑے ہوں وہ کربھی کیا سکتے ہیں۔

ایک شام سلطان کی بیوی ایمان شہر میں کسی عزیز کے گھر گئی ہوئی تھی اور اُس کی جو اس سال بیٹی گھر میں رہ گئی۔ اُس روز اُس کی طبیعت خراب تھی، سو ماں کے ساتھ شہر نہ گئی۔ نوکریاں شام ہوتے ہی اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں۔ قدرت خدا کی ادھر ایمان کو گھر آنے میں دیر ہو گئی اور سلطان ڈیرے کی محفل میں عیش کر کے گھر لوٹ آیا۔ اُس نے شراب پی رکھی تھی، اور نشے میں ڈھت تھا۔ شراب کا جادو تو سر چڑھ کر بولتا ہے اور یہ انسان کو ہر رشتے سے بیگانہ کر دیتا ہے، اپنے پرانے کی تیز نہیں رہتی یہاں تک کہ بیٹی، بہن، بیوی، ماں کی تیز مٹ جاتی ہے۔ سلطان گھر آیا تو گھر میں اُس کی بیٹی اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔

سلطان اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اپنی بیٹی کے کمرے کی طرف چلا آیا تھا۔ جب کمرے میں داخل ہوا تو اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں اپنی بیٹی بھی اُسے گاؤں کی الہز شاریگی اور اُس نے اپنی بیٹی کو ڈبوچ لیا۔ بیٹی، باپ کے بٹھنے میں تھی..... نہیں ایک عورت درندے کی قید میں تھی۔ سلطان اُس وقت باپ نہیں شکار تھا۔ اُس کی بیٹی اُس کے ہاتھوں اجڑ گئی، جو دوسروں کی بیٹیوں کی زندگیاں پر بادل کرتا تھا، اُس کی بیٹی اُس کے ہاتھوں پر بادل ہو رہی تھی۔

سلطان کی بیٹی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اُس کا باپ اُس کی یوں عزت داغ دار کر دے گا۔ جب عزت کا رکھو الا عزت کی دجھیاں اڑا دے تو زندگی جینے کا رنگ ڈھنگ مائل پڑ جاتا ہے۔ بیٹی نے باپ کے ہاتھوں پر بادل ہونے کے بعد خود کو دل میں چھری مار کر ہلاک کر لیا تھا۔

ادھر رات گئے جب بعد ایمان گھر لوٹی تو اُس کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ سلطان بیٹی کے بستر پر بے ہوش پڑا

چٹھی بہت ادا کہانی کر رہی ہے

چراغ تلے اندر میرا

ریاض خیر آبادی کا خیال

بڑے نیک صورت بڑے پاک باطن
ریاض آپ کو کچھ ہم ہی جانتے ہیں

نازیہ بتول رضا

”ارے کچھ سنا تم نے؟“ زینو کی اماں نے اپنی آنکھیں چند لمحوں پر انگلیاں جھاتے ہوئے قریب بیٹھی ہوئی عورتوں سے سوال کرنے سنسنی پھیلائی، ان کی یہ بات سن کر عورتیں کچھ اور قریب کھسک آئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ زینو کی اماں کے پاس ہمیشہ گاؤں کی نئی تازگی خبریں ہوتی ہیں۔ کس کا چکر کس سے چل رہا ہے، کس کی بہو زیادہ میکے میں رہتی ہے، کس گھر میں لڑائی جھگڑا چل رہا ہے یا کس کی شادی ہونے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اسی لیے اس وقت بھی عورتوں کے کان کھڑے ہونا فطری عمل تھا۔ اس وقت گرمی کی ستائی ہوئی زیادہ تر عورتیں گاؤں کے ایک چبوترے پر پھیل کے گھنے درخت کے سائے تلے براجمان تھیں اور بُرائی بُرائی کھیل رہی تھیں ہر ایک دوسری سے سبقت لے جانے پر تگی تھی۔ اور اب زینو کی اماں اک اور نئی تازگی خبر سنانے جا رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ چھوٹو کی اماں کو کھلبلی ہوئی۔

”ارے تم لوگوں کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے؟“ زینو نے کہا۔

”کیا ہوا؟“ چھوٹو کی اماں کو کھلبلی ہوئی۔

”ارے تم لوگوں کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے؟“ زینو نے کہا۔

”کیا ہوا؟“ چھوٹو کی اماں کو کھلبلی ہوئی۔

”ارے تم لوگوں کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے؟“ زینو نے کہا۔

”ہاں! ہاں تمہیں تو پتہ ہے میرے پیٹ میں کوئی بات زکتی کہاں ہے ضرور بتاؤں گی۔ اچھا اب میں تو چلی گھر میں زینو اکیلی ہے بچے مدرسے سے آتے ہوں گے۔“ زینو کی اماں کو اب قدرے سکون مل چکا تھا وہ صبح سے اس خبر کا بوجھ ڈھوئے پھر رہی تھی۔ اور اب گاؤں میں یہ خبر اڑا کر اسے چین مل گیا تھا اب اسے سکون کی نیند آتی تھی وہ دوپٹہ گلے میں ڈالتی اپنے گھر کو چلی اور یوں محفل برخواست ہوئی۔

☆.....☆.....☆

”زینو مجھے ایک گلاس پانی تو پلا بیٹی ٹھنڈا سا آف بہت گرمی ہے۔“ زینو کی اماں دوپٹہ اتار پینک پر لیٹ گئی زینو جو کسی سے موبائل پر بات کر رہی تھی جلدی سے کال کاٹ کر اماں کے لیے پانی لے آئی۔ اماں

”اے لو ہمارے برابر میں تو گھر ہے سلطانہ کا“ بھلا ہمیں ہی خبر نہیں ہوگی میری تو صبح چھ بجے ہی آنکھ کھل گئی تھی شور شرابے سے بہت رونا پینٹنا ہو رہا تھا بے چاری کے گھر میں زینو کی اماں کی بھی فجر کی اذان سے آنکھ نہیں کھلی ہوگی لیکن ایسی خبروں کی طرف ہر وقت کان لگے رہتے تھے ہر کسی کی ٹوہ میں رہنا اس کی عادت تھی۔

”پھر کچھ پتہ چلا کہ کہاں چلی گئی ہے؟“ چوتھی عورت جو بڑی دیر سے چپ بھی بولی۔

”ارے ابھی کہاں باپ بھائی بے چارے صبح سے بھاگ دوڑ میں لگے ہیں۔“ زینو کی اماں نے اطلاع دی۔

”اچھا کچھ پتہ چلے تو ہمیں بھی بتانا۔“



”اجھا اماں ابھی لائی چائے۔“ زینو مڑی تو اماں نے پھر پکار لیا۔

”اے سن زینو! شعیب کا کوئی فون دن دن آیا تیرے پاس سب خیریت ہے ناں وہاں؟“ شعیب زینو کا خالہ زاد اور منگیتز اور زینو کو پسند بھی کرتا تھا یہ رشتہ اُس کی پسند اور خالہ کی رضامندی سے ہی ہوا تھا۔ زینو نے بھی خاموشی سے منگنی کر لی تھی اور زینو کی اماں نہال تھیں کہ ان کی بیٹی کس قدر فرمانبردار ہے ماں کی مرضی میں ہی اُس کی رضا ہے۔“

”ہاں ہاں اماں روز بات ہوتی ہے میری سب ٹھیک ہیں خالہ کے گھر میں۔“ زینو نے بتایا تو اماں نے سکون کا سانس لیا، تھوڑی ہی دیر میں زینو چائے لے آئی تو اماں نے اُسے پھر سے موبائل پر مصروف دیکھا کچھ دیر دیکھتی رہیں پھر پوچھا۔

”کیا شعیب سے بات کر رہی ہے۔“ زینو نے چونک کر سر اٹھایا۔

☆.....☆.....☆

”آں..... ہاں اماں کیوں؟“

”نہیں نہیں میں تو ایسے ہی پوچھ رہی ہوں تو آرام سے بات کر۔“ اماں مطمئن ہو کر چائے پینے لگیں پھر خالی کپ رکھ کر اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے نکل پڑیں۔ آخر پڑوسیوں کی خبر گیری بھی تو کرنی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ جب سلطانہ کے گھر میں داخل ہوئیں تو گھر سائیں سائیں کر رہا تھا، ایک طرف پلنگ پر سلطانہ بے سندھ پڑی تھی شاید سو رہی تھی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں جیسے روتی رہی ہو سامنے ہی اس کی دونوں چھوٹی بیٹیاں تھیں زینو کی اماں کو دیکھ کر انہوں نے اسے سلام کیا۔ انہوں نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور رانی کے بارے میں معلوم کیا کہ اس کا کچھ پتہ چلا تو رانی سے چھوٹی نے جواب دیا۔

”ابا اور بھائی گئے ہوئے تو ہیں پر اب تک کچھ پتہ نہیں چلا اماں کی طبیعت بھی بہت خراب ہو گئی تھی ابا ہسپتال لے کر گئے تھے ڈاکٹر نے نیند کی دوا دی ہے۔“

نے غٹاٹ پانی پیا اور گلاس اسے تھماتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”یہ بچے ابھی تک مدر سے نہیں آئے۔“

”ہاں اماں آتے ہوں گے۔“ زینو موبائل پر منیج لکھنے میں مصروف تھی۔

”اجھا کھانا پکا لیا ٹونے؟“

”ہاں اماں پکا لیا تمہیں لا دوں؟“

”ہاں لا دے بہت بھوک لگی ہے تو تو بچوں کے ساتھ کھائے گی ناں۔“

”آں ہاں ابھی لائی۔“ زینو مسلسل موبائل پر مصروف تھی۔

زینو نے اماں کے آگے کھانا رکھا۔

”اماں اب تم کھانا کھا کر سو جانا یہ لوگ مدر سے آئیں گے تو میں کھانا کھانا کھلا کر سلا دوں گی۔“

”ہاں ہاں! میری بیٹی مجھے پتہ ہے تو ہر کام بڑی ذمے داری سے کرتی ہے جس گھر جائے گی عیش کرے گی تیری حال تو بڑی خوش نصیب ہے کہ تو اُس کی بہو بنے گی۔“ زینو کی اماں نے سرشاری سے بیٹی کو دیکھا اُن کے خیال میں اُن کی بیٹی بہت سکھ رہی تھی سکھڑ ہونے کی بات جہاں تک ہے تو اُن کا خیال ٹھیک بھی تھا، کیونکہ وہ خود تو صبح ناشتے سے فارغ ہو کر علاقے کی خبر گیری کرنے کے لیے نکل پڑتی تھیں پورا گھر زینو ہی سنبھالتی تھی۔ اُس وقت بھی انہوں نے کھانا کھا کر ٹرے ایک طرف سرکانی اور پلنگ پر لیٹ گئیں اب نہیں سونا تھا زینو سب سے بے نیاز موبائل پر مصروف تھی اماں کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اماں کی آنکھ کھلی گھر میں سناٹا تھا انہوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی بچے شاید گلی میں کھیل رہے تھے اور زینو پتہ نہیں کہاں تھی انہوں نے آواز لگائی۔

”زینو۔ زینو۔“

”جی اماں.....“ زینو بھاگتی ہوئی آئی۔

”ہاں میری بیٹی مجھے بتا کر دے دے تاکہ جائے پانی کر میں ذرا باہر کی خبروں سلطانہ کی بیٹی گھر آئی یا اس کی کوئی خبر ملی کہ نہیں۔“

بے معنی...

سبز..... شاخ خیال کی

رگیں سلگ رہی تھیں

ایاں روشن چراغ صورت

ایقان شعلے گمان نیکے پر

آنے والی ساعتوں کو

اک سراپا دے رہے تھے

بات چل رہی تھی.....

عمر ڈھل رہی تھی.....

شش و پنج میں.....

نرم کچی پوروں سے کھیلتے ہوئے

حوالے آنکھوں کے سامنے

پہاڑ صورت و وجود گاڈھے

اٹل حقیقت کے مانند حروف کتبوں پر

برنگ صورت دھڑک رہے تھے

زمانہ جن کی تصدیق میں

قسم! اپنے ہونے کی کھا رہا تھا

اور بتا رہا تھا.....

جیسے پہلے سب ہو رہا تھا

اور ہونے سے پہلے کہہ دیا تھا

پروین ساجل

”اچھا چلو تم لوگ پریشان نہ ہو پتہ چل جائے گا
رانی کا لیکن سنو جیسے ہی کوئی اطلاع ملے مجھے ضرور
بتانا میں صبح سے بہت پریشان ہوں اللہ خیر کرے۔“
زینو کی اماں نے نہ نظر آنے والے آنسو پونچھے پھر
اٹھتے ہوئے بولیں۔

”اچھا بیٹا میں چلی تم دروازہ بند کر لو ٹھیک ہے
پریشان نہ ہونا۔“

زینو کی اماں کا رخ اب چھوٹو کی اماں کے گھر کی
طرف تھا آخر سب کوئی خبر سنانی تھی۔

دوسرے دن صبح گاؤں میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ
رانی نے گھر سے بھاگ کر شادی کر لی ہے۔“ اُس

کے باپ بھائی منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔ محلے کی
عورتیں باتیں بنا رہی تھیں جن میں زینو کی اماں پیش
پیش تھیں۔

”ہائے ہائے اس لڑکی نے تو باپ بھائی کی

عزت خاک میں ملا دی ہماری زینو بھی تو ہے سارا
دن گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہے مجال ہے جو کبھی
دروازے پر نظر آ جائے۔“

”ہاں ہاں۔“ دوسری نے لقمہ دیا۔

”رانی تو شروع سے ہی بد کردار تھی محلے کے
لڑکوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔“

”ارے ہاں میں نے خود اسے کتنی بار کڑوا لے
اشرف سے نین منکا کرتے دیکھا ہے۔“ تیسری نے

ہاتھ کے ساتھ ساتھ آنکھیں منکا کی تھیں۔

”ارے میں تو کہتی ہوں ایسی لڑکیاں تو پیدا
ہوتے ہی مرجائیں قسم سے میری بیٹی اگر خدا نخواستہ

میرے منہ میں خاک کوئی ایسا قدم اٹھاتی تو میں اسے
زندہ زمین میں دفنادیتی تو بہ بھی بڑا جگرا ہے رانی کے

باپ بھائیوں کا۔“ زینو کی اماں با آواز بلند اپنے
خیالات کا اظہار کر رہی تھیں اور ایسی ہی بے شمار
باتوں کے بعد یہ محفل برخواست ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن زینو صبح گھر سے غائب ہو گئی تھی اور
زینو کی اماں سب سے منہ چھپاتی پھر رہی تھیں۔

☆☆.....☆☆

پانچویں عبرت از کہانی میاں جنوں سے

عبرت کا نشان

کُل ماری کجیاں

زندگی	بن	گئی	ہے	عذاب	میری
موت	کیوں	مہرباں	نہیں	ہوتی	

مہر پرویز احمد دولو

”اگر لڑکیوں سے دوستی کا شوق ہے تو ڈانس سیکھ لو لڑکیاں تم پر مر نہیں گی۔“ اس کو یہ مشورہ اتنا پسند آیا کہ آئے روز میلوں، ٹیلیوں پر گلے موت کے کنویں دیکھنے لگا۔ اپنے طور پر تاپنے والوں عورت نما مردوں سے بات کی، مگر ناکام رہا۔

☆.....☆.....☆

خالد اسی گاؤں کے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا وہ اپنے آپ کو پھنے خاں سمجھتا۔ نوید گاؤں میں خالد کی یہ لڑکیوں برواشت نہ کر سکا اور اُسے ایک جھوٹے کیس میں پھنسا کر تھانے میں بند کر دیا۔ پھر بہت منت سماجت اور کافی لین دین کے بعد نوید اور خالد کی صلح ہوئی یوں خالد کو تھانے سے رہائی ملی تھی اور اب خالد اکثر نوید سے بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہتا تھا۔

خالد کو جب پتہ چلا کہ نوید کا بیٹا شیراز ڈانس سیکھنے کا خواہشمند ہے تو اس نے فوراً شیراز سے رابطہ کیا اور اپنے ایک جاننے والے ڈانسر کا پتہ اور نمونہ سہرے دیا۔ شیراز دوسرے ہی دن شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر ڈانسر کے ڈیرے پر پہنچ گیا تھا جہاں عورت نما مردوں اور اُن کے چاہنے والوں کا کاروبار حیات

نوید فطرتاً ہی شیطان ذہن والا انسان تھا لوگوں کو آپس میں لڑانا، تھانے میں کیس دینا کروانا، کیس کی پیروی کے دوران مال بنانا، صلح نہ ہونے دینا اس کا شیوہ تھا، پورے گاؤں میں کوئی فرد اس کے شر سے محفوظ نہ تھا۔ اس نے ہر شخص کو خون کے آنسو لائے تھے۔ سکھ، چین، امن سکون سے اسے سخت نفرت تھی۔ گاؤں میں پولیس یوں باقاعدگی سے آتی جیسے ادھر ہی تھا نہ ہو اور یہاں انہوں نے ڈیوٹی سرانجام دینی ہے۔ نوید کی وجہ سے ایک قتل بھی ہو گیا تھا۔ کئی خواتین کی طلاق کا موجب بنا تھا اور پھر خود ہی طلاق کو فاسق قرار دیتا، گاؤں کا کوئی بھی شریف آدمی اس کے آگے آنکھ اٹھا کر بات نہ کرتا، کیونکہ وہ ایف آئی آر درج کرانے کے بعد ہی صلح کی بات کرتا۔ صبح شام ہر گھر میں کتنے ہی ہاتھ اس کے حق میں بددعا کے لیے اٹھتے تھے۔

☆.....☆.....☆

شیراز نوید کا لاڈلہ بیٹا تھا۔ پیسے اور باپ کے رعب و دبدبے کی وجہ سے کافی بگڑ چکا تھا، لڑکیوں کا دلدادہ، سرعام چھیڑنا معمول بنا رکھا تھا، ان حرکات کی وجہ سے کئی بار لڑکیوں کے ہاتھوں پٹ چکا تھا۔ ایسے میں کسی دوست نے اُس کو ایک عجیب مشورہ دیا۔

خوش نوید بیٹے کی زبانی یہ کہانی سن کر ہوا تھا۔ اسے تو جیسے قارون کا خزانہ مل گیا تھا۔ فوراً پوری برادری اور گاؤں والوں کا جرگہ بلا کر عرض گزار ہوا تھا کہ خالد نے میرے بیٹے کو ڈانسروں کے اڈے پر بیچا ہے۔ اس نے مجھ پر بہت ظلم کیا ہے میرے بیٹے کے نصیب اچھے تھے جو یہ وہاں سے بھاگ آیا۔“

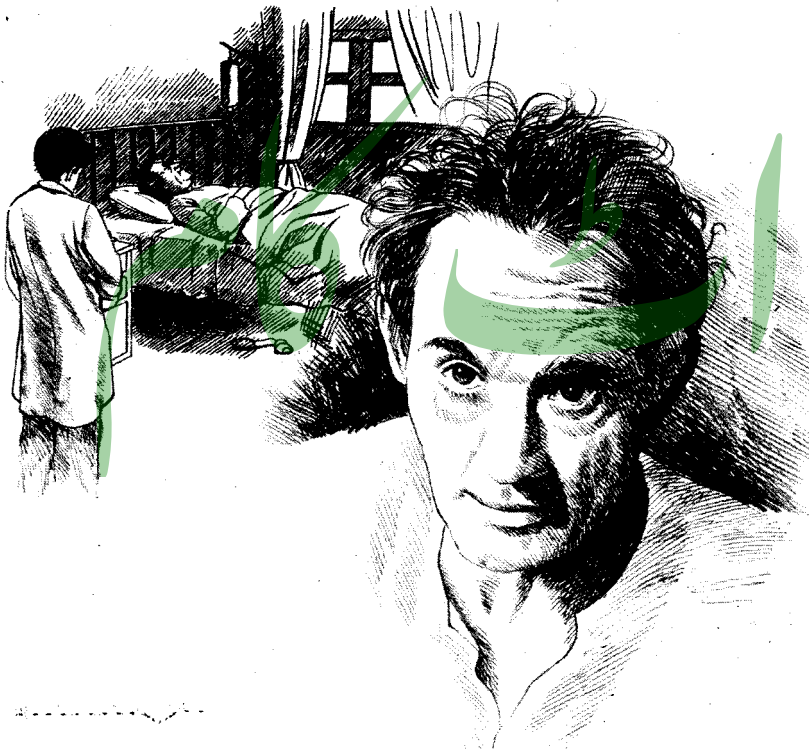
خالد نے یہ الزام ماننے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ”یہ اپنی مرضی سے وہاں ڈانس سیکھنے گیا تھا۔ البتہ میری یہ غلطی ضرور ہے کہ میں نے اسے ایک ڈانسر کا موبائل نمبر دیا تھا۔“ اور پھر اسی وقت خالد کے باپ نے نوید کے پاؤں پر اپنی پک سر سے اتار کر رکھ دی۔ اور نوید سمیت پوری پنجائیت سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگی۔ اور پنجائیت نے معاف بھی کر دیا تھا۔

اتنا بڑا کاری دار خالی گیا تو نوید باؤلا ہی ہو گیا۔ اس نے اسی رات کو خالد کے باپ کو یہ پیغام بھیجا۔

جاری تھا۔ اس دوران میں خالد اور شیراز کی دوستی خاصی بڑھ گئی تھی۔ ایک روز شیراز نے میں تک استعمال کرنے کے لیے خالد سے سچ موبائل مانگا۔ جو اسے فوراً مل گیا تھا، مگر جب ہفتہ دس روز کے بعد خالد نے اپنا موبائل واپس مانگا تھا تو شیراز نے نا صرف موبائل دینے سے انکار کر دیا تھا ساتھ ہی خالد کو دمکی دی تھی۔

”تم نے مجھے دھوکہ دے کر ڈانسروں سے میرا سودا کیا ہے یہ بات میں اپنے ابو کو بتا دوں گا۔“ خالد تھپڑ لگاتے ہوئے شیراز سے موبائل چھین لیا تھا۔ موبائل واپس لینے کی دیر تھی کہ شیراز اپنے گھر گیا اور روٹی صورت بنا کر باپ کو داستان سنائی۔

”خالد نے ڈانسروں کے اڈے پر میرا سودا کر دیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے بھاگ کر واپس گھر آیا ہوں۔“ اتنی خوشی اندھ کو آنکھیں ملنے پر نہیں ہوتی جتنا



غزل

ہم سے پہلے بھی فسانوں میں کئی نام آئے
اک فقط ہم ہی نہیں تھے جو تہہ دام آئے

جب بہار آئے درپتے میں کھلیں پھول ہی پھول
وہ ستارہ ہو کہ جگنو ہو سر بام آئے

بڑے بڑے سچے بڑے معصوم ہوا کرتے تھے
جن کی شوریدہ سری پہ کئی الزام آئے

وہ جو قادر ہے ہر اک شے پہ وہی برحق ہے
وہ جو دنیا کے خدا تھے نہ مرے کام آئے

کیا تغافل تھا کہ انجان تھا ہر شخص یہاں
راہزن بھی مری بستی میں سر عام آئے

اسم اعظم ہے مری ڈھال زمانے بھر سے
تیر دشنام چلے ، گردش ایام آئے

شائستہ سحر

”اگر اپنے بیٹے کی خیریت چاہتے ہو تو ڈاکٹر کا
نمبر دینے کا جرمانہ پچاس ہزار روپے دو وکر نہ
تمہارے بیٹے کے خلاف اغواء برائے تاوان کا مقدمہ
داہر کروں گا۔“

پیغام ملتے ہی خالد کے باپ نے معززین کی
پنچایت بلاتی ’نوید کی دوبارہ منت کی مگر وہ کس سے
مس نہ ہوا اور اگلے دن وہ بیٹے کو لے کر تھانے پہنچ
گیا۔ اور اغواء کی سن گھڑت کہانی سنائی۔ تھانیدار نے
خالد کو بلوایا تو وہ گاؤں کے معززین کے ساتھ تھانے
گیا۔ وہاں سب لوگوں نے نوید اور اس کے بیٹے کو
جھوٹا ثابت کیا، یہاں سے جھوٹا ہونے پر وہ صوبائی
لیول کے آفیسروں تک گیا اور مگر چھپ کے آنسو بہا کر
اپنے اوپر ہونے والے انجان ظلم کی داستان سنائی مگر
آفیسر کے سامنے بھی وہ باپ بنا جھوٹے ثابت
ہوئے اور فیصلہ ایک بار پھر مقامی ایس ایچ اوصاحب
کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے اس معاملے میں بڑی
مشکل سے نوید کو حلف لینے پر آمادہ کیا۔ نوید نے
قرآن مجید اٹھا کر زبان سے کہا۔
”میں نے شیراز کو اغواء نہیں کیا۔“

خالد یہ فیصلہ ماننے کو بھی کسی صورت تیار نہیں ہوا
اور جو بابا خود بھی جھوٹا حلف اٹھانے کو تیار ہو گیا
پنچایت کے کافی لوگوں اور تھانیدار نے خالد کو جھوٹا
حلف اٹھانے سے روکنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ تو
اپنی انا اور ذلت کا بدلہ لینے کے خیال سے اپنی بات پر
اڑا ہوا تھا..... اور پھر ساری پنچایت تھانیدار اور
سارے گاؤں نے دیکھا کہ خالد نے جیسے ہی جھوٹا
حلف لینے کے لیے قرآن کو ابھی چھوا ہی تھا کہ وہ
اچانک تیور کر زمین پر جو گرا تو پھر اپنے پیروں پر اٹھ
نہ سکا تھا۔

ساری دنیا سے جھوٹے مقدمے جیتنے والا خالد
قرآن کا مقدمہ ہار کر فاج زدہ چار پائی پر پڑا موت کا
طالب ہے، مگر موت بھی شاید اُسے قرآن کا جھوٹا
حلف اٹھانے پر عبرت کا نشان بنانے کا فیصلہ کر چکی
ہے۔

☆☆.....☆☆

دیکھی کہانیاں

ان لوگوں کی کہانیاں جن کی حیاتیں ہم لوگوں سے آہستہ

مخصوصی

نہیں وہ جن کی حیاتیں

مقدر	بھی	مجھ	کو	اٹھا	نہ	سکا
بہت	غم	کا	بھاری	پلندہ	ہوں	

ڈاکٹر شمیم انصاری

نہیں آیا اور اب اسے محسوس ہوا کہ جیسے ملکہ بہت بڑی ہو گئی ہے۔ اسے ملکہ کا بوجھ اپنی جھانسی پر پہلی بار محسوس ہو رہا تھا۔

”بیٹی یہ نصیبن آنا نہیں آئی کئی دنوں سے؟ جیسے وہ دنوں سے ان کی آمد کی منتظر تھی اور نصیبن کے نام سے ہی ملکہ شرمائی۔ نصیبن کا بیٹا جمیل ایک مقامی اسکول میں ماسٹر تھا اور نصیبن ہی سے ملکہ جمیل سے منسوب تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا جمیل سے اس کا پردہ تھا مگر پھر بھی محلہ میں کہیں نہ کہیں اس کا سامنا ہو ہی جاتا تھا۔

زیون نے بھی کر کے ایسی کس کر چوٹی باندھی کہ ملکہ کے بال تک پہنچ گئے پھر یہی تیل بھرے ہاتھ اس نے ملکہ کے منہ پر پھیر کر منہ چکا دیا۔ پیار سے بیٹی کی پیشانی کو چوما۔ اسے ملکہ پر بے اختیار پیار آ گیا تھا۔ مگر عین اسی لمحے کھٹ سے کوئی چیز اسے اپنے اندر ٹوٹی محسوس ہوئی۔ پھر خود کو یہ سوچ کر کھلی دی کہ میں کل ہی نصیبن آبا کے یہاں جاؤں گی۔ پچھلے چھ مہینے میں وہ ایک دفعہ بھی نہیں آئیں۔ مگر پہلے بیٹھ صاحب کے یہاں کپڑے دے دوں۔“

زیون چٹائی پر بیٹھ کر جلدی جلدی مشین چلا رہی تھی اب رات کو اسے ٹھیک سے دکھائی بھی نہیں دیتا تھا۔ کوئی

”دیکھ تو سہی بال کیسے کھر دے ہو گئے ہیں اور خشتی تو یہ کس قدر بڑھ گئی ہے۔ ہزار بار کہا ہے شیشی سے تیل نہ لگایا کر، پر تجھ پر تو جیسے اثر ہی نہیں ہوتا۔“ زیون بڑبڑا رہی تھی اور ملکہ کے سر میں کنوڑی سے بھر بھر کے تیل لگائے جا رہی تھی۔ آج اُسے ذرا اطمینان نصیب ہوا تھا۔ صرف ایک بیٹی کی تربیاتی رہ گئی تھی۔ پچھلے دو ماہ سے وہ مسلسل سلائی میں مصروف تھی۔ بیٹھ عابد کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی اور اُسے کوئی تیس جوڑوں کی سلائی کا کام کرنا تھا۔

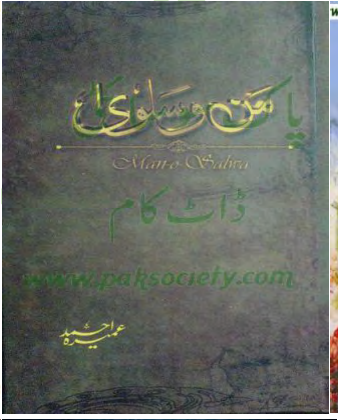
تیل لگا کر وہ بیٹی کا ماتھا نونے لگی جیسے جوئیں تلاش کر رہی ہو چاچا تک اس کی نظر ملکہ کے سر میں اُس کے چند سفید بالوں پر پڑی۔ زیون جیسے لرز گئی۔ کھراہٹ میں اس نے ملکہ کے سر سے دو سفید بال نونچ لیے۔

”اوئی ماں!“ ملکہ بلبللا کر جیسے جاگ گئی تھی۔

”بیٹی وہ مجھے کوئی جوں محسوس ہوئی تھی۔“ زیون نے بوکھاہٹ میں بیٹی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”سفید بال.....“ خیر یہ عمر سفید بالوں والی تو نہیں تھی ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ ملکہ کی عراب مزید گھر بٹھانے کی بھی نہیں ہے۔ چار برس کی عمر میں ملکہ کی گھنٹی کر کے تو وہ اس قدر مطمئن ہو گئی کہ شادی کا خیال ہی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اس نے سوچا ہی تھا کہ جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ اس کے قدم گھر کے بجائے آپاٹھین کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

”نھین آجاتے دن ہو گئے تم نے پلٹ کر ادھر رخ بھی نہیں کیا ملکہ تو تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔“ اپنے سارے گلے شکوے ایک ہی سانس میں کر ڈالے مگر آپاٹھین کا رویہ کچھ بدلہ بدلہ سا لگا۔

”نھین وہ بیٹھ صاحب کی بیٹی کا بیاہ ہو رہا ہے۔“
 ”اسی مچھلی بیٹی کا جو ملکہ سے کوئی سال بھر چھوٹی ہے نا۔“ زینوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح خود اپنے منہ سے شادی کی بات کرے جبکہ نھین اب بھی بالکل خاموش تھی۔

”آپا وہ بمیل کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہا ہے۔“
 اس نے بڑی محبت سے ہونے والے داماد کے بارے میں پوچھا تھا۔
 نھین آبا بولیں۔

”آج محل بہت پریشان سے زینوں اسے پانچ

18 برس سے مشین کی ٹک ٹک اور اس کا ساتھ تھا۔ صبح اس نے کپڑوں کی گھڑی بنائی ٹوپی والا برقعہ پہن کر بیٹھ صاحب کے گھر چل دی۔

”سلام بیگم صاحبہ! یہ دیکھیں اس تمہیں پر میری ملکہ نے گونے کا کام کیا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے میری ملکہ کے ہاتھ میں بہت صفائی آگئی ہے نا بیگم صاحبہ!“ وہ آپ ہی آپ تعریف کیے جا رہی تھی۔

”ہاں اچھا ہے.....“ بیگم صاحبہ نے بس اتنا ہی کہا کہ کہیں زیادہ تعریف سے معاوضہ نہ بڑھانا پڑے۔

”اور ہاں! پیسے پھر لے جاتا۔“
 یہ امیر لوگوں کے یہاں کیا مسئلہ ہوتا ہے کہ کبھی بھی وقت پر پیسے نہیں دیتے اور غریب کی ضرورت پھر کا انتظار نہیں کرتی اس کے لب ملتے ملتے رہ گئے تھے۔

یہاں وہاں سارے گھر میں بھیر کا سامان پھیلا پڑا تھا۔ فرج T.V صوفہ سیٹ، کمرہ بھرا ہوا تھا اور ابھی خریداری جاری تھی۔

”میں ملکہ کے لیے بھی اچھا جینز بنا سکتی ہوں۔“



سیٹھ عابدانکا نہیں کریں گے۔“ وہ جیسے مطمئن ہوئی۔
ان کی یہ آہستہ آہستہ ہونے والی گفتگو بھی ملکہ نے
صاف سن لی تھی۔ اس نے کرب سے ہونٹ کاٹ لیے
آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔
”جمیل.....“ اس کے لب ہل کر رہ گئے، ہنستی
مسکراتی ملکہ ایک دم خاموش ہوئی تھی ماں خود بھی بہت
دکھی تھی۔ زینوں سیٹھ صاحب کے پاس گئی۔

”صاحب وہ میں ملکہ کا بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔“
”بہت خوب ماشاء اللہ ضرور کرو گے؟“
”بیگم ملکہ کے لیے کوئی بہت اچھا سا جوڑا بنانا۔“
”صرف جوڑا..... سیٹھ سے کہہ دے کہ جوڑا نہیں
وہ پانچ ہزار۔“ زینوں کے دل نے آواز دی۔

مگر سیٹھ صاحب تو فوراً کھڑے ہو کر چل دیے۔
کوئی ملنے والا آ گیا تھا۔

وہ گھر آئی تو ملکہ کی سوچھی آنکھیں دیکھ کر اس کی متنا
تڑپ کر رہ گئی، آج اسے اپنی جمیل بھی بہت پرانی نظر
آ رہی تھی۔ کیا رکھا ہے اس میں ایک چار پائی ایک چٹائی
سلانی کی مشین دو بکسے اور کھانے بیٹے کے کچھ برتن، اسے
پانچ ہزار تو کیا پانچ پیسوں میں بھی کوئی نہ خریدے۔ اس
نے حقارت سے جمیل پر نظر ڈالی تھی۔

زینوں کو یاد آیا۔ اسی جگہ وہ عمر دین کی دلہن بن کر
آئی تھی تو اپنے گھر کے تصور سے کیسی خوش تھی۔ تب اُسے
یاد آیا سیٹھ صاحب نے سوائے سلانی کی مشین اور عمر دین
کے علاج پر خرچ ہونے والی رقم کے کیا دیا کچھ بھی تو نہیں
دیا۔ تو پھر آج وہ عمر دین کی زندگی کی قیمت کا مطالبہ
کرے گی۔ وہ اپنا آچل پھیلا دے گی نہیں وہ سیٹھ
صاحب کے پاؤں پڑے گی۔

”نہیں نہیں..... میں کچھ بھی نہیں کروں گی۔ میں
شہید کی بیوہ ہوں۔“

”میں اکڑے سیٹھ صاحب کو یاد دلاؤں گی کہ عمر
دین نے اُن کی جان بچانے کی خاطر خود اپنے سینے پر
گوئی کھائی تھی۔ اگر عمر دین آڑے نہ آ جاتا تو تل پرحلہ
کرنے والے غنڈوں کا نشانہ خطا نہ جاتا، ایک ماہ زخمی
حالت میں رہ کر عمر دین دو برس کی ملکہ کے ساتھ اسے تہا
چھوڑ گیا تھا۔

ہزار روپوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگر اسے یہ رقم نہ ملی
تو.....!“ وہ پھر خود ہی خاموش ہوئی۔

”پانچ ہزار! یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔“ زینوں نے
دل ہی دل میں سوچا تھا اور پھر ادھر ادھر کی باتوں کے
بعد وہ تقریباً پانچ سو روپے گھر آ گئی۔
زینوں کے تھکے تھکے اداس انداز سے ملکہ کانپ گئی

”اماں!“ ملکہ نے سوالیہ انداز میں پکارا۔ اس میں
اتنی ہمت نہیں تھی کہ کچھ پوچھ سکتی۔ ماں کی آنکھوں سے
آنسو بہہ نکلے۔ اُسے ٹھہرنے والی بے رحمی سے بہت دکھ
پہنچا تھا۔

ملکہ جلدی سے پانی کا گلاس لے آئی۔ ماں کا جی ڈرا
ٹھنڈا ہوا تو وہ خود ہی بڑبانے لگی۔

”جمیل کو پانچ ہزار کی سخت ضرورت ہے اور پھر کھل
کر ٹھہرنے والی بے رحمی بھی بتادی اور اس لمحے ملکہ جیسے
سفیہ بڑی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بلو ٹھیک ہی کہہ رہی
تھی۔ اُس کا جی چاہا وہ ماں کو بتا دے کہ ٹھہرنے والی جمیل کا
بیاہ ہیڈ ماسٹر کی بیٹی سے کر رہی ہے، پرسوں ہی تو بلو نے
اسے یہ خبر دی تھی جس پر اس نے قطعی اعتبار نہیں کیا تھا۔
مگر وہ اپنے جی کا بوجھ ہلکا کر کے ماں کو مزید دکھ دینا نہیں
چاہتی تھی۔ وہ خود ہی ماں کی بے بسی پر رودی۔

زینوں کی جیسے راتوں کی نیند حرام ہو کر رہ گئی تھی اور
پھر اگلے دن ٹھہرنے والی جمیل نے زینوں کو جیسے کھل گئی مگر
یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ ٹھہرنے والی صاف صاف
لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ جمیل کا بیاہ ہیڈ ماسٹر کی بیٹی سے
کرنا چاہ رہی ہیں۔

”کیا بتاؤں بہن سخت مجبوری ہے۔ وہ بیٹی کو پانچ

ہزار نقد دے رہے ہیں۔ میرے بچے کی ضرورت بہت
اہم ہے اور اس کے سوا چارہ نہیں۔“

”تم سیٹھ عابد سے کیوں نہیں کہتیں، آخر عمر دین
نے اُس کی جان بچائی تھی۔“

”عمر دین۔“ زینوں کو شدت سے ملکہ کا باپ یاد
آ گیا۔

”ٹھیک ہے بہن تم تھوڑے دن اور انتظار کر لو۔“

”میں بات کروں گی۔ مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔

سمجھے سیٹھ۔“ وہ تقریباً چیخنے لگی۔ پھر جلدی سے برقعہ لیا اور گھر کی طرف چل دی۔

زینوں کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”عمر دین.....“ اس نے تڑپ کر پکارا تھا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی وہ بیوہ ہوئی ہو۔

”اس کائنات میں میرا کون ہے۔ میرا کوئی سہارا

نہیں، غریب کا صرف خدا ہوتا ہے مگر خدا!“

”اے خدا! مجھے معاف کر دینا میں تیری ماہد

برست دنیا کے سامنے آج..... ہار گئی ہوں۔“ وہ

مستقبل بڑبڑائے جاری تھی اس نے جیب سے نلے

تھوٹے کی پڑیا نکالی تھی۔

”ہاں! یہ ٹھیک ہے میں مرجاتی ہوں۔ مگر میری

بچی! میری ملکہ! میں آج آخری بار اُسے پیار

کر دوں۔“

گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ ”ملکہ.....“ ماں نے

روتے ہوئے پکارا۔

”ملکہ میری بچی! غریب کی ملکہ تو صرف نام کی

ملکہ ہوتی ہے۔ وہ بولے جا رہی تھی۔ ”ملکہ.....“ وہ

زور سے چیختی تھی۔

اُس کی ملکہ گھر کی اکلوتی چار پائی پر گہری نیند

سورہی تھی۔ ابدی نیند! آنکھیں جیسے ابلی ہوئی تھیں

رنگ نیلا پڑا ہوا تھا۔

”ملکہ میری بچی! میری جان! یہ تو نے کیا کیا ملکہ

یہ تو نے کیا کیا؟“ پھر اُس کے آنسو ایک دم ٹھم سے

گرنے لگے۔ وہ خاموشی سے اٹھی ٹین کا بکس کھولا اور اپنا

چمچیں برس برانا عروسی دو پینڈ نکالا ستے ہوئے چہرے

بختر آنکھوں کے ساتھ ملکہ کے مردہ جسم کے پاس آئی

اُس کے سر پر وہ گوئے والا سرخ دو پینڈ ڈالا اور آگے

بڑھی بڑھ کر ملکہ کی پیشانی کو چوما اپنی آنکھیں بند کیس

اور آہستہ آہستہ (ہولے ہولے) سسکنے لگی۔

اور پھر جنازے کے سر ہانے چٹائی پر بیٹھ کر یوں

پھوٹ پھوٹ کر رودی جیسے ابھی ابھی اکلوتی بچی کو

رخصت کر کے بیٹھی ہو۔

☆☆☆☆☆

ہاں سیٹھ صاحب نے عمر دین کے علاج میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی تھی مگر یہ تو ان کا فرض تھا۔ اس کے علاوہ یہ مشین خرید کر دی تھی تو ہمیشہ اپنے کپڑے ستے ہی سلواتے تھے۔“

ملکہ کئی دنوں سے جیب جیب تھی۔ ماں کی پریشانی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور ملکہ کو دیکھ کر تو اسے اور بھی دکھ ہوتا تھا۔

”بٹی میں صبح سیٹھ صاحب کے پاس جاؤں گی۔“

اس نے نہ جانتے ہوئے بھی کہہ دیا اور ملکہ جانتی تھی کہ وہ

کیوں جائے گی۔

”ٹھیک ہے میں کل ہر حال میں سیٹھ صاحب سے

بات کروں گی اور اگر انہوں نے انکار کر دیا تو..... تو..... تو

میں زہر کھا لوں گی۔ دل میں پکارا وہ کیا۔ مگر میری ملکہ کا

کیا بنے گا؟“ اس نے تڑپ کر سوچا۔

”لیکن میں جیتے جی ملکہ کا جنازہ بھی نہیں دیکھ

سکتی۔“

”سیٹھ صاحب! امی وہ ملکہ کے جیل کو پانچ ہزار

روپوں کی اشد ضرورت ہے۔ میں پانچ ہزار ہجیز میں

دے دوں تو میری بچی کا گھر آباد ہو جائے گا۔ جی وہ اگر

آ آ آپ.....“

”پانچ ہزار.....!“ سیٹھ صاحب یوں چونکے جیسے

زینوں دنیا کے کسی خزانے کا ذکر کر رہی ہو۔

”سیٹھ صاحب جی! عمر دین نے آپ کی جان

بچاتے ہوئے شہادت پائی۔“

زندگی میں پہلی بار اس نے یہ احسان جتا ہی دیا۔

صاحب میرے عمر دین۔

”ٹھیک ہے زینوں! مگر اس کا یہ مطلب نہیں پہلے

ہی کئی ہزار اس کے علاج پر میں خرچ کر چکا ہوں۔“

اس نے بڑھ کر سیٹھ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے

اُسے صرف ایک ہی مل نظر آ رہا تھا۔ مگر وہ ایک ہزار سے

زیادہ دینے پر کسی طرح رضامند نہیں ہو رہے تھے۔ اب

جیسے کے غریب کی غیرت کو جوش آ گیا۔

”سیٹھ میں قہقہے ہوں تمہارے پیسوں پر.....

میرا عمر دین جان سے گیا، صرف تمہاری خاطر تم نے

اپنی بیٹی کو چار لاکھ کا جہیز دے دیا اور اب تمہیں خدا

دوسری دیکھی کہانی کرچی سے

گاہے گود نیا میں آئی

حکایت حیران کا خیال

داستان	گو	کی	آکھ	بھر	آئی
کوئی	کردار	مر گیا	ہے	کیا؟	

ڈاکٹر طارق محمود آکاش

اسے بہت کوستی کہ ایسی بات زبان پر بھی مت لایا کرو۔ میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔
مگر شاید قدرت کو ایسا ہی منظور تھا تیرے بچے کی پیدائش کے وقت کوثر اور بچہ دونوں ہی اس دنیا کو چھوڑ گئے۔ ڈاکٹر زکی بہت کوشش کے باوجود بھی وہ زچہ بچہ کو بچانہ پائے۔

☆.....☆.....☆

وقت کا کام ہے چلتے رہنا اور وہ چلتا ہی گیا۔ لوگوں نے بہت بولا کہ بچے چھوٹے ہیں دوسری شادی کر لو لیاقت نہ مانا۔ مگر جب ثمنینہ دس سال اور رزاق سات سال کا تھا تو ایک روز لیاقت کے ساتھ ایک عورت گھر میں داخل ہوئی۔ ثمنینہ کے سوال پر اس کے ابا نے جواب دیا۔

”یہ تمہاری اماں ہے۔“

لیاقت نے یہی کام اگر اس نے کچھ سال پہلے کر لیا ہوتا تو بچے یقیناً اب تک سمجھوتہ کر چکے ہوتے مگر اب وہ سمجھدار ہو چکے تھے۔ اب ان کو یہ حقیقت اتنی جلدی سمجھانا آسان نہ تھا۔ ثمنینہ خاموش تو ہوتی تھی مگر اس کے لیے یہ قابل قبول بات نہ تھی جبکہ رزاق ابھی نا سمجھ تھا۔ جب نئی اماں عذر دانی بی کسی بھی کام

تقدیر بنانے والے ٹوٹنے کی نہ کی کسی کو کیا ملامت قدر کی بات ہے ثمنینہ نے تیرا ب پی لیا ہے۔ اُسے لاہور لے گئے ہیں۔ ہر زبان پر یہی بات تھی۔ جس کو دیکھو وہ یہی بات کر رہا تھا۔

”ارے لکٹی لاڈلی تھی۔ ماں باپ کی مگر ماں کے مرنے کے بعد تو جیسے اس کے نصیب بھی مر گئے تھے۔ اگر باپ سو بیٹا ہوتا تو بات سمجھ میں آتی تھی مگر یہ کیا..... گئے باپ نے ایسا سلوک کیا..... تو بہ اور پھر سب خود ہی کہنے لگ جاتے۔“

”اچھا ہی کیا بے چاری نے..... اس عذاب جیسی زندگی میں دھکے کھانے سے بہتر ہے مر جانا۔“

☆.....☆.....☆

لیاقت اور کوثر کے ہاں پہلی اولاد ثمنینہ پیدا ہوئی اور بعد میں رزاق..... دونوں بہت خوش تھے۔ بچوں کی ہر خوشی ہر خواہش پوری ہوتی تھی۔ بہت پیار کرتے تھے ایک دوسرے سے ہمیشہ بچوں کی خوشیوں کے لیے دعا مانگتے کہتے کوثر اکثر کہا کرتی۔

”لیاقت اگر میں دنیا سے چلی گئی تو میرے بچوں کا خیال رکھنا۔“ مگر جب لیاقت یہ بات کرتا تو کوثر

میں پارٹی کا اعلان ہوا تھا، جس کے لیے ہراسٹوڈنٹ کو 200 روپے جمع کروانا تھے۔ ٹمپن نے جب رزاق کے ذریعے ابا کو بولا تو عذرا بی بی نے صاف منہ کر پدا کہ ایسی فضولیات کے لیے ایک روپیہ بھی نہیں مل سکتا۔ اور اس طرح ٹمپن کو چھین ضرب لگا دی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

شادی کو جب کچھ ماہ گزر چکے اور عذرا بہت جلد

کے سلسلے میں اسے باہر دوکان پر بھیجتی تو وہ ضرور جاتا مگر ٹمپن ہمیشہ اکھڑی اکھڑی سی رہتی تھی۔

پہلے پہل تو ابا اپنی پرانی روشین کے مطابق دونوں بچوں کے لیے چیزیں وغیرہ لے کر آتا۔ اسکول فیس، ٹیوشن فیس رکھنے کا کرایہ نام پر مل جاتا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ کئی کئی دن اس جائز ضرورت کے لیے بھی بچوں کو ابا کی پیش کرنا پڑتیں، اس روز اسکول



کی ماں بن چکی تھی، شمیم نے کبھی بھی آج تک اس سے کلام نہ کیا تھا، اور نہ ہی کبھی لیاقت نے کوشش کی تھی کہ دونوں کے مابین سمجھوتہ کروادیا جاتا۔ عذرا کا رویہ انتہائی خشک رہتا، زیادہ تر کام اسے ہوئے ملتے، جو باقی رہ جاتے وہ کر لیتی، رزاق ماں باپ کی عدم توجہ کے باعث کافی حد تک آوارہ گرد بن چکا تھا۔ اسے گھر اور کام سے دلچسپی برائے نام ہی تھی، جبکہ لیاقت کی نظر میں تو شاید یہ تھا ہی نہیں کہ شمیم اور رزاق بھی اس کی اولاد ہیں۔

☆.....☆.....☆

خالد بی اے میں بڑھ رہا تھا ساتھ ساتھ اس نے ایک اکیڈمی جوائن کر رکھی تھی۔ جس میں وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا، جس سے اس کے پڑھائی کے اخراجات پورے ہو رہے تھے۔ اس نے جب ماں کو شمیم سے شادی والی اپنی خواہش بتائی تھی تو ماں کو اپنی بہن بہت یاد آئی تھی۔ اور پھر ایک روز کافی عرصے بعد زرینہ بی بی اپنی بہن کے گھر گئی تھیں تو عذرا نے انتہائی روکنے پکنے سے ان کا استقبال کیا تھا۔ شمیم اپنی خالہ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اور اپنے کمرے میں لے جا کر ان کے لیے چائے وغیرہ تیار کر رکھی۔ زرینہ نے شمیم سے گلہ بھی کیا تھا کہ تم بھی اپنی خالہ کے گھر کیوں نہیں آتی ہو، اور ساتھ پوچھا تھا کہ عذرا کا رویہ تم لوگوں کے ساتھ کیسا ہے؟

شمیم نے کوئی بھی بات عذرا کے خلاف نہ کی تھی بلکہ خالہ کا دھیان کسی اور طرف کر دیا تھا۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد خالہ اپنے گھر لوٹ گئی تھیں اور ساتھ ہی سمجھہ کر لیا تھا کہ وہ جلد شمیم کو اپنے گھر کی بہو بنا کر لے جائیں گی۔

☆.....☆.....☆

خالد کو بی اے کے بعد ایک فیکٹری میں چاب مل گئی تھی تو زرینہ دو بارہ سے لیاقت کے ہاں گئی تھی اور اس سے شمیم کا رشتہ طلب کیا تھا۔ ایک ہی محلے میں رہنے کے باوجود بھی ایک عرصہ ہوا لیاقت زرینہ کے ہاں نہ گیا تھا۔ ایک لمحے کو لیاقت کو یاد آیا کہ اس کی بیٹی جوان ہو چکی ہے۔ ورنہ وہ تو شاید اپنی ذمہ داری کو خیر

ماں بننے والی تھی تو لیاقت تو بس اس کے آگے پیچھے باگھل ہوا پھرتا۔ بھی فروٹ، کبھی دودھ، کبھی کچھ بھی کچھ آ رہا ہے۔ اور عذرا بیگم تو بس بیڈ سے ایک قدم بھی نیچے نہیں رکھتی تھیں، شمیم کو مجبوراً ہر کام کرنا پڑ رہا تھا۔ اب وہ کھانا وغیرہ تو سوئیلی ماں کے روم میں پہنچا دیتی، مگر آج تک اس نے بھی عذرا کو نہ دل سے قبول کیا تھا اور نہ ہی کبھی اس سے زیادہ بات کی تھی، البتہ رزاق عذرا کی ایک آواز پر اس کے پاس ہوتا تھا۔

اور پھر ایک روز عذرا نے ایک بہت خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ لیاقت بہت خوش تھا۔ رزاق بھی چھوٹی بہن کو گود میں اٹھائے پھرتا۔ مگر شمیم نے اس کو دیکھا تک نہیں تھا۔ لیاقت کا خیال تھا کہ گھر میں چھوٹے بچے ہو جائے گا تو شمیم خود ہی سمجھ جائے گی اور خوش دلی سے عذرا اور بچے کو قبول کر لے گی مگر ایسا نہ ہوسکا۔

شمیم کا خالد زاد رزن خالد شروع سے شمیم کو پسند کرتا تھا، دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھ رہے تھے۔ رزاق شمیم اور خالد صبح ایک ساتھ اسکول جاتے تھے، دونوں پہلے شمیم کو اسکول چھوڑتے کیونکہ شمیم کا اسکول تھوڑا آگے تھا۔ اور پھر وہ واپس اپنے اسکول آ جاتے۔ خالد نے اب تک کبھی شمیم سے اپنے دل کی بات نہ کی تھی، اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ابھی اس بات کے لیے بہت ٹائم پڑا ہے مگر وہ ہر طرح سے شمیم کا خیال رکھتا تھا۔

رزاق کی چھوٹی بچی کا نام نیلم رکھا گیا۔ نیلی آنکھوں والی نیلم واقعی میں بے حد حسین تھی، اسکول سے واپس آ کر رزاق تو بس اسے ہی اٹھائے پھرتا جبکہ شمیم اسکول سے آ کر دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑا ریٹ کرتی اور پھر سام کے لیے کھانا بناتی، ساتھ ساتھ وہ ہوم ورک بھی کرنی جاتی، اور جو کام رہ جاتا وہ رات کو مکمل کر لیتی، ابا کا رویہ اس کے ساتھ اب پہلے جیسا نہ تھا اس کے لیے جیسے گل کائنات عذرا اور نیلم ہی تھے۔

وقت کے ساتھ زندگی کا سفر بھی جاری تھا۔

شمیم نے اب میٹرک کر لیا تھا، جبکہ رزاق آٹھویں کلاس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ عذرا چار بچوں

بھول ہی چکا تھا۔
میں خاموش رہا مگر اب میں تمہیں ہر وہ خوشی دینا چاہتا ہوں جس جس پر تمہارا حق تھا، مگر تمہیں نمل پائیں۔ میرے خدا نے چاہا تو میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔“

اور پھر اسی سہ پہر کے بعد جب ثمنینہ اور زرینہ شام کا کھانا بنانے میں مصروف تھیں تو خالد کی لاش گھر آگئی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ فیکٹری میں خالد کا ہاتھ مشین میں آنے سے کٹ گیا تھا اور فون اتنی شدت سے بہہ نکلا کہ ہسپتال جانے سے پہلے ہی اُس نے دم توڑ دیا۔ ثمنینہ کی تو دنیا ہی لٹ چکی تھی۔ چند روز کی خوشیوں کے بعد زندگی میں ایک دفعہ پھر اندھیرے پھیل گئے۔ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ جوان بیٹے کی لاش سے لٹی زریں بھی بیٹے کے ساتھ ہی دنیا چھوڑ گئی۔ گھر سے دو جنازے اٹھے تو قیامت آگئی۔ ہر آنکھ اشکارا رہی، گھر کے در و دیوار بھی ڈھالیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ثمنینہ کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔

☆.....☆.....☆

ثمنینہ کو انتہائی سادگی کے ساتھ خالد کے ساتھ نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ خالد کو اپنے بچپن کی ساتھی بچپن کا پیار مل جانے پر بہت خوشی ہوئی۔ ساہیا سال کے بعد آج شاید ثمنینہ کے چہرے پر ہنسی آئی تھی۔
زرینہ اور خالد نے ثمنینہ کو ماں جیسا پیار دیا تھا۔ ثمنینہ اپنے سارے غم بھول گئی وہ اپنی نئی زندگی سے بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

خالد اور زرینہ ثمنینہ کا بہت خیال رکھتے، زرینہ نے اسے کبھی ماں کی یاد نہ آنے دی۔ دوسری طرف عذرا کو اب بہت مشکل محسوس ہوتی، گھر کے سارے کام اُسے خود کرنا پڑ رہے تھے۔

خصوصاً برتن دھونا اس کے لیے عذاب تھا، ثمنینہ کے ہوتے اس نے برتن دھونے والا کام ہرگز نہ کیا تھا۔ رزاق کو لیاقت نے کسی فیکٹری میں ملازم لگوادیا تھا۔ جس سے گھر کے اخراجات کے لیے معقول پیسے مل جاتے تھے۔

ثمنینہ کی زندگی خوش و خرم ہو گئی تھی۔ بن ماں کی بچی کی شادی کو ڈیڑھ مہینہ ہی گزرا تھا مگر اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے ڈیڑھ ماہ میں پوری زندگی جی لی ہو مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ اُس صبح کام پر جاتے ہوئے خالد ثمنینہ کو بول رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

خالد کو مرے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ ثمنینہ اس کی یاد میں پل پل روئی اور اپنی تقدیر سے گلہ کرتی۔

”اگر مجھے زلانا ہی تھا تو چار دن کی خوشی کیوں دی۔ مجھے غم کے اندھیرے میں دکھیلنا تھا تو روشنی کی کرن کیوں دکھائی، میری آنکھوں سے ساون ہی برستا تھا تو میرے آنگن میں بہا کیوں آئی۔“

صاحب اولاد بچوں کے باپ کو لے گئی۔ ہر کوئی اُسے
ہی تصور وارٹھہرار ہاتھا اور نمینہ اپنے خدا سے پوچھ رہی
تھی۔

”کاہے کو دنیا پائی۔“

☆.....☆.....☆

شمینہ ایک مرتبہ پھر لٹی پٹی باپ کے دروازے پر
آچکی تھی کیونکہ بوڑھی ماں نے اپنے بچے کے مرنے
کے بعد منحوس شمینہ کے سائے کو بھی گھر سے نکل جانے
کا بول دیا تا۔ اب تو عذرا نے بھی سلیم کو شمینہ سے دور
رہنے کا مشورہ دے دیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق
بھی شمینہ منحوس ہے۔ یہ جس کے ساتھ لگتی ہے وہ زندہ
نہیں رہتا۔

شمینہ نے دل میں تہہ کر لیا تھا کہ وہ اب کبھی بھی
شادی نہیں کرے گی، خود کسی کے گھر میں کام کر لیا
کرے گی اور اپنی روزی روٹی کا بندوبست خود کرے
گی۔ مگر وہ باپ پر بوجھ نہ بنے گی۔ رزاق اچھا خاصا
کمانے لگ گیا تھا۔

مگر اس نے بھی خود کو شمینہ سے دور کر لیا تھا یعنی
کہ شمینہ کا ساگ بھائی بھی یہ سمجھتا تھا کہ شمینہ منحوس ہے۔
شمینہ ویسے تو سب کچھ برداشت کر رہی تھی مگر اسے
بھائی کا رویہ کاٹ کھانے کو دوڑاتا تھا۔

ایک روز جب شمینہ گھر سے نکلی۔ اور دو تین
گھروں میں جانے کی کوشش کی کہ شاید کوئی کام بر رکھ
لے، مگر کسی نے بھی اسے اندر ہی نہ آنے دیا۔ محلے کا
ایک آوارہ گرد تھا جس کا نام تو محبوب تھا مگر اسے سب
’لو با‘ بولتے تھے۔

’لو با‘ کا کام ہر وقت آوارہ پھرنا، شراب نوشی کرنا
اور رات کو جوئے کے اڈے پر رہنا تھا، اُس نے جب
شمینہ کو گزرتے دیکھا تو دوست سے پوچھا کہ یہ کون
ہے۔ تو اس نے بتایا کہ لیاقت کی بیٹی ہے۔ دو دفعہ
شادی ہوئی دونوں دفعہ ہی اس کے شوہر مر گئے۔ تو ’لو با‘
کو سمجھ آ گئی یہ کون ہے۔ تو اُس نے اپنے ساتھی سے
کہا۔

”دو شوہر تو اس سے شادی کے بعد مرے تھے مگر
’لو با‘ تو شادی سے پہلے ہی مر گیا ہے اس پر اور اب اس

وہ دسمبر کی ٹھنہری رات تھی۔ باہر شدید بارش
جاری تھی۔ شمینہ کو شدید بخار تھا۔ اُس کا جسم چم رہا
تھا۔ کسی کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کس حال میں ہے۔ اُس کا
دل گھبرا رہا تو وہ باہر برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی، بجلی
چمک رہی تھی۔ اس کے کانوں نے سنا کہ لیاقت عذرا
سے کہہ رہا تھا۔

”شمینہ کے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ آ دی نیکسری
میں اس کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اُس کے تین بچے
ہیں۔ بیوی تو ہوا عرصہ پہلے فوت ہو چکی ہے۔ اب
شمینہ کے لیے کسی کنوارے لڑکے کا رشتہ ملنا ممکن
نہیں۔ میرا خیال ہے اس کا نکاح کر دینا چاہیے۔ اور
پھر اُس کی کوئی ڈیماٹ بھی نہیں ہے۔ اپنا گھر ہے تین
بچے ہیں ایک بوڑھی ماں ہے گھر میں کھانا پکانے والا
کوئی نہیں ہے۔“

☆.....☆.....☆

اور پھر شمینہ کا نکاح وحید سے کر دیا گیا۔ اُس نے
بنا احتجاج کیے یہ حکم قبول کر لیا تھا۔ وحید ویسے تو اچھا
انسان تھا مگر وہ دے گا مریض تھا، اکثر اس کا سانس
اُکھڑ جاتا تھا۔ اس نے گویا پورا میڈیکل اسٹور گھر
میں بنا رکھا تھا۔ ہر وقت دوائیوں کے سہارے چل رہا
تھا۔ بچے بہت پیارے تھے تینوں اسکول جاتے،
بوڑھی ماں کی نظر بالکل ٹھوڑی سی تھی۔ وہ بستر پر ہی
رہتیں، بچے دادی کے ساتھ زیادہ اُلج تھے۔ وحید نے
شمینہ سے کہہ رکھا تھا کہ اسے جس چیز کی بھی ضرورت
ہو وہ بلا جھجک کہہ سکتی ہے، مگر اُس نے بھی کوئی ڈیماٹ
نہ کی تھی۔

☆.....☆.....☆

ہائے ری قسمت، ہونی ہو کر رہتی ہے۔ کسی کو کیا
خبر تھی کہ ایسا ہو جائے گا۔ شمینہ خاموشی سے زندگی کے
دن پورے کر رہی تھی کہ ایک رات وحید کو کھانسی کا
جان لیوا دورہ آیا اور پلک جھمکتے ہی وہ دنیا چھوڑ گیا۔
انجی اس کی شادی کو ایک سال بھی پورا نہ ہوا تھا ہر
ایسے موقع پر جاہل عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ یہ
بات سوچے اور کہے بنا نہیں رہ سکتیں کہ یہ لڑکی ہی
منحوس ہے، پہلے ایک جوان شوہر کو کھا گئی اور اب ایک

اسے گھر سے نکال دینا چاہیے اور پھر میاں جی جو امام مسجد تھے پورا گاؤں اُن کی عزت کرتا تھا اُن کی بات ٹالی نہ جاسکی اور ایک دن بعد ہی محبوب کے ساتھ ثمنینہ کا نکاح کر دیا گیا۔

ثمنینہ خون کے آنسو بہاتی، لُو با کے ویران آنگن میں وقت کے ہاتھوں کٹی پتنگ کی طرح آگئی نہ جانے اب وقت اُس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والا تھا۔ یہ تو وقت ہی بتاتا جبکہ محبوب پہلی رات ہی نماز کو بھول کر شراب نوشی کر کے ثمنینہ کو آنے والے وقت کے خطرات سے آگاہ کر چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

اب تو ہر رات یہ معمول بن چکا تھا کہ محبوب کے دوست اُس کے گھر ہی آجاتے اور رات گئے تک وہاں جوا چلتا رہتا۔ بے چاری ثمنینہ پوری رات اُن آوارہ لڑکوں کے لیے چائے ہی بنا بنا کر تھک جاتی۔ اور پھر ایک رات ثمنینہ کے لیے آسمان ہی سر پر آن گرا جب وہ بچن میں چائے بنا رہی تھی تو اُس کے کانوں میں آواز پڑی۔

”دیکھ لُو با میں جوئے میں تیری بیوی کو جیت چکا ہوں اب تُو اسے اپنے ہاتھوں سے تیار کر دے کہ آج کی رات میں اُس کا شوہر ہوں ورنہ تجھے تو پتہ ہے کہ ہم جوئے میں جیتی ہوئی رقم ہر حال میں لے ہی لیتے ہیں چاہے اُس کے لیے ہمیں خون ہی نہ کرنا پڑے۔“ ثمنینہ کے تو جیسے کسی نے کانوں میں سیسہ اٹھیل دیا ہو۔

اب اُسے انتظار تھا کہ آخر اُس کا شوہر اُسے کیا جواب دیتا ہے اور پھر جب لُو با نے کہا۔ ”ارے ہم یاروں کے یار ہیں ہم سبھی اپنی بات سے نہیں مکرے ہیں۔ اور جو چیز تو جیت چکا ہے وہ تیری ہی ہے۔“

یہ سن کر ثمنینہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس نے اپنی پوری زندگی تو حالات سے سمجھوتہ کیا تھا مگر وہ اپنی عزت سے سمجھوتہ نہ کر سکی اور اس نے تیزاب پنی کے اپنی جان دے دی تھی۔

☆☆.....☆☆

کو اپنا نہ بنایا تو میرا نام نہیں۔“ محبوب قسم کے آوارہ اور مستندے قسم کے لوگوں کو نایک کرنا تو خوب آتا ہے۔ اور پھر لُو با تو ماسٹر تھا اس سلسلے میں اُس نے بڑے پازینو طریقے سے ثمنینہ کو حاصل کرنے کا پلان بنایا۔

اس نے نماز پڑھنا شروع کر دی مولوی صاحب اکثر اسے آتے جاتے نماز کی تلقین کیا کرتے تھے۔ پھر جب میاں جی نے لُو با کو مسجد آتے دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ چلو اُن کی بات کا اثر تو ہوا لُو با پر..... مسلسل ایک ماہ تک وہ باجماعت نماز ادا کرنے مسجد آتا رہا اس دوران اُسے ثمنینہ تو نظر نہ آئی مگر اس نے اپنے ساتھی کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ پتہ رکھے کہ ثمنینہ کا کہیں رشتہ نہ ہو جائے۔ مگر اب ایسی کوئی بھی بات نہ تھی۔

ایک روز جب ظہر کی نماز کے بعد میاں جی لُو با سے کہہ رہے تھے کہ ”وہ بہت خوش ہیں کہ تم نے نماز شروع کر دی ہے اب تم باقاعدگی سے قرآن کی تعلیم بھی لینا شروع کر دو تو پہلے تو لُو بانے میاں جی کو مکمل ششے میں اتارا اُن کا اعتماد حاصل کیا اور پھر تین دن کے بعد اپنے مطلب کی بات زبان پر لے آیا۔

”مگر سننا لے والا کوئی نہیں ہے میں اب سدھر گیا ہوں میں چاہتا ہوں کہ میرا گھر آباد ہو جائے میں کام کروں اور وہ گھر سنبھالے۔“ اور جب میاں جی نے اُس سے پوچھا کہ کوئی ایسی لڑکی ہے تمہاری نظر میں تو اس نے فوراً کہہ دیا۔

”لیاقت کی بیٹی ثمنینہ..... جس کو سب منحوس کہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی میں ایک دفعہ پھر رونق آجائے اور وہ آباد ہو جائے۔“ تو میاں جی کو یہ بات بہت اچھی لگی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لیے پوری کوشش کریں گے۔

☆.....☆.....☆

ثمنینہ محبوب سے شادی کے لیے راضی نہ تھی اور لیاقت بھی ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر چونکہ عذرا رزاق اور نیک تئیں ہی ثمنینہ کو منحوس قرار دے چکے تھے اس لیے انہوں نے بولا کہ جتنی جلدی ہو سکے

تیری کجاہنی حیران ہے

کس سے فریاد کریں

ذکرِ حضرت عباسؓ کا خیال

ایک حادثے میں اس کی الناک موت پر
ہر دل اُداس اور ہر آنکھ اٹکلبار تھی

فیضانِ حسینِ عثمانی

رہا تھا۔ اُس وقت اس کے والد بھی گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ کام پر گئے ہوئے تھے۔ علی روز کی طرح آج بھی کھیلنے باہر نکلا تھا، مگر وہ آج خامسی دیر ہو جانے کے باوجود لوٹا نہیں تھا جس کی وجہ سے اس کی ماں تشویش میں مبتلا تھی، علی اُن کے دل کا چین اور روح کا سکون تھا اور ہوتا بھی کیوں نہیں بڑی منت مرادوں کے بعد علی شادی کے چار سال بعد اُن کی گود میں آیا تھا۔ میاں بیوی اس کے لیے کون کون سے جتن نہیں کیے تھے ڈاکٹر پر ڈاکٹر ہوئے تو روحانی علاج بھی پیچھے نہیں رہے، دلیوں کے دربار میں بھی حاضر یاں دیں تو اللہ کے سامنے بھی سجدہ ریز ہو کر گڑ گڑا کر دعائیں مانگیں مگر بس اللہ کے یہاں دیر تھی اور پھر چار سال کے بعد علی نے اُن کے آئین میں آنکھ کھولی تو دونوں میاں بیوی نے پیٹکڑوں نہیں چڑا رہیں لاکھوں بار اپنے رب کا شکر ادا کیا، اور پھر جب علی تین سال کا ہوا تو اللہ نے اُن کو رانو کی صورت میں ایک رحمت اور عطا کر دی، اب رحمت اور اللہ کی نعمت دونوں موجود تھے، بیٹا بھی اور بیٹی بھی دونوں میاں بیوی اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا وہ ہر وقت اپنے پاک پروردگار کا شکر ادا کرتے رہتے تھے کہ اللہ نے اُن کے سُوئے آئین

”ارے ارے دیکھو وہ بچہ کھیلے کھیلے کر گیا ہے“ جلدی اٹھاؤ اُس کو۔“ ایک ساتھ کئی دکانداروں نے دور سے دیکھ کر آوازیں لگائیں اور ایک دم کئی لوگ اُس طرف بھاگے، جہاں ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ لوگوں نے اُس کو اٹھانا چاہا مگر پیچھے ہٹ گئے وہ بچہ بجلی کے ٹوٹے ہوئے تار میں الجھ کر گرا تھا، اُس کو کرنت لگا تھا، پتہ نہیں زندہ بھی تھا یا نہیں فوراً بجلی کے جھکے والوں کو بلوایا گیا، جو کہ دو دن سے نہیں آ رہے تھے جب سے تار ٹوٹا تھا پتہ نہیں اس وقت فوراً کسے آگے انہوں نے علاقے والوں کے ساتھ بچے کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔
بچہ اسپتال پہنچنے تک درِ فانی سے کوچ کر چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ارے رانو دیکھ تو علی اب تک واپس نہیں آیا“ اتنی دیر تو نہیں لگا تا کھیل کود کر جلدی گھر آ جاتا ہے۔
”علی کی والدہ نے اپنی چھوٹی بیٹی سے کہا تھا۔“
”ارے اماں بھیا آ جائے گا تو فکر نہ کر۔“ یہ کہہ کر وہ کھیل میں لگ گئی تھی۔ علی کی ماں کا دل بہت گھبرا

کی ڈیڈ باڈی گھر لے کر جاؤں گا۔“ سعید کے پڑوسی انور نے روتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ بچکی والے نا اہل لوگ ہیں، ان کو انسانی جانوں کی پروا نہیں ہے تار ٹوٹنے پڑے ہیں اُس کی اطلاع لینی بار بجھے کو دی مگر اُن کے کان پر جوں ہی نہیں رسکتی، اُن کی لاپرواہی ہے ایک معصوم کی جان چلی گئی۔“ یہ دکاندار احمد کی آواز تھی۔

اُسی وقت ایک پڑوسی دکاندار کے ساتھ سعید کی اسپتال میں آمد ہوئی تھی۔

”کیا ہوا تم مجھے اسپتال کیوں لائے ہو اور پار انوار تم سب یہاں کیا کر رہے ہو۔“ سعید نے مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر حیرانگی سے سوال کیا تھا۔ میں نے اُس کے لیے راستہ چھوڑا تو اُس کی نظر جب اپنے نخت جگر علی کی لاش پر پڑی تھی وہ دھائیں مار مار کر رونے لگا تھا۔

”میرے لال تجھے کیا ہو گیا تو صبح تک تو اچھا بھلا

میں خوشی کے پھول کھلائے اُن کو اولاد کی دولت سے نوازا۔

سعید دن رات محنت کر کے اپنے بچوں کو اچھا پڑھانا اور اچھا کھلانا چاہتا تھا اور وہ اس کوشش میں کامیاب تھا ان دنوں اسکولوں کی چھٹیاں تھیں تو علی روزانہ باہر کھیلنے نکل جاتا تھا اب وہ بڑا ہو رہا تھا اس لیے ماں باپ نصیحت کرتے تھے مگر بے جا روک ٹوک یا پابندی نہیں لگاتے تھے۔

”ارے انروناں اب تک علی آیا ہے اور نا ہی تیرے بابا آئے ہیں میرا تو دل ہی ڈوبا جا رہا ہے۔“

”ارے یہ بچہ کس کا ہے آپ لوگ کون ہیں اس کی ڈیڈ باڈی کون وصول کرے گا۔“ ڈاکٹر نے کاغذی کارروائی مکمل کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب اس کے والد کو ایک بندہ لینے گیا ہے، اُس غریب پر تو قیامت گزر گئی ہوگی اسے کیا معلوم ہوگا کہ وہ جو کچھ کام پر جا رہا ہے واپسی میں بیٹے



سردیوں کی بارش

سردیوں کی بارش بھی

کیا عجیب بارش ہے

آم ہیں نہ جھولے ہیں

بھینگنے کی خواہش بھی

جاگتی نہیں دل میں

بند بند کمرے میں

گرم گرم بستر میں

چسکیوں کی آوازیں

بیٹروں کی گرماش

اور بند کھڑکی سے

جھانکتی ہوئی بوندیں

جیسے کہتی ہوں آؤ

اس طرح نہیں کرتے

سردیوں کی بارش میں

اس طرح نہیں ڈرتے

قاضی اعجاز محور

تھا۔“ سعید کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ لوگوں نے علی کے باپ کو سنبھالا تھا اور ہم علی کی لاش کو لے کر اُس کے گھر آ گئے تھے۔

گھر میں اُس کی ماں کو غشی کے دورے بڑھے تھے، بہن کے آنسو اب نہیں رہے تھے علی کا باپ تم سے بڑھا تھا اسی دوران علی کے غسل کا مرحلہ طے ہوا، لوگوں نے بہت شور مچایا علاقے کے معزز لوگوں کے ذریعے رپورٹ لکھوانے کے لیے کہ ادارے کی لاپرواہی اور غیر ذمہ داری سے ایک معصوم ہستی کھیتی جان چلی گئی تھی۔ ہم اس کے ملازمین کے خلاف رپورٹ لکھائیں گے۔

علی کا باپ بس سن رہا تھا علی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارنے کے بعد وہ تم سے چور قبرستان میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اُس کو گھر چلنے پر راضی کیا تھا، گھر آ کر علاقے کے کونسلر اور ناظم وغیرہ اُسے تم کو بانٹنے کے لیے آئے تھے۔

”سعید بھائی، جیسا آپ بولو گے ویسا ہوگا اگر رپورٹ کرنی ہے تو تمھانے چلتے ہیں اپنے بیچ کے قتل کا مقدمہ درج کراؤ، تاکہ ان لوگوں کو سزا ملے ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔“

”نہیں نہیں مجھے کسی کے خلاف رپورٹ نہیں لکھوانی کیا ایسا کرنے سے علی میرا لُخت جگر واپس آ جائے گا، مجھے میرا بیٹا مل جائے گا، اور کیا قانون اُن کو فرادواقتی سزا دے گا نہیں یہاں جج کا قانون ہے، قصور اُس بجلی کے ادارے کا نہیں ہے تمام سرکاری ادارے افسران سب بے قصور ہیں قصور تو بس ہمارا ہے کہ ہم غریبوں کو اللہ نے اس زمین پر پیدا کر دیا ہے ہم غریب لوگ ان کے بے جا ظلم کا شکار ہوتے چلے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے مجھے نہیں کرانی رپورٹ۔“ علی کے باپ نے روتے ہوئے کہا تھا۔

واقعی ہمارے ملک میں قصور غربت اور غریب کا ہے، قانون بھی غریب کے لیے ان اداروں کی غفلت اور نااہلی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ کیا آپ میری اس بات سے متفق ہیں۔

روح کا انتقام

ایسی اسلام ای کی کہانی

کسی کی آہٹ قریہ قریہ پھیل رہی ہے
دیواروں کے رنگ بدلتے دکھ رہا ہوں

شیخ معظم الہی

مگر میں اپنی ضد برازار ہا چونکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اسی لیے بادلِ نخواستہ والد صاحب نے مجھے پتھر بننے کی اجازت دے دی۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ چار پانچ روز کے بعد مجھے تقرری کا آرڈر مل گیا۔ مصطفیٰ آباد (للیانی) نامی چھوٹے سے گاؤں میں پتھر کی ایک آسامی خالی تھی۔ وہیں جا کر مجھے بچوں کو پڑھانا تھا۔ للیانی کا نام سن کر والد صاحب چونک گئے تھے۔

”ایک زمانے میں ہمارے بزرگ اسی گاؤں للیانی میں رہتے تھے۔ پھر وہاں سے یہاں لاہور آ کر آباد ہو گئے۔ اب والد صاحب مجھے وہاں جانے سے صرف اس لیے روک رہے تھے کہ اب وہاں ہمارا کوئی بھی رشتے دار نہیں تھا اور مجھے وہاں رہائش کے سلسلے میں بھی سستے سے دوچار ہونا تھا۔ مگر میں نے والد صاحب کو یہ بہتر مصلحتن کر دیا تھا کہ میں اسکول میں ہی رہوں گا۔“

روانگی سے پہلے والد صاحب نے کہا: ”تو بھی للیانی نہیں گئے۔ تمہارے دادا جان کی قبر بھی وہیں پر ہے۔ اب تم جا ہی رہے ہو تو سب سے پہلے اپنے دادا جان کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا پھر گاؤں میں داخل ہونا۔“ میں نے اُن کی بات مان لی اور یقین دلایا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ اور اب میں بس میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا

یہ پُراسرار واقعہ آج سے کئی برس پہلے کا ہے۔ روای کا اصرار ہے کہ یہ تمام واقعات بالکل سچے اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ آپ بھی اسی کی زبانی سنئے۔ میری تعلیم مکمل ہوئی تو میں نے پتھر بننا چاہا..... والد صاحب کو جب میرے ارادے کا علم ہوا تو وہ بولے۔ ”تمہیں کہیں ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں، تم نے تعلیم مکمل کرنے کا شوق پورا کر لیا ہے۔ اب کاروباری دیکھ بھال میں میرا ہاتھ بناؤ۔“

میں نے والد صاحب سے کہا۔ ”نہیں ابا جان! مجھے کاروبار سے ذرا بھی دلچسپی نہیں..... میں پتھر بننا چاہتا ہوں اور بچپن سے ہی خواب دیکھتا آ رہا ہوں کہ کسی گاؤں میں جا کر علم کی روشنی پھیلاؤں۔ میں نے حکمہ تعلیم میں درخواست بھی دے رکھی ہے۔ اللہ پاک نے چاہا تو مجھے میری دل پسند ملازمت مل جائے گی۔“

والد صاحب بولے۔ ”ارے بچے پتھر کی نوکری میں کیا رکھا ہے۔ اگر تمہیں نوکری ہی کرنی ہے تو کسی آمدنی والے محلے میں کرو۔ میرا اتنا اثر و رسوخ کس کام آئے گا میں آج ہی منسٹر صاحب سے بات کرتا ہوں کہ وہ کسی ایسے محلے میں تمہارا تقرر کرادیں۔“

ایک اور قبر بھی تھی۔ میں نے ازراہ ثواب اس پر بھی فاتحہ پڑھی اور پھر گاؤں کی طرف چل پڑا۔

سورج غروب ہونے میں ابھی پونا گھنٹہ باقی تھا کہ میں گاؤں پہنچ گیا۔ میں نے گاؤں والوں کو بتایا کہ میں نیا ماسٹر ہوں اور یہاں کے بچوں کو پڑھانے آیا ہوں۔ گاؤں والے بہت عزت سے پیش آئے اور مجھے ایک اوطاق میں لے گئے۔ (اوطاق گاؤں میں خاص طور پر ایک کمرہ مہمانوں کے لیے بنائی جاتی ہے)۔

انہوں نے مجھے اوطاق میں بٹھایا اور روٹی پانی کا پوچھنے لگے۔ میں نے کہہ دیا کہ فی الحال مجھے بھوک نہیں۔ رات کو کھانا کھاؤں گا۔

آہستہ آہستہ سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ بچوں کو پڑھانے کے لیے ماسٹر صاحب آ گئے ہیں۔ بہت سے لوگ اور بچے مجھے ملنے کے لیے آ رہے تھے اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور پھر ان گاؤں والوں کی زبان سے میں نے ایک عجیب و غریب خبر سنی وہ یہ کہ اس گاؤں میں جو بھی ماسٹر آتا ہے وہ مچھان کے بعد

کہ نہ جانے قبرستان کس طرف واقع ہوگا اور میں اپنے دادا جان کی قبر کیسے پہچانوں گا کہ اتنے میں بس رک گئی تھی اور کنڈیلٹر نے آواز لگائی تھی کہ ”لیائی والے اتر جائیں۔“ اتفاق سے لیائی اترنے والا میں واحد مسافر تھا۔

میں اپنا بیگ اٹھا کر بس سے نیچے اتر گیا۔ یہاں سے ایک چکی سڑک گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں سے کافی دور برگد کا درخت نظر آ رہا تھا جس پر گدھ منڈلا رہے تھے۔

میں اسی چکی سڑک پر چل پڑا جس کے دونوں اطراف کھیت تھے۔ اسی راستے سے کچھ دور جا کر ایک قبرستان نظر آیا تو مجھے والد صاحب کی تاکید یاد آئی۔ میں قبرستان کی طرف چل پڑا۔ قبرستان کے اندر داخل ہو کر دادا جان کی قبر تلاش کرنے لگا۔ اچانک میری نظر ایک چکی قبر پر پڑی۔ میں اس کا کتبہ پڑھنے لگا۔ اس پر میرے دادا جان کا نام بمعہ ولدیت لکھا ہوا تھا۔ میں نے وہاں فاتحہ پڑھی اور دعا کی میرے دادا جان کی قبر کے پاس ہی



آئے ہوتو ہمیں خوشی ہوئی ہے کیونکہ ہمارے بچوں کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔“

گاؤں والوں کی باتیں سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی میں نے سوچا بلکہ پکا ارادہ کر لیا کہ میں اس بات کا سراغ لگا کر ہی رہوں گا کہ ماسٹر کو کون ہلاک کر رہا ہے؟ میں نے گاؤں والوں سے کہا کہ میں بھی اسی مکان میں رہوں گا جہاں دوسرے ماسٹر رہتے تھے۔ گاؤں والوں نے کہا۔

”نہیں ماسٹر صاحب! آپ یہاں اوطاق میں ہی رہیں یہ جگہ آپ کے لیے بالکل محفوظ جگہ ہے اور ٹھیک بھی..... وہ جگہ آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں آج کی رات یہاں اوطاق میں رہ لیتا ہوں..... لیکن کل تم لوگ مجھے وہ مکان دکھانا میں وہاں رہوں گا۔“

وہ بولے۔ ”جیسا آپ چاہیں۔“ اس کے بعد میں نے رات کا کھانا کھا اور سب گاؤں والوں سے کہہ دیا کہ ”کل اپنے بچوں کو تیار کر کے اسکول بیچ دینا۔ میں کل ہی سے انہیں پڑھانا شروع کروں گا..... انشاء اللہ۔“

دوسرے دن میں اسکول گیا وہ ایک چھوٹا سا اسکول تھا۔ یہاں صرف پانچ کمرے تھے۔ کرسیاں اور میزیں ٹوٹی ہوئی تھیں صبح کے نو بج رہے تھے میں دفتر میں بیٹھا اسکول کی حالت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ”السلام علیکم.....“ کی آواز پر چونک پڑا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے گاؤں کے بچے کھڑے تھے۔ جو پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اُن کے چروں سے خوشی چھلک رہی تھی۔ میں نے انہیں بیٹھنے اور اپنا تعارف کروانے کو کہا کچھ اور بچے بھی آگئے۔ سب بچوں نے اپنا تعارف کروایا۔ ان کی خوشی دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ انہیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ پہلا دن تو تعارف میں گزر گیا پھر میں بچوں کو چھٹی دے کر اسکول سے باہر آیا اور لوگوں سے کہا کہ ”مجھے اللہ دتا کے گھر لے چلو میں اس مہر کی صفائی وغیرہ کر کے آج سے وہیں پر رہوں گا۔“

گاؤں کے دو آدمیوں نے مجھے اللہ دتا کے گھر پہنچا دیا۔ اس گھر پر پہنچ کر میں نے اُن آدمیوں کو واپس کر دیا۔ پھر میں اس گھر کا معائنہ کرنے لگا اس کے کچن میں برآمدہ کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں بس

پڑا سر اطور پر ہلاک ہو جاتا ہے۔ میں نے سوچا یقیناً یہاں کوئی ایسا آدمی ہوگا جسے یہ بات پسند نہ ہو کہ یہاں کے بچے تعلیم حاصل کریں اور ان لوگوں سے میں نے یہ بات کہی۔ مگر ایک بزرگ نے کہا۔

”جی نہیں! یہ کسی ہوائی مخلوق کا کام لگتا ہے کیونکہ ہلاک ہونے والے کے جسم پر کوئی زخم نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے اس بزرگ سے پوچھا کہ ”وہ ماسٹر جب آتے تھے تو وہ رہتے کہاں تھے؟“

بزرگ نے بتایا کہ ”وہ اُس مکان میں رہتے تھے جو یہاں سے تھوڑی دور واقع ہے اور کچھ عرصے سے خالی پڑا ہوا ہے۔ کافی عرصہ پہلے وہاں پر اللہ دتا نامی ایک شخص اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا اور اپنی زمین پر کھیتی باڑی کیا کرتا تھا۔ ایک دن اُس کی بیٹی زہرا قرہی جنگل میں لکڑیاں لینے گئی جب وہ کافی دیر تک واپس نہ آئی تو اللہ دتا زہرا کی تلاش میں گیا تو اسے جنگل کے پاس کھیتوں میں اپنی بیٹی کی لاش ملی جو بہت بری حالت میں تھی۔ اللہ دتا نے جب اپنی بیٹی کی لاش کی یہ حالت دیکھی تو وہ صدمے سے پاگل ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں سارے گاؤں والے بھی وہاں پہنچ گئے اور پھر ہم لوگ زہرا کی لاش کو اٹھا کر اُس کے گھر لے آئے۔ جب زہرا کی ماں نے اپنی بیٹی کی لاش دیکھی تو وہ جہاں تھی وہیں گئی اور پھر نہ اٹھ سکی۔ ایک گھر سے دو جنازے نکلے تو اللہ دتا جو پہلے ہی پاگل ہو چکا تھا اُس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ اس واقعے کے ایک ہفتے کے بعد اللہ دتا بھی اس دنیا سے چلا گیا اور وہ مکان خالی ہو گیا۔ پھر گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ یہ گھر ماسٹر کی رہائش کے لیے دے دیئے ہیں یہاں وہ آرام سے رہے گا اور پھر سب سے پہلے جو ماسٹر آیا تھا وہ بہت شریف آدمی تھا۔ اس نے اپنے اخلاق سے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ اس کے آرام کا خیال رکھتے تھے لیکن ایک ہفتے کے بعد اس گھر سے اس کی لاش ملی جو پڑا سر اطور پر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تین ماسٹر اور آئے وہ بھی اسی گھر میں ٹھہرے تھے وہ تینوں بھی پڑا سر اطور پر ہلاک ہو گئے۔ پھر چار سال گزر گئے ادھر کوئی ماسٹر نہیں آیا۔ آج تم

جبکہ محن کا بلب جل رہا تھا۔ میں چار پائی سے اٹھنے ہی والا تھا کہ کمرے کا بلب روشن ہو گیا۔ میرے وجود میں سنسنی دوڑ گئی لیکن میں نے خوف کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ہمت کر کے کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر محن میں مجھے کوئی نظر نہیں آیا اس کے بعد میں نے باورچی خانے میں جھانک کر وہاں نظر دوڑائی تو کوئی نظر نہ آیا تو میں واپس آ کر بستر پر لیٹ گیا کہ وہیں بدلتے بدلتے صبح ہو گئی تھی۔

سارا دن میں گزشتہ رات کے واقعات کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس کے بعد دو دن تک پھر کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی۔ دو دن کے بعد جب میں رات کو سو رہا تھا تو اچانک رات کے کسی پہر دروازے پر دستک ہوئی۔ میری آنکھ فوراً کھل گئی میں سوچنے لگا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ میں ہمت کر کے دروازے پر آ گیا اور پھر سوچنے لگا کہ دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں۔ اچانک مجھے ایسا لگا کہ کوئی دروازے کے پاس سے گزر کر آگے چلا گیا ہو۔ میں نے فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل کر دائیں بائیں دیکھا لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا میں واپس گھر میں آیا۔ اچانک مجھے ایسا لگا کہ جیسے دوسرے کمرے میں کوئی ہو، حالانکہ باہر سے دروازہ بند تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا پھر بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی میرے آس پاس موجود ہے۔

میں نے اللہ کا نام لے کر اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کرتے ہوئے زوردار آواز میں پوچھا تھا۔
 ”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟ تم جو کوئی بھی ہو میرے سامنے آؤ اور بتاؤ تم نے یہ کیا ڈرامہ رچایا ہوا ہے؟“ تھوڑی دیر کے بعد میرے سامنے ایک لڑکی نمودار ہوئی تھی جو سفید لباس میں ملبوس تھی اسے دیکھ کر میرے دل میں خوف کی لہر اٹھی اور دھڑکن مزید تیز ہو گئی۔
 ”میں زہرا ہوں اللہ داتا کی بیٹی! میں چاہتی ہوں کہ یہاں کوئی ماسٹر نہ آئے جو بھی ماسٹر آئے گا میں اسے ختم کر دوں گی۔“ میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔
 ”ماسٹروں کو تم نے ہلاک کیا ہے؟ لیکن کیوں؟“ اس لڑکی نے کہا۔

”تم جاننا چاہتے ہو تو پھر سنو! میں یہاں اس گھر میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک دن ہمارے

سے اترتا تو مجھے دوسرے یہی درخت نظر آیا تھا۔ اس گھر کے دو کمرے تھے محن کے ایک کونے میں گارے کا بنا ہوا باورچی خانہ تھا۔ محن کے دوسرے کونے پر غسل خانہ تھا۔ کمرے بھی کچے تھے جبکہ محن میں تین چار پاریاں پڑی ہوئی تھیں۔

لوگوں کا کہنا تھا کہ اس گھر میں عرصے سے کوئی نہیں رہا۔ لیکن اس گھر کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ جیسے کوئی یہاں رہتا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر بڑے سلیقے سے رکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے تھوڑی دیر پہلے کسی نے آگ جلائی ہو۔ یہ سب دیکھ کر میرے دل میں ایک انجانے خوف کی لہر دوڑ گئی اور میں سوئے لگا۔

”آخر یہ سب کیا ہے؟“ مجھے گھر کی صفائی کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ گھر پہلے سے ہی صاف ستھرا تھا۔ پھر میں اس گھر سے نکلا اور جا کر ادھاق سے اپنا بیگ لے کر واپس آ گیا۔

رات کو گاؤں کا ایک آدمی میرے لیے کھانا اور بستر لے آیا تھا۔ میں نے کھانا کھا کر برتن اس آدمی کو واپس کر دیے۔ برتن لے کر آدمی واپس چلا گیا تو میں نے ایک چار پائی درخت کے نیچے رکھی اور اس پر بستر بچھا کر سو گیا۔ کیونکہ گرمیوں کا موسم تھا اور اندر گرمی لگ رہی تھی۔ لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے نیند آ گئی اور پھر نہ جانے رات کے کون سے پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی اور میں اٹھ بیٹھا۔

وجہ یہ تھی کہ اس برنگلہ کے درخت کی ایک چھوٹی سی ٹہنی میرے اوپر آگری تھی۔ میں سوچنے لگا کہ وہ ٹہنی میرے اوپر کیسے آگری؟ حالانکہ ہوا برائے نام تھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ پتھر کیا ہے؟ سوچتے سوچتے میں پھر سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو تجربی اذان ہو رہی تھی۔ وضو کر کے میں نے فوراً نماز پڑھی میں نے دیکھا کہ برنگلہ کے درخت کے بہت سارے پتے نیچے زمین پر پھیرے ہوئے ہیں جیسے رات کو تیز ہوا چلی ہو، لیکن حقیقت یہ تھی کہ رات کو تیز ہوا نہیں چلی تھی۔

دوسری رات میں کمرے کے اندر سو گیا۔ کمرے کا بلب میں نے جلا دیا تھا۔ رات کے کسی پہر میری آنکھ کھل گئی تو میں نے دیکھا کہ کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے

”ماستر میں تمہیں پہلی رات ہی ہلاک کر دیتی لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں مارا کہ جب تم اس گاؤں میں آ رہے تھے تو راستے میں تم قبرستان گئے اور تم نے اپنے دادا جان کی قبر پر فاتحہ پڑھی اس قبر کے پاس ہی میری قبر ہے تم نے میری قبر پر بھی فاتحہ پڑھی اس فاتحہ سے مجھے کچھ سکون ملا تھا۔“

”دیمھو زہرا! تم یہ سب ٹھیک نہیں کر رہی ہو۔“ میں نے اُسے سمجھانا چاہا۔

”بلاوجہ بے گناہ آدمیوں کے خون میں اپنے ہاتھ رنگ رہی ہو۔ تم نے اپنا انتقام پہلے ماسٹر کو مار کر لے لیا ہے لیکن دوسروں کو تم کیوں اپنے انتقام کا نشانہ بنا رہی ہو؟ جن بے گناہوں کو تم نے مارا ہے سبھی ان کے گھر والوں کے بارے میں سوچا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے واحد نقلی ہوں ان کے مرنے کے بعد ان کے گھر میں کیسے حالات ہو گئے ہوں۔ کیا تم نے سوچا ہے جن کو تم نے مارا ہے کیا ان کے والدین انہوں کے قاتل کو بدعائیں نہیں دیتے ہوں گے اور دینی ماں کی بدعا آسان میں شکاف کر دیتی ہے تم نے اللہ پاک کو کیا جواب دو گی؟ اور اگر گاؤں میں ماسٹر نہیں آئے گا تو اس گاؤں کے بچے کبھی پڑھ نہیں سکیں گے ہمیشہ جاہل رہیں گے۔ جس کی ذمہ داری صرف تم پر ہوگی۔“ میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔

”تم سچ کہہ رہے ہو میں انتقام کی آگ میں اندھی ہو چکی تھی۔ اس لیے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا میں اللہ پاک سے معافی مانگتی ہوں میں اب کسی کو نہیں ماروں گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

”میں نے اسے کہا۔“ چھوٹا ہوا کہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا میری دعا ہے کہ اللہ پاک تمہیں معاف کر دے۔“ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

اس واقعہ کو آج پندرہ سال ہو چکے ہیں اب اسکول میٹرک تک ہو چکا ہے اور یہاں کاشمیر ہینڈ ماسٹر ہوں اور اسی گھر میں رہ رہا ہوں میری بیوی بچے میرے ساتھ ہیں۔ آج مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو ایک ٹھنڈی آنسو بھرتا ہوں۔

☆☆.....☆☆

گاؤں میں ایک ماسٹر آیا جس کا نام اشفاق احمد تھا جو شکل سے نہایت ہی شریف اور بااخلاق لگتا تھا۔ مگر اندر سے بہت ہی بدنیت تھا۔ جس کا گاؤں والوں کو علم نہیں تھا۔ میں بابا کے ساتھ جنگل سے لکڑیاں لینے جایا کرتی تھی۔ ایک روز بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ لہذا مجھے اکیلے ہی جانا پڑا میں نے جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے گٹھا بنایا اور اسے بڑی مشکل سے اٹھا کر سر پر رکھا اور گھر کی طرف چل پڑی۔ ابھی میں کچھ ہی دور گئی تھی کہ میرے سر سے لکڑیوں کا گٹھا کھل کر گر گیا میں نے اسے ہاندھ کر اٹھانا چاہا لیکن اسے دوبارہ اٹھانہ سکی وہ بہت بھاری تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا شروع کر دیا کہ کوئی آ رہا ہو تو وہ گٹھا اٹھوادے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک آدمی اس طرف آ رہا ہے۔ وہ قریب آیا تو میں نے اُسے پہچان لیا وہ ہمارے گاؤں کا اسکول ماسٹر اشفاق احمد تھا۔ اس نے جنگل میں مجھے اکیلا دیکھا تو اُس کے دل میں چھپی خباث ظاہر ہو گئی۔ وہ مجھ سے بد مزیزی کرنے لگا تو میں نے اسے زوردار پھینچ مارا وہ غصے سے تھلا اٹھا۔ اُس نے مجھے پڑایا اور میرا گلا گھونٹ کر مجھے ہلاک کر دیا۔ گاؤں والوں کو پتہ نہ چل سکا کہ میرے ساتھ ظلم کس نے کیا ہے؟ اُس کی وجہ سے میرے ماں باپ بھی چل بے اور ہمارا گھر ویران ہو گیا۔ پھر ماسٹر اشفاق احمد جب میرے گھر میں رہنے لگا تو میرے انتقام کی آگ مزید تیز ہوئی اور میں انتقام کی آگ بجھانے وہاں پہنچ گئی اور اسے نہایت بے دردی سے ہلاک کر دیا پھر میں نے اپنے گھر میں ہی بیہرا کر لیا۔ اس کے بعد یہاں ایک اور ماسٹر قدر آ گیا اور وہ بھی اس گھر میں رہے لگا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ بھی گاؤں کی کسی معصوم لڑکی کو تلک نہ کرے۔ اس لیے میں نے اسے بھی اپنے انتقام کا نشانہ بنایا اس کے بعد دو اور ماسٹر ماجد اور مظہر آئے ان کو بھی میں نے انتقام کی آگ میں جلادیا۔ پتہ نہیں کیوں میرے اندر کی آگ بجھ نہیں رہی شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے کسی بھی شہری آدمی پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں تو مریچکی ہوں مگر دوسری لڑکی کا مذاق ہونے نہیں دیکھ سکتی۔“ یہ کہہ کر زہرا در بھری سسکیاں لینے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں بہر حال میں نے اپنا اعتماد بحال کر لیا تھا۔ وہ پھر بولی۔

دھری ناناں تین کھانی حیران پارے

حاصل الا حاصل

محمد نیر و شاہ کا شعر

شام اُس کے نام کی ہراز حیرت رہ گئی
بھولنے کو بھی کوئی تو نسبت رہ گئی

کائنات بھی

کمرے سے نکلا تھا۔ نیچے اُس کی ماں کا کمرہ تھا زوار نے کمرے کے بند دروازے پر زور سے دستک دی تھی مگر دروازہ نہیں کھلا اب وہ امی کی آواز کے ساتھ دھڑا دھڑ دروازہ بجا رہا تھا شادی کے پنگامے میں بہت دنوں تک سب ٹی نیندیں حرام ہوئی تھیں۔ سواب فارغ ہو کر سب مُردوں سے شرط لگا کر سوائے ہوئے تھے۔

”کیا مصیبت آ پڑی ہے جو دروازہ توڑ رہے ہو۔“ سیدہ بانو نے سوئی جالی کیفیت میں دروازہ کھولا تھا۔

”امی! وہ وہ پارس بے ہوش ہو گئی ہے۔“ اور پھر وہ سیدہ بانو کا ہاتھ تھامے انہیں اوپر لے جا رہا تھا۔ اور جب وہ زوار کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں تو بیڈ پر موجود بے ہوش پارس کو دیکھ کر زوار کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا تھا کہ وہ گڑ بڑا گیا تھا۔

”امی یہ مجھے دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی ہے میں نے اسے کچھ نہیں کیا۔“

”ایسے کیسے بے ہوش ہو گئی تمہیں دیکھ کر تم نے ضرور اس کے ساتھ کوئی شرارت کی ہو گئی تمہیں تو عادت ہے نت نئے ڈرامے کرنے کی۔“

میں جملہ عروسی میں دلہن بنی بیٹھی تھی زوار کا انتظار کرتے ہوئے بے انتہا خوش تھی کہ جس کی میں نے چاہت کی وہ میرا ہو گیا تھا زوار کے تصور سے ہی میرے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔ اسی وقت دروازہ کھلا تھا وہ آہستہ آہستہ بیڈ کی طرف بڑھ رہا تھا اُس کے قدموں کی آہٹ سے میرا دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا وہ بیڈ پر میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میرا جھکا سر مزید جھک گیا۔ زوار نے چپے ہی جھگوٹھٹ اٹھایا تھا میرے حلق سے ایک چیخ نکلی تھی۔ میں اپنے حواسوں پر قابو نہ رکھ سکی اور بے ہوش ہوئی۔

☆.....☆.....☆

زوار حیران و پریشان تھا کہ پارس مجھے دیکھ کر چیختے ہوئے بے ہوش کیوں ہو گئی۔

”پارس پارس! اٹھو کیا ہوا؟“ زوار اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی منرل واٹر کی بوتل اٹھائی تو ڈرا سا پانی گلاس میں ڈال کر وہ پارس پر چھڑکنے لگا، مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ ہنوز بے ہوش تھی۔ زوار بوکھلا گیا کہ آخر میں اسے کیسے ہوش میں لاؤں۔ میں امی کو چکا کر لے آتا ہوں۔“ یہ خیال آتے ہی تیزی کے ساتھ

”ای میں ہی تھا اور کس کو ہونا تھا بھلا؟“ زوار کے لہجے میں غصہ اور شرمندگی چھپی ہوئی تھی۔
 ”پارس تم ذرا میری طرف دیکھو۔“ اب وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

پھوپھو کی گود میں سر چھپائے سسل روئے جاری تھی۔ انہوں نے جیسے تیسے میرا چہرہ اوپر کیا، اب جو میں نے زوار کو دیکھا تو وہاں سب کچھ ٹھیک تھا، خوف کے سائے میرے چہرے سے دور ہو گئے۔

”اب بتاؤ کیوں ڈر گئی تھیں؟“ پھوپھو نے بہت پیار سے پوچھا تھا اس دوران ہی زوار میرے برابر میں ہی بیٹھ گیا۔

”پھوپھو زوار نے جب میرا گھونگھٹ اٹھایا اور میری نظران کے چہرے پر بڑی تو وہاں بہت ہی بھانک جانور کی شکل تھی اس لیے میں خوف سے بے ہوش ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ ذہنی ٹینشن کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔“ میں نے دے دے لہجے میں کہا تھا۔

”دیکھو بیٹا! زوار بالکل ٹھیک ہے اب تم آرام کرو میں بھی سونے جا رہی ہوں۔“ پھوپھو نے آئی

سیدہ بانو کو یقین تھا کہ زوار نے ضرور پارس کے ساتھ کوئی خطرناک شرارت کی ہے، جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ انہوں نے پارس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تھے، مگر پھر بھی اُسے ہوش نہ آیا تھا، وہ اب پارس کے سر ہانے بیٹھ کر قرآنی آیات پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھیں۔

جب مجھے ہوش آیا تھا تو میں نے اپنے سر ہانے اپنی پھوپھو کو بیٹھے دیکھا تھا۔ میری نظر پھولوں سے سجی چھت پر لگی تھی تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا یاد آنے پر میں نے خوف سے جھرجھری لی تھی۔

”پارس بیٹا بتاؤ کیا ہوا تھا جو تم بے ہوش ہو گئیں؟“

”پھوپھو..... وہ زوار.....“ میں آگے بول نہیں پاری تھی۔

”بتاؤ بیٹا..... زوار نے تمہارے ساتھ؟“

”پھوپھو میرا گھونگھٹ اٹھانے والے زوار نہیں تھے۔“ یہ کہہ کر میں ہچکچوں سے رونے لگی تھی۔ سیدہ بانو نے حیرت سے بھری سوالیہ نظروں سے زوار کو دیکھا۔



جس کے دو بچے بھی تھے۔ اُس بے چاری کو ڈر تھا کہ زوار تک آ کر مجھے طلاق نہ دے دے اگر مجھے طلاق ہوئی تو میرا بھائی ہاشم اُسے نہ چھوڑ دے۔

ان تمام حالات سے پریشان میری والدہ مجھے ادھر ادھر دم و درود کے لیے بھی لے گئی تھیں۔ مجھے نفسیاتی ڈاکٹر کو بھی دکھایا مگر میرا مسئلہ جوں کا توں تھا۔ اور پھر آخر کار تک آ کر میں نے خود زوار کی زندگی سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں شادی کے تین مہینے بعد بھی اُن چھوٹی تھی زوار اگر یہ تمام صورت حال اب تک برداشت کرتا آ رہا تھا تو صرف اپنی بہن صفیہ کے لیے کہ مجھے طلاق دینے کی صورت میں نہیں اُس کا گھر برادہ نہ ہو جائے، سو میں نے خود زوار سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ جسے اُس نے فوراً قبول کر لیا تھا اور مجھے طلاق دے دی تھی یوں طلاق کے بعد بھی ہمارے گھرانوں میں رجس نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ سب مجھے ہی قصور وار سمجھتے تھے۔

اب پورا خاندان اور محلے والے مجھے برا سمجھتے تھے۔ سب کا مشترکہ خیال یہی تھا کہ شادی سے پہلے ضرور میرا کسی کے ساتھ چکر ہوگا، یہ شادی ماں باپ کے مجبور کرنے پر میں نے کر لی ہوگی اور پھر ایک نالک رجا کر طلاق لے لی تھی جبکہ میں زوار سے الگ ہو کر بالکل ٹوٹ گئی تھی، ہم دونوں کے بیچ کوئی عہد و پیمانہ تو نہ ہونے تھے مگر ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ میں نے تو بھی زوار کے علاوہ اور کسی کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔

کسی طلاق یافتہ لڑکی کی دوسری شادی کوئی مشکل بات نہیں اگر میرے دامن پر بدنامی کا داغ نہ لگا ہوتا تو شاید میری بھی دوسری شادی کے لیے رشتے آتے کہتے ہیں نہ کہ بد اچھا بدنام برا، میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اور پھر جب طلاق کے تقریباً دو سال بعد میرا ایک رشتہ آیا تو میرے والدین نے بغیر کسی چھان بین کے فوراً ہی قبول کر لیا، جبکہ میں نے بھی ماں باپ کی خوشی کے لیے ہامی بھری تھی۔

شادی کے بعد گزرے چھ مہینوں میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری شادی ایک نشہ کرنے والے

جمائی کو روکتے ہوئے کہا تھا۔

”پھوپھو! مجھے ان کے ساتھ اکیلے میں ڈر لگے گا آپ میرے ساتھ سو جائیں۔“ جیسے ہی وہ کمرے سے جانے لگیں تھیں میں نے انہیں روکتے ہوئے کہا تھا۔

”بیٹا! یہ تم کیسے بچنے کی باتیں کر رہی ہو آج تمہاری سہاگ رات ہے میں اگر تمہارے ساتھ سو جاؤں تو گھر میں جو مہمان ٹھہرے ہیں اُن میں سے اگر کسی کو پتا چل گیا تو کیا سوچیں گے۔“ پھوپھو مجھے بہت نرمی سے سمجھا رہی تھیں۔

”امی آپ یہاں سو جائیں۔ پارس بہت خوفزدہ ہے، میں ساتھ والے کمرے میں سو جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر زوار کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ کوئی ایک رات کی بات نہ تھی، اب جب بھی زوار رات کو اکیلے میں میرے پاس ہوتا تو میں اُسے دیکھ کر چیخنے چلانے لگتی۔ اب میں پہلے کی طرح بے ہوش تو نہیں ہوتی تھی مگر چپیں مار کر کمرے سے نکل جاتی تھی، رفتہ رفتہ سب گھر والے مجھ سے عاجز آ چکے تھے۔

”پاس اگر نہیں میرے ساتھ رہنا نہیں تھا تو مجھ سے شادی کیوں کی؟ کسی نے زبردستی تو نہیں کی تھی تمہارے ساتھ تمہاری اپنی مرضی سے یہ شادی ہوئی ہے، پھر کیوں ایسے ڈرامے کرنی ہو، برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے میں اب اور کتنا برداشت کروں؟“ اُس روز زوار کا ضبط جواب دے گیا تو وہ مجھ پر پھٹ پڑا۔

”زوار میرا یقین کرو میں جان بوجھ کر اپنا نہیں کرتی، میں تو آپ سے شروع سے محبت کرتی تھی میں بہت خوش تھی مگر پتا نہیں کیسے رات کو آپ کی شکل بڑے ہی ڈراؤنے جانور جیسی ہو جاتی ہے۔“ زوار میری یہ بات سن کر چہرہ پختا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

اس صورت حال سے میں خود بہت تک آگئی تھی۔ مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس مسئلے کی وجہ سے دونوں گھرانے بہت زیادہ پریشان تھے۔ میری بھائی صفیہ زوار کی بہن تھی

حب چوکی میں ایک ہندو عامل ہے جو گارٹی والا کام کرتا ہے میں سیکلی کے ساتھ اُس عامل کے پاس پہنچی مجھے پارس کو مروانا نہیں تھا صرف اپنے راستے سے ہٹانا تھا عامل نے کہا تھا کہ بیس دن کے اندر میرا کام ہو جائے گا۔ مگر اُس نے اس کام کے لیے جو رقم مانگی وہ زیادہ تھی، مطلوبہ رقم حاصل کرنے میں مجھے دو مہینے لگ گئے تھے یہ رقم میں نے کیسے حاصل کی یہ ایک الگ کہانی ہے، اسی دوران زوار اور پارس کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی، میں نے رقم جا کر ہندو عامل کو دی اور اس نے جو کہا تھا وہی ہوا، شادی کی پہلی رات ہی پارس زوار کی بھینک شکل دیکھ کر ڈر گئی تھی زوار کو خود پتا نہیں چلتا تھا کہ پارس کے ساتھ تنہائی میں اُس کی شکل نہایت ہی بھینک جتانور جیسی ہو جاتی تھی۔ اس سارے کھیل کا نتیجہ اُن دونوں کے درمیان طلاق کی صورت نکلا، پارس نے خود ہی اس لیے سب کی نظر میں اُس کا کردار مشکوک ہو گیا اور پھر زوار خود بخود میری طرف کھینچتا چلا آیا ہندو عامل نے نکل ہی ایسا کیا تھا، میری اور زوار کی شادی ہو گئی ہمارے تین بچے بھی ہو گئے اور آج میں اُس کے ساتھ ایک خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوں۔“

”تم نے کی زبانی اُس کا کارنامہ سن کر مجھ پر کتنے طاری ہو گیا اُس نے میرے ساتھ جو کیا تھا وہ ہرگز قابل معافی نہ تھا“ کتنے فخر سے وہ اپنا کارنامہ بتا رہی تھی اُسے اپنے کیے پر ذرا بھی ندامت نہ تھی بلکہ اُسے اپنے کارنامے پر فخر تھا۔

”میں ہمیشہ سے مکافات عمل پر یقین رکھتی ہوں، تم سبھی نہ تھی تو مکافات عمل کی پکڑ میں آئے گی اور اگر اس دنیا میں سچ بچ گئی تو آخرت میں تو اُسے اپنے کیے کا حساب دینا ہی ہوگا، میرا کیا ہے آج میرے بچے چھوٹے ہیں شوہر نشئی اور جواری ہے تو میں مصائب میں گھری ہوئی ہوں کل میرے بچے جوان ہو جائیں گے تو میرا سہارا نہیں گے۔ اگر اس دنیا میں مجھے راحت نصیب نہ ہوئی تو کیا ہوا آخرت میں مجھے اجر مل جائے گا۔“

☆☆.....☆☆

بہت ہی غلط آدمی سے ہوئی ہے۔ مگر میں ہر صورت میں اُس کے ساتھ گزارہ کرنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ اب میں اُس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

☆.....☆.....☆

”محبوب کو حاصل کرنے کی لگن اگر بچی ہو تو ناکامی ہمیں چھو کر نہیں گزرتی، میری مثال تمہارے سامنے ہے مجھے زوار سے عشق تھا، میں اُسے حاصل کرنے کے لیے آخری حد تک لگی اور آخر کار کامیاب ہو گئی۔“ تم نے لہجے میں اپنی محبت حاصل کرنے کا غور تھا۔

”تم! آخر ایسا تم نے کیا کیا کہ جو زوار تمہاری صورت پر ایک نظر کے بعد دوسری نظر ڈالنا گوارا نہ کرتا تھا، اُس نے تم سے شادی بھی کر لی۔“ یہ سوال کرنے والی شاید بہت عرصے کے بعد تم سے ملنے والی اُس کی کوئی پرانی سہیلی تھی۔

کسی کی باتیں کان لگا کر سننا بہت معیوب بات ہے مگر زوار کے ذکر پر میرا تجسس بڑھ گیا تھا، تم کو میں جانتی تھی وہ زوار کی بڑی بہن عارفہ کی صرف نند ہی نہیں تھی اب کافی عرصے سے زوار کی بیوی اور اُس کے تین بچوں کی ماں تھی۔ میں اُس وقت اپنے چاچا کے بیٹے کے ویسے میں شریک تھی۔ جس کا انتظام باہر گلی میں ہی شامیانہ لگا کر کیا گیا تھا۔ میں تم کے ذرا پیچھے ہی بیٹھی تھی۔ اور شاید اس بات کا تم کو اندازہ نہ تھا۔ اس لیے وہ برسوں بعد ہی سیکلی کو اپنی یہ کہانی سنا رہی تھی۔

”تمہیں تو پتا ہے میں زوار کی محبت میں شروع ہی سے جھٹلائی مگر اُس نے مجھے کبھی لفت نہ کرائی، اُس کی بڑی بہن جو میری بھائی ہے میں اُس کے بھی بہت آگے پیچھے پھری، مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا کیونکہ میں عمر میں زوار سے پانچ سال بڑی تھی۔ اور پھر جب مجھے زوار اور پارس کی منگنی کا پتا چلا تو میری جو حالت ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتی عارفہ بھائی کو اندازہ تھا کہ میں زوار کو چاہتی ہوں پھر بھی انہوں نے میرے رشتے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اب جو کرنا تھا مجھے خود کرنا تھا اور پھر مجھے اپنی ایک سہیلی کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ

تیسری ناقابل یقین کہانی کرچی سے

وہ میری سہیلی

حسن بھوپالی کا شعر

وہ تھا جو خواب سہانا عجیب لگتا ہے
گزر گیا جو زمانہ عجیب لگتا ہے

فرح انیس

میں کچھ مالی بدد حاصل کرنے کے خیال سے تاپا تائی کے ہاں بھی گئیں تھی پر اُن کا نہایت ہی برا رویہ دیکھ کر میری کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اور مایوس ہی واپس آ گئی تھی۔ اس ساری صورت حال نے مجھے رُلا دیا تھا۔ مجھے لگتا میں بالکل تنہا ہو گئی ہوں۔

ایک دن میں علی کو سلا کر بیڈ پر اداس سی بیٹھی تھی کہ میری نگاہ دیوار پر موجود چھپلی پر جا ٹھہری تھی۔ اب آپ اسے میرا اکل پن سمجھیں یا کچھ اور..... میں اُس چھپلی سے مخاطب ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگی تھی۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے، تم ہی بن جاؤ میری سہیلی، میری عکس را در مددگار.....

اُس دن میں نے چھپلی سے ڈھیر ساری باتیں کی تھیں اور پھر میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ میں جب بھی کام سے فارغ ہوتی اُس چھپلی سے ڈھیر دن باتیں کر کے اپنا دل ہلکا کر لیتی تھی۔

ایک رات میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی، میری دوسری اولاد کے دنیا میں آنے کا وقت آ گیا تھا۔ محلے والوں نے مجھے ایک سرکاری زچہ خانے میں داخل کرادیا تھا، جہاں میں نے اپنے دوسرے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

میری خالہ کو کسی عورت نے یہ کہانی سنائی تھی میں یہ کہانی اُسی عورت کی زبانی بیان کر رہی ہوں۔
”میرا نام صائقہ ہے میرے ماں باپ بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔“

”میری پرورش تایا تائی نے کی تائی کا میرے ساتھ کوئی زیادہ اچھا سلوک نہ تھا۔ خیر جب میں اٹھارہ برس کی تھی تو تائی نے میری شادی کر دی۔ شادی کے بعد تو میری زندگی ہی بدل گئی۔ میرے شوہر امجد نے مجھے اتنی زیادہ محبت دی کہ تایا کے گھر میں اٹھانی ہوئی تکلیفوں کو میں بھول گئی۔ میری زندگی میں مزید بہار اُس وقت آ گئی جب میں پہلے بیٹے کی ماں بنی تھی۔

میری زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی، مگر وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا، ہمارا بیٹا علی چار سال ہو گیا تھا اور میرے ہاں دوسرے بچے کی ولادت ہونے والی تھی کہ میرے شوہر امجد کا ایکسڈینٹ ہو گیا اس حادثے نے ان کی جان لے لی میری ہنسی بستی زندگی کا ایک اجز گئی تھی۔ مجھے تو جیسے کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا۔ گھر کا سائیں پیسہ کمانے والا نہ رہا تو تین وقت کی روٹی کھانی بھی مشکل ہو گئی۔ مجھے علی کے ساتھ اب دوسرے بچے کی فکر بھی تھی، جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہ تھا

ڈسی ہوئی تھی اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آج سے میں تمہاری اور تم میری سبیلی ہو اور اب میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں ہی رہوں گی۔ اُس عورت جس نے اپنا نام صفیہ بتایا تھا اُس کی باتوں میں کچھ ایسا اثر تھا کہ میں جواب میں کچھ کہہ ہی نہیں سکی تھی۔ صفیہ اسپتال سے میرے ساتھ ہی گھر آگئی تھی۔ اس کے آنے سے مجھے بہت سہارا ہو گیا تھا۔ اُس نے آتے ہی گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔ وہ ہر کام اتنی جلدی کر دیتی کہ میں اس کی پھرتی پر

میں اُس وقت اسپتال میں تھاپڑی اپنے اور ہونے والے بچے کے نصیبوں کو رو رہی تھی کہ اچانک ایک اجنبی عورت وارڈ میں داخل ہوئی تھی اور میرے پاس آ کر مجھے چپ کرانے لگی تھی میں ایک ہمدرد بنا کر اور ٹھہری گئی تھی۔ اور اپنے حالات کا رونا رونے لگی تھی۔ اُس عورت نے مجھے بتایا تھا کہ اس دنیا میں وہ بھی بالکل تنہا ہے دولت کی اُس کے پاس ہی نہیں لیکن کوئی عزیز رشتے دار دوست نہیں وہ بھی تمہاری کی



عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے اور کیسے ہوا؟ میرا تمام دن انہی سوچوں میں گزرا تھا۔ اور رات کو سوتے ہوئے بھی اسی بارے میں سوچ رہی تھی اور شاید اسی لیے مجھے خواب میں بھی صفیہ ہی نظر آتی تھی۔ وہ مسکرائی آنکھوں کے ساتھ مجھ سے مخاطب تھی۔

”صائقہ! تمہیں یاد ہے بہت سال پہلے تم مجھے بس ایک چھپکلی سمجھ کر مجھ سے اپنی تنہائی اور حالات کا رونا روٹی تھیں تم اس بات سے ناواقف تھیں کہ میں چھپکلی نہیں بلکہ اُس کے روپ میں ایک جینی ہوں تو میں نے سوچا تھا کہ میں روپ بدل کر تمہارے ساتھ رہوں گی اور تمہاری مدد بھی کروں گی۔ اور پھر میں نے ایسا ہی کیا اور صفیہ کے روپ میں تم سے ملی تمہارے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرا میں صفیہ کے روپ میں تمہارے ساتھ ہمیشہ رہتی لیکن میری کچھ مجبوری ہے جو اس بات کی اجازت نہیں دیتی سو میں دوبارہ اس روپ چھپکلی میں آگئی مگر اب میں اس روپ میں بھی تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی کیونکہ میرا راز کھل گیا ہے اب میں اپنے لوگوں میں واپس جا رہی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی تھی اور میری آنکھ کھل گئی تھی۔

آج میرے بیٹے جوان ہو چکے ہیں علی کی تو شادی بھی ہو گئی ہے۔ میرا ایک چاراسا نواسہ بھی ہے جو چھپکلیوں کا دشمن ہے جہاں چھپکلی نظر آئی اُس نے ڈنڈا اٹھایا۔ میں اُسے چھپکلی کو مارنے سے اور تنگ کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرتی ہوں..... وہ ہنستے ہوئے کہتا ہے۔

”نانو آپ چھپکلی سے ڈرتی ہیں؟“

اب آپ ہی بتائیں میں اپنے نواسے کو کیا جواب دوں؟ اپنی چھپکلی سے جزی ناقابل یقین کہانی تو اُسے نہیں سنا سکتی؟ اور اگر سنا بھی دوں تو کیا وہ یقین کر لے گا؟ ارے اُس کی بات تو چھوڑیں بھلا آپ نے کون سا یقین کر لیا ہے؟

☆☆.....☆☆

حیران رہ جاتی صفیہ نے میرا گھر قسم کی اشیاء سے بھر دیا تھا۔ اب مجھے اور میرے بچوں کو کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں میری سہیلی صفیہ نے ہمارے گھر کو ایک بہت ہی خوشحال گھر آنے میں تبدیل کر دیا تھا۔ میں اور میرے بیٹے علی اور حمزہ بہت آرام اور آسائش کی زندگی گزار رہے تھے۔ میری اس کہانی کی سب سے اہم بات یا خاص حصہ یہ ہے کہ جب سے میری سہیلی صفیہ میرے گھر آئی تھی۔ میرے گھر کی دیوار پر رہنے والی وہ چھپکلی نجانے کہاں غائب ہو گئی تھی جس سے میں لمبی دل کی ہزاروں باتیں کیا کرتی تھی۔

صفیہ کو ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تقریباً آٹھ برس ہو گئے تھے۔ ایک صبح میں سو کر اٹھی تو مجھے صفیہ دکھائی نہیں دی میں نے سوچا کہ کسی کام سے باہر نہ گئی ہو۔ اُس کا انتظار کرتے ہوئے دن سے رات ہو گئی پر وہ نہ آئی سچے صفیہ خالہ کہہ کر اُسے یاد کرتے روتے رہے۔ میرا اچھی پریشانی کے مارے برا حال تھا۔ سب جگہ پوچھ لیا پر کچھ پتا نہ چل سکا۔ اُس کے جانے کے بعد ہم بہت ادا اس ہو گئے تھے میں بھی اُسے یاد کر کے دکھی ہو جاتی اور یوں ایک سال بیت گیا۔ اب یہاں میں آپ کو حیرت کی یہ بات بھی سنا دوں کہ جس روز سے صفیہ میرا گھر چھوڑ کر گئی تھی وہ چھپکلی دیوار پر پھر نظر آنے لگی تھی۔

اُس روز میرے بیٹے فاخر کی سالگرہ تھی۔ میں سو کر اٹھی تو بیڈ پر سالگرہ کے تحفے موجود تھے۔ میں خوشی سے باہر بھاگی کہ صفیہ آگئی پر وہاں کوئی موجود نہ تھا گھر کا دروازہ بھی لاک تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ تحفے میرے گھر میں کیسے آ گئے؟ اب مجھے کچھ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ فاخر سو کر اٹھا تو اُن چیزوں کو دیکھ کر خوشی سے چیختے ہوئے بولا کہ صفیہ خالہ آ گئی ہیں۔

میں نے اسے یہی بتایا کہ وہ آئی تھیں پر آپ کو سوتا دیکھ کر چلی گئیں۔ وہ اب اپنے بھائی کے ہاں رہتی ہیں آپ سے ملنے جلد ہی دوبارہ آئیں گی۔ میں نے اُس کے سامنے یہ بات بنا دی تھی۔ پر میری

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



قسط نمبر: 04

اس نوجوان کی سرگزشت محسن کے سنے میں انعام کا جوا لاکسی بھنگ کر رہا تھا

اکرم کا خیال غلط نہیں تھا عالیہ بھی پہلی نظر کی محبت کا شکار ہو گئی تھی اس رات وہ بھی چین سے سو نہیں پاتی تھی اس نے نواب کو کتنے سال بعد دیکھا تھا وہ کتنا بدل گیا تھا بدل تو وہ خود بھی بہت گئی تھی لیکن اپنے اندر آئی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا کرتا لیکن دوسرے کو دیکھ کر اس چیز کا بہت احساس ہوتا ہے لمبا چوڑا نواب کتنا دلکش لگ رہا تھا یہ کوئی عالیہ کے دل سے پوچھتا۔ وہ تو اس مختصر سی ملاقات میں ہی دل ہارتی تھی اور بچپن کے ان دنوں کو یاد کر رہی تھی جب وہ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اس کی زندگی میں اب بھی رانی کے علاوہ کوئی ایسی دوست نہیں تھی جس سے دل کی باتیں کر سکتی اس لیے اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ اڑ کر رانی کے پاس پہنچ جائے اور اپنے دل کا حال کہہ سنائے اور اپنی اس سکھی سے اس مسئلے کا حل پوچھے اس سے پوچھے کہ اب کیا کرے؟ دوسری طرف ایک اور خیال اسے تنگ کر رہا تھا کہ کیا نواب بھی اس کے لیے وہ سب سوچ رہا ہوگا محسوس کر رہا ہوگا جو وہ سوچ رہی تھی اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سبھی اسے لگتا کہ وہ سب کے پیچھے جانے لگی ہے اور جب نواب کی نظریں یاد آتیں تو دل اٹھل پھٹل ہونے لگتا اسے یقین ہونے لگتا کہ اس کی محبت ٹیٹل فر نہیں ہے لیکن پھر اچانک باپوی اس پر حملہ کر دیتی اور دماغ کہتا کہ وہ اتنی خوبصورت ہے کہ جو بھی دیکھے دکھتا رہ جائے ایسے میں اگر نواب اسے تنگلی باندھ کے دیکھتا رہا تھا تو اس میں کوئی نئی یا عجیب بات نہیں تھی اس کے دیکھنے سے یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا تھا کہ اسے عالیہ سے محبت ہو گئی تھی یہ دلیل اسے اُداس کر دیتی تھی پھر وہ اس سے الٹ سوچنے لگتی سوچتی کہ اس کی طرح نواب بھی پہلی نظر میں اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا ہوگا اور ایسا سوچتے ہی اس کی آنکھیں جبکمانے لگتیں ہونٹ مسکرانے لگتے اور پلمپیں خوابوں کے بوجھ سے بند ہونے لگتیں اور اسی طرح خوابوں میں کھوئے ہوئے وہ نیند کی وادیوں میں اتر جاتی لیکن کچھ دیر میں پھر چونک کر اٹھ جاتی پھر وہی سوال جواب پھر وہی کشش عالیہ کی پوری رات ایسے ہی گزری تھی صبح تک وہ اس کشش کی وجہ سے نڈھال ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح ہوتے ہی وہ بستر سے اٹھ بیٹھی وہ جو روز بارہ بجے تک بستر پر ہوتی تھی اور جس پر چوہدرائے اسے روز صبح جلدی اٹھنے کے فائدے بتاتی اور نصیحتیں کرتی تھی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا آج صبح سویرے تا صرف اٹھ چکی تھی

بلکہ چکن میں آ کر اپنی نگرانی میں نواب کے لیے ناشتہ تیار کروا رہی تھی اسے ملازموں سے پتا چل گیا تھا کہ نواب کے ساتھ اس کا کوئی دوست بھی ہے اس لیے اس نے ناشتہ بھیجتے ہوئے نواب کے علاوہ اس کے دوست کے لیے بھی بھیج دیا تھا۔ ناشتہ بھجوانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی اور چادر اٹھا کر رانی کے پاس جانے کو تیار ہو گئی۔ وہ چاہتی تو کسی ملازم کو بھیج کر رانی کو اپنے پاس بلا سکتی تھی لیکن اس کے دل میں ایسی بے چینی لگی تھی کہ وہ اتنا سا بھی انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ جب وہ رانی کے کمر پہنچی تو وہ ناشتے سے فارغ ہو کر گھر کے کام سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی اتنی صبح عالیہ کو اپنے کمرہ دیکھ کر رانی حیران تو ہوئی مگر کچھ کہنا نہیں کہ یہ نہ ہو عالیہ ناراض ہی ہو جائے وہ بہت نازک مزاج تھی کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی بات پر کسی سے بھی ناراض ہو جایا کرتی تھی حتیٰ کہ اس کی مرضی کے خلاف ذرا بھی کچھ ہوتا تو وہ اپنے ماں باپ سے بھی کئی کئی دن بات نہیں کرتی تھی رانی تو پھر رانی تھی صرف ایک دوست اس لیے رانی اس سے ذرا پھیل کر بات کیا کرتی تھی اس لیے اب بھی اس نے عالیہ کو دیکھ کر خوشی کا اظہار تو کیا لیکن حیرت چھپا گئی۔

”تمہیں پتا ہے گاؤں میں کون آیا ہے؟“ عالیہ اس کے تاثرات سے بے نیاز پوچھ رہی تھی اس کے سچے میں دبا دبا جوش تھا جسے محسوس کرتے ہوئے عالیہ بھی اس کی بات میں دلچسپی محسوس کرنے لگی۔

”ہاں بس اتنا پتا ہے کہ ساجدہ خالہ والے مکان میں کوئی آیا ہوا ہے۔“ رانی نے جواب دیا۔

”نواب آیا ہے اور ساتھ میں اس کا دوست ہے۔“ عالیہ نے ایسے بتایا جیسے کوئی اہم انکشاف کیا ہو جس سے رانی اب تک بے خبر تھی۔

”نواب.....“ رانی کو فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ نواب کون ہے لیکن پھر عالیہ کے یاد کرانے پر اسے سب یاد



آ گیا تھا۔ اور عالیہ کی خوشی اور جوش و خروش دیکھ کر وہ اس کے دل کا بھید بھی جان گئی تھی باقی کی باتیں عالیہ نے خود اسے بتا دی تھیں ویسے بھی وہ اس کی رازدار اور کنبلی تھی عالیہ کی ہر بات جو اس کے گھر والے بھی نہیں جانتے تھے وہ بھی رانی کو معلوم تھی۔ اور پھر عالیہ نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ نواب کو دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتی ہے اس لیے رانی کو اس کے ساتھ نواب کے گھر جانا ہوگا۔ عالیہ کے اس حکم نما فرمائش پر رانی سوچ میں پڑ گئی تھی جانتی تھی کہ جب جو بلی یہ خیر پہنچے گی تو عالیہ کو تو کوئی کچھ نہیں کہے گا لیکن اس کی خوب کھچانی ہوگی اور گھر والوں سے جو سننا پڑے گا وہ الگ لیکن عالیہ کی بات ماننا بھی تو اس کے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

رانی ماں کو جو بلی جانے کا کہہ کر عالیہ کے ساتھ اپنے گھر سے نکل آئی اُن کا رخ نواب کے گھر کی طرف تھا، راستہ بھر وہ نواب کے بارے میں ہی بات کرتی رہی تھیں جب وہ نواب کے گھر پر پہنچے تو عالیہ دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے پچگانے لگی رانی نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی عالیہ اس کے پیچھے کھڑی ہوئی وہ یہاں تک آ تو گئی تھی لیکن اب سوچ رہی تھی کہ اس کے اس طرح آنے پر نواب پتا نہیں اس کے بارے میں کیا خیال کرے گا کیا سوچے گا کہ یہ کیسی لڑکی ہے جو اس سے ملنے چلی آئی ہے اسے زیادہ دیر اس بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ دروازہ کھل گیا تھا دروازہ کھولنے والا اکرم تھا جو اپنے گھر کے دروازے پر دو خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

”میں رانی ہوں اور یہ عالیہ ہے چوہدری کی بیٹی ہم جو بلی سے آئے ہیں۔“ اکرم کی سوالیہ نظروں کے جواب میں رانی نے اپنا اور عالیہ کا تعارف کر دیا تو اکرم نے چونک کر عالیہ کی طرف دیکھا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے دروازے پر سے ہٹ کر انہیں راستہ دیتے ہوئے اندر آنے کا کہا تھا اس کی مسکراہٹ بہت معنی خیز تھی۔

”کون ہے اکرم.....“ پیچھے سے نواب نے پوچھا تھا۔ اسی لمحے عالیہ اور رانی گھر کے اندر داخل ہوئیں وہ عالیہ کو اس طرح اپنے گھر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اور پھر حیرت سے نکل کر اس نے اُن کا پرتپاک استقبال کیا تھا اور انہیں اندر چلنے کو کہا تو عالیہ کہنے لگی۔

”ہم صرف یہ پوچھنے آئے تھے کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔“ اس کے اس طرح کہنے پر نواب بے اختیار مسکرایا اس کا بھانپنے لگا تھا اگر اسے نواب کی فکر بھی تھی تب بھی وہ رانی یا کسی ملازم کو بھیج کر ان کی ضرورت کے بارے میں پتا کر سکتی تھی لیکن وہ خود چل کر ان کے گھر آئی تھی اسی سے پتا چل رہا تھا کہ اس کا دل بھی نواب کے لیے اتنا ہی بے چین تھا اس جتنا کہ نواب کا اس کے لیے تھا۔ اس بات کے بعد عالیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے اس لیے اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے وہ واپسی کے لیے مڑتے ہوئے بولی تھی۔

”نہیں ہم نہیں گئے نہیں ہم بس یہی پوچھنے آئے تھے اب ہم جاتے ہیں۔“ نواب کی اندر تک اترتی محبت بھری نظروں نے عالیہ کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا اسے بہت زیادہ شرم بھی آ رہی تھی اس لیے وہ مزید وہاں نہیں رکھ پارہی تھی۔

”تم نے آج یہاں آ کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے مجھے اس نکمکش سے نکال دیا ہے کہ صرف میں ہی تمہارے لیے تڑپ رہا ہوں۔“ نواب نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عالیہ کے کام میں سرکوشی کی اس کا اس طرح اظہار کیا کہ عالیہ کے گلانی گال شرم سے سرخ پڑ گئے اور اس کے ہونٹ بے ساختہ مسکرانے لگے اس نے ایک نظر نواب کی طرف دیکھا اور بنا کچھ کہے مسکراتے ہوئے دروازہ پار کر گئی پیچھے نواب وہیں کھڑا دروازے کو تکتا رہ گیا تھا اس کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا اور ہونٹوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

”بس اب اندر چل میرے بھائی، بھابی جا چکی ہے۔“ اکرم نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو نواب خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا۔ اکرم کا اس طرح بھابی کہنا بھی نواب کو بہت بھایا تھا۔

”دیکھا میں نے کہا تھا نادونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“ اکرم نے کہا تو نواب اس کے اتنے درست اندازے کی تعریف کرنے لگا۔ آج وہ اپنے آپ کو ایک نیا انسان محسوس کر رہا تھا اس کے دل کی دنیا کی بادی تھی ارد گرد کی دنیا بھی بدلی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ ان کا ارادہ تو یہی تھا کہ ایک دن گاؤں رک کر واپس چلے جائیں گے لیکن اب نواب کا وہاں سے جانے کا دل نہیں کر رہا تھا اور اکرم بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اب چوہدری چوہدرائن سے ملے بنا نواب وہاں سے نہیں ہلے گا اس لیے اس نے بھی واپسی کی بات نہیں کی تھی۔

☆.....☆.....☆

عالیہ جب گھر پہنچی تو صحن میں ہی اس کا سامنا اپنے بڑے بھائی وسیم سے ہو گیا۔
 ”کہاں سے آ رہی ہو تم.....“ اس نے خاصے غصیلے لہجے میں سوال کیا تھا عام طور پر تو وہ ایسے لہجوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی لیکن آج چونکہ دل میں چور تھا اس لیے تھوڑا سہم ہی گئی تھی۔
 ”رانی کے گھر گئی تھی۔“ عالیہ نے ساتھ کھڑی رانی کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا لاپرواہی سے کہنے کی کوشش کی۔

”بکواس بند کرو مجھے معلوم ہے تم دونوں کہاں سے آ رہی ہو۔“ وہ اس جھوٹ پر عالیہ کو گھورتے ہوئے بولا تو رانی کی تو سمجھو جان ہی نکل گئی یقیناً کسی نے یہ خبر حویلی پہنچا دی تھی کہ وہ دونوں نواب کے گھر گئے تھے اب عالیہ کا تو جو ہوتا سو ہوتا لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی خیر نہیں ہے اس لیے وہ باقاعدہ کانٹنے لگی تھی۔

”اس کو تو اناں پوچھ لیں گی تم مجھے بتاؤ تم اسے وہاں کیوں لے کر گئی تھی۔“ اب وسیم رانی سے مخاطب تھا رانی عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی جس طرح وہ عالیہ کو انکار نہیں کر پاتی تھی اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے وہاں جانے کے لیے عالیہ نے مجبور کیا تھا۔ عالیہ تو اس کے اس انداز میں بات کرنے پر ناراض ہو کر اندر چلی گئی اور رانی دیر تک سر جھکائے وسیم کی باتیں سنتی رہی۔

☆.....☆.....☆

عالیہ وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں گئی تھی ناراضگی کا بہانہ کر کے اس نے وسیم سے جان تو چھڑوا لی تھی لیکن



اس کے اندر آنے سے پہلے وسم نے اس پر اچھی طرح یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ دوبارہ کبھی نواب یا اس کے گھر کے ارد گرد بھی دکھائی نہ دے ورنہ اس کے لیے اچھا نہ ہوگا اور اماں ابا بھی اسے وسم سے نہیں بچاسکیں گے اس وقت تو عالیہ نے بد تمیزی سے اٹلے جواب دے دیے تھے لیکن دل ہی دل میں وہ ڈر بھی گئی تھی آج تک اس نے جو بھی من مانیاں کی تھیں ان میں کوئی بھی بات کسی لڑکے کے بارے میں نہیں تھی۔ اسی لیے اماں ابا بھی اس کا ہی ساتھ دیتے تھے اور اس طرح وہ اپنی ہر ضد پوری کر لیا کرتی تھی لیکن اب معاملہ مختلف تھا اسے یقین تھا اس معاملے میں ماں باپ بھی وسم کو ہی ٹھیک سمجھیں گے اور اسے ہی ڈانٹیں گے اسی لیے وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے کبھی کسی لڑکے کو دیکھا نہیں تھا بات نہیں کی تھی سارے گاؤں کے لڑکے اس پر جان دیتے تھے وہ اپنی خوبصورتی اور اہمیت سے بخوبی واقف تھی اور جو اس کو اچھا لگ جاتا اس کو تھوڑی بہت لفت بھی دے دیا کرتی تھی۔ زیادہ تر وہ ان کے تڑپنے کا مزہ ہی لیا کرتی تھی۔ لیکن وہ خود کبھی کسی کے لیے نہیں تڑپتی تھی۔ لڑکے کی طرح طرح سے اس کے آگے پیچھے پھرتے اس کی راہ میں ٹپکیں بچھاتے اس کی محبت میں مرنے یا رنے کی باتیں کرتے لیکن وہ ہنس کر ٹال جاتی نہ تو کسی کو ہاں کرتی اور نہ ہی کسی کو انکار کرتی وہ فطرتاً تھوڑی فلٹ تھی یا خوبصورتی کے احساس اور اتنے لڑکوں کے آگے پیچھے پھرنے کی وجہ سے ایسی ہو گئی تھی مگر یہ ضرور تھا کہ وہ فلٹ تھی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی سچ تھی کہ اس کا تعلق صرف زبانی کلامی ہی رہا تھا اس سے زیادہ اس نے کبھی کسی کو اپنے قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن نواب کا معاملہ مختلف تھا نواب پہلی نظر میں ہی اس کے دل میں اتر چکا تھا وہ پہلا انسان تھا جس کے لیے وہ تڑپ رہی تھی یعنی اسے سچ سچ نواب سے محبت ہو گئی تھی۔ رانی وسم سے ڈانٹ کھا کر اندر آئی تو اس کا چہرہ اتر ا ہوا تھا وسم نے اس کی اچھی خاصی کلاس لے لی تھی۔ عالیہ نے اس سے ساری تفصیل پوچھی اس نے ایک ایک لفظ بتا دیا جو کچھ تھی وسم نے اس سے کہا تھا۔ جیسے جیسے وہ بات کر رہی تھی عالیہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

شام کا کھانے کا وقت قریب آیا تو عالیہ کچن میں چلی آئی تاکہ نواب کے گھر کھانا بھیج سکے لیکن جب اس نے ملازم کو کھانا لے جانے کے لیے کہا تو اس نے جانے سے صاف منع کر دیا اور بتایا کہ وسم نے انتہائی سختی سے اسے کہا ہے کہ نواب کے گھر نہ جائے اور کھانا لے کر تو باہر نکل بھی نہ جائے۔ عالیہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے ملازم اس کی بات نہیں مائیں گے اس لیے چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گئی اور اس رات عالیہ نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے طور پر کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ملازمہ منشی بار بھی اس سے کھانے کا پوچھنے آئی اس نے ملازمہ کو ڈانٹ کے بھگا دیا تھا اب ماں باپ تو گھر تھے نہیں جو اس کے خڑے اٹھاتے وسم ویسے ہی شروع سے غصے کا تیز تھا اور عالیہ کے معاملے میں اس کی یہ سوچ بھی تھی کہ گھر والے اسے کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں جس کی وجہ سے عالیہ بگڑ گئی ہے اپنی اس سوچ کی وجہ سے بھی اس نے اس بات کی بائبل پروا نہیں کی عالیہ نے کھانا نہیں کھایا بلکہ جب ملازمہ نے اسے عالیہ کے کھانا نہ کھانے کے بارے میں بتایا تب بھی اسے کوئی فکر نہیں ہوئی اور اس نے ملازمہ سے بھی کہہ دیا کہ دوبارہ اس کے پاس کھانا لے کر جانے کی ضرورت نہیں ہے جب بھوک لگے گی تو خود ہی کھانا مانگ لے گی۔ عالیہ کی وہ رات بہت بری گزری تھی بھوک اور غصے سے اس کا برا حال تھا وہ شدت سے ماں باپ کی واپسی کی منتظر تھی تاکہ بھائی کی شکایت کر کے اسے ڈانٹ پڑا سکے۔

☆.....☆.....☆

اس شام اکرم اور نواب انتظار ہی کرتے رہے لیکن جو ملی سے کھانا آیا اور نہ ہی کوئی پیغام آ کر جب بہت دیر ہو گئی اور ہوٹل بند کرنے کا وقت ہونے لگا تو انہوں نے ہوٹل جا کر کھانا کھایا اس کے بعد وہ یونگی ٹھٹتے ہوئے اس گراؤنڈ کی طرف نکل آئے جہاں بچپن میں وہ کھیلا کرتے تھے بچپن میں یہ گراؤنڈ ان کی سب سے پسندیدہ جگہ ہوا کرتی تھی۔ یہاں وہ کھیلتے لڑتے اور پھر سے ایک ہو جاتے وہ دونوں وہاں کھڑے دیر تک باتیں کرتے رہے اور

گزرے وقت کو یاد کرتے رہے۔ وہ واپس گھر آئے تو بھی نواب لاشعوری طور پر عالیہ کے بارے میں ہی سوچے جا رہا تھا جبکہ اکرم گھر آنے کے بعد کچھ دیر نواب سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا تھا اور پھر سو گیا تھا لیکن نواب بہت بے چین تھا بار بار اسے ایک ہی بات ستائے جا رہی تھی کہ کیا عالیہ کو اس کی کوئی بات بری لگی تھی لیکن جب عالیہ کا شرمایا ہوا مسکراتا چہرہ اس کے تصور میں آتا تو یہ سوال خود ہی اپنی موت آپ مر جاتا تھا تو پھر ایسا کیا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے حویلی سے کھانا نہیں آیا تھا نواب کا دل کہہ رہا تھا کہ وہاں ضرور کچھ ہوا ہے وہ تو چاہتا تھا کہ حویلی جا کر پتا کرے لیکن اکرم نے ایسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ اب صبح کا انتظار کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن صبح رانی عالیہ کی طرف چلی آئی تھی اسے آگے کی کہانی جاننے کی جلدی تھی اور جب اسے پتا چلا کہ عالیہ نے رات سے کھانا بھی نہیں کھایا ہوا تو بہت پریشان ہو گئی پھر اس نے بڑی مٹیں کر کے اور نواب کا واسطہ دے کر اسے ناشتے کے لیے راضی کیا تھا۔ عالیہ کو جب تک بھی بہت لگی ہوئی تھی اس لیے تھوڑے بہت خردوں کے بعد آخر اس نے ناشتہ کر لیا تھا۔ عالیہ نے رانی کو تیار کیا تھا کہ وہ اس کا پیغام لے کر نواب کے پاس جائے اور اسے شام کو کھیتوں میں ملنے کے لیے کہے۔ رانی نے پہلے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اگر ان کی اس ملاقات کے بارے میں ویم کو معلوم ہو گیا تو بہت برا ہوگا لیکن وہ عالیہ ہی کیا جو کسی کی بات مان جائے وہ تو ویسے بھی بہت ضدی تھی اور اپنی بات منوانے والی اور اب تو معاملہ بھی دل کا آ گیا تھا آخر رانی کو عالیہ کی بات ماننی ہی پڑی۔

☆.....☆.....☆

نواب کی رات بے چینی میں گزری تھی وہ سکون سے سو نہیں پایا تھا صبح بھی وہ اکرم سے پہلے بستر سے اٹھ بیٹھا تھا اور لاشعوری طور پر وہ عالیہ کا منتظر تھا لیکن دن چڑھ گیا وہ نہیں آئی۔ وہ گھر بند کر کے باہر جانے کو تیار نہ تھا کہ نہیں پیچھے عالیہ نہ آجائے اور گھر بند دیکھ کر اسے یابوسی کا سامنا کرنا پڑا اس لیے اکرم ہوٹل سے ناشتہ گھر پر ہی لے آیا تھا اور دونوں نے گھر پر ہی ناشتہ کیا تھا ناشتہ کیا کرنا تھا نواب نے تو بس دو چار نوالے ہی زہر مار کیے تھے وہ بھی اکرم کے کہنے پر۔ اس کے بعد بھی وہ باہر جانے کو تیار نہ ہوا تو اکرم جا کر کمرے میں لیٹ گیا اور نواب بے چینی سے سارے گھر میں گھومتا پھر رہا تھا۔ جب کافی دیر ہوئی اور انتظار کرنے کی ہمت نہ رہی تو نواب حویلی جانے کا سوچ کر گھر سے باہر کی طرف چلا لیکن ابھی وہ گھر سے نکلا ہی تھا کہ اس نے رانی کو اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا وہ وہیں کھڑے ہو کر اسے قریب آتے دیکھتا رہا جب رانی قریب آئی تو نواب کو احساس ہوا کہ وہ کافی گھبرائی ہوئی تھی نواب اسے فوراً گھر کے اندر لے گیا رانی نے اسے عالیہ کا پیغام دینے سے پہلے ویم اور عالیہ کے درمیان ہوئی باتوں کے بارے میں بھی بتا دیا۔ ساری بات سن کر نواب گہری سانس بھر کر رہ گیا اس کی محبت کی کہانی کے آغاز میں ہی ساجد درمیان میں آ گیا تھا وہ کسی کی پرواہ کرنے والا تھا اس نے آج تک جو جاہا تھا وہ کیا تھا اور پھر عالیہ تو اس کی محبت تھی اسے وہ کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا تھا کسی کے لیے بھی نہیں رانی تو پیغام پہنچا کر وہاں سے چلی گئی لیکن نواب سوچ میں پڑ گیا تھا کہ آگے کے حالات سے کیسے پنہا ہوگا اور پھر اس کی سوچیں عالیہ کی طرف مڑ گئیں تو وہ مستقبل کی فکر کو بھول کر عالیہ کے حسین خوابوں میں کھو گیا اسے شدت سے شام ہونے کا انتظار تھا۔

☆.....☆.....☆

رانی نواب کو پیغام دینے کے بعد سیدھی حویلی پہنچی تھی وہاں پھر اس کا ویم سے سامنا ہو گیا تھا لیکن ویم نے اسے صرف غصے کی نظروں سے گھورنے پر اکتفا کیا تھا اور کوئی بات نہیں کی تھی۔ رانی بھی جلدی سے اندر کی طرف بڑھ گئی تھی اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے عالیہ کے کمرے میں پہنچ کر ہی دم لیا تھا عالیہ اس کی ہی منتظر تھی رانی نے بڑی تفصیل سے اسے اپنے اور نواب کے درمیان ہوئی بات چیت بتا دی تھی لیکن پھر بھی عالیہ بار بار اس

سے یہی پوچھے جا رہی تھی اور عالیہ کی دیوانگی پر ہنستے ہوئے رانی بار بار اس کی باتوں کا جواب دیے جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

شام ہوتے ہی نواب مطلوبہ جگہ پہنچ گیا تھا لیکن اسے وہاں عالیہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا عالیہ اسے آتی دکھائی دے گی مگر دونوں بہت گرم جوشی سے ملے تھے پیار محبت کی قسمیں کھائی گئیں اور ساتھ چہنے مرنے کے وعدے کیے گئے۔ دونوں جوان تھے اور دونوں صندی اور دونوں کو پہلی بار محبت ہوئی تھی دونوں کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار تھے وہ شام ان دونوں نے ایک ساتھ گزارا تھی اور بہت ساری باتیں کی تھیں۔ پھر دونوں اپنے اپنے راستے پر چلے گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

نواب گھر پہنچ کر بھی عجیب سی سرشاری میں تھا اگر مگر ہراس کا منظر تھا اسے آتے دیکھا تو مسکرایا۔

”ہوئی ملاقات؟“ اکرم نے پوچھا۔

”ہاں یار ہو گئی لیکن اب دوبارہ پتا نہیں کب ملنا ہوگا۔“ نواب نے بے چارگی سے کہا تو اکرم ہنس پڑا۔

”ابھی مل کر آئے ہو اور دوبارہ ملنے کی بات کر رہے ہو، مطلب تم تو پکا پکا عشق کے جال میں پھنس چکے ہو۔“

اکرم کے کہنے پر نواب بھی مسکرایا۔

”یہ سب ٹھیک ہے یار لیکن تم بھول گئے ہو ہم پیچھے بھی ایک زندگی چھوڑ کر آئے ہیں آج میری بات ہوئی ابا سے پوچھ رہے تھے واپس کب آ رہے ہو۔ میں نے کہا نواب سے پوچھ کر بتاؤ گا، اب تم بتاؤ کیا ارادے ہیں؟“

اکرم کے پوچھنے پر نواب سوچ میں پڑ گیا۔

”یار میں جو ہداری اور جو ہدرا نئے مل کر رہی جانا چاہتا ہوں۔“ نواب نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”لیکن وہ تو پتا نہیں کب واپس آئیں، ہم کب تک ان کے انتظار میں بیٹھے رہیں گے۔“ اکرم نے پوچھا۔

”دو ایک دن میں آ ہی جائیں گے بلکہ عالیہ کہہ رہی تھی شاید کل صبح میں آ جائیں، لیکن تمہاری بات بھی ٹھیک ہے ماما بھی اکیلے تنگ ہو رہا ہوگا تم ایسا کر دو تم واپس چلے جاؤ میں دو چار دن بعد آ جاؤں گا۔“ نواب نے سچ کی راہ

نکالی کیونکہ وہ خود تو کسی صورت بھی ابھی واپس جانے کو تیار نہیں تھا لیکن اکرم کے احساس دلانے پر اسے خیال آیا تھا کہ پیچھے بھی وہ ایک دنیا ایک زندگی چھوڑ کے آیا ہے، اکرم نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا اور اگلے دن صبح سویرے وہ وہاں سے نکل گیا تھا وہ ہلکے فرانسپورٹ سے گیا تھا اور گاڑی نواب کے لیے چھوڑ گیا تھا نواب نے اسے

بہت کہا تھا اس کہ وہ گاڑی لے جائے لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ اس طرح نواب گاؤں میں اکیلا رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اسی صبح جو ہداری اور جو ہدرا نئے کی گاؤں واپسی ہوئی تھی وہ لوگ دن نکلنے کے کچھ دیر بعد جوہلی پہنچے تھے واپسی پر گاؤں کے حالات پوچھنے پر انہیں نواب کی گاؤں میں آمد کے بارے میں بھی خبر ملی تھی جس پر جو ہداری نے تو کسی قسم

کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا البتہ جو ہدرا نئے نے دل میں ایسی خوشی محسوس کی تھی جو کسی جاننے والے کے اچانک آ جانے سے ہو جایا کرتی ہے۔ وہ ابھی تک یہ بات نہیں بھولی تھی کہ نواب نے جاتے ہوئے کس خلوص سے اپنے

سارے کھلونے ان کی عالیہ کو دے دیے تھے اپنی سب سے قیمتی چیز وہ اسے دے گیا تھا ساجدہ کے حوالے سے بھی وہ نواب سے اپنائیت کا رشتہ محسوس کرتی تھی۔ جو ہداری کی واپسی کی خبر سن کر گاؤں سے بھی کئی لوگ ان سے ملنے

آ گئے جنہوں نے مختلف معاملات میں جو ہداری سے فیصلہ کروانا تھا تو کسی نے کسی اور معاملے میں مشورہ لینا تھا جو ہدرا نئے بھی گاؤں کی عورتوں کے ساتھ مصروف رہی اور عالیہ اسے ساری باتیں بتانے کے لیے بے چین سارا

وقت جو ہدرا نئے کے ارد گرد منڈلاتی رہی اور جیسے ہی جو ہدرا نئے کو فرصت ہوئی اس نے الف سے بے تک ساری بات کہہ سنائی جس کا اصل مقصد وہیم کی شکایت کرنا تھا اور ظاہر ہے اس سچ میں اس نے وہ ساری باتیں چھپائی تھیں

جن پر اسے ڈانٹ پڑ سکتی تھی۔ چوہدران کو دو سیم کے رویے کے بارے میں جان کر بہت انسوس ہوا اور اس نے اسی وقت ملازم کو نواب کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔

☆.....☆.....☆

اکرم کے جانے کے بعد نواب دو بارہ سو گیا تھا جب دوسری بار اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا وہ پھر بھی سستی سے لیٹا رہا لیکن آخر بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بستر چھوڑ دیا نہادھو کر جس وقت وہ گھر سے باہر نکلا اس وقت دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا اس لیے اس نے ناشتے کی بجائے کھانا کھانے کا فیصلہ کیا اور قریبی ہوٹل میں چلا آیا وہاں سے کھانا کھانے کے بعد وہ سیدھا گھر کی طرف چلا گیا ایک تو اس کے جانے کی اور کوئی جگہ نہیں تھی اور آوارہ گردی کا اس کا موڈ نہیں بن رہا تھا دوسرے اسے یہ خیال بھی رہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کہیں عالیہ یا رانی وہاں نہ آئیں اس مسئلے کے حل کے لیے اس نے سوچا تھا کہ جانے سے پہلے موہاں لے لے گا اور عالیہ کو بھی موہاں دے جائے گا تاکہ ان کے درمیان رابطہ رہ سکے۔ یہی باتیں سوچتا وہ اپنی جلی میں داخل ہوا تو اس نے حویلی کے ملازم کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھا ملازم کو دیکھ کر نواب کو حیرت ہوئی تھی جو حالات تھے ان میں حویلی کی طرف سے کسی کا آنا حیرت کی بات ہی تھی وہیم نے عالیہ سمیت سب کو تختی سے منع کر رکھا تھا کہ نواب کے گھرنے جایا جائے دروازے پر تالا لگا دیکھ کر ملازم واپسی کے لیے مڑا تو اس کی نظر نواب پر پڑی وہ وہیں ٹھہر کر نواب کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا اور جیسے ہی نواب اس کے قریب پہنچا ملازم نے چوہدران کا پیغام اسے پہنچا دیا چوہدران کے گاؤں واپس آ جانے کا نواب خوش ہو گیا تھا کیونکہ حویلی میں ایک چوہدران ہی تھی جس کے دل میں اس کے اور اس کے خاندان کے لیے کوئی نرم گوشہ موجود تھا ورنہ چوہدری اور اس کے بیٹے کو تو ان سے اللہ واسطے کا بہر تھا یوں لگتا تھا جیسے چوہدری کے اندر کی ساری ناپسندیدگی وہیم میں ویسی کی ویسی منتقل ہو گئی ہو۔ ملازم پیغام دے کر واپس چلا گیا تو کچھ سوچتے ہوئے نواب بھی اس کے پیچھے پیچھے حویلی کی طرف چل دیا۔

☆.....☆.....☆

جب وہ حویلی پہنچا تو چوہدران کو اپنا منتظر پایا چوہدران اس سے بہت محبت سے ملی اور حال چال پوچھا پھر ادھر ادھر کی تھوڑی باتوں کے بعد چوہدران نے ملازم کو اس کے لیے کھانا لگانے کو کہا تو اس نے کھانے سے محذرت کر لی اس دوران عالیہ بھی ماں کے پاس ہی بیٹھی رہی تھی بظاہر تو نواب سے انجان بنی عالیہ کی توجہ کا مرکز نواب ہی تھا نواب بھی باتوں کے دوران گاہے گاہے عالیہ پر نظر ڈال لیتا تھا۔ جب نواب واپسی کے لیے اٹھا تو عالیہ بھی بہانے سے اٹھ کر اس کے پیچھے آئی اور نواب نے آہستہ سے اسے شام کو کھیتوں میں ملنے کا کہہ دیا اور اپنے گھر واپس چلا آیا۔ واپسی پر وہ چوہدران کے بارے میں ہی سوچتا رہتا تھا اس کا رویہ بہت اچھا تھا لیکن کیا نواب اور عالیہ کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد بھی اس کا رویہ ایسا ہی رہتا یا اس کے دل میں نواب کے لیے کوئی گنجائش رہتی اسی طرح کے سوال تھے جو نواب کے ذہن میں آئے جا رہے تھے پھر اس نے سب سوالوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور عالیہ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆.....☆.....☆

نواب اسی دوپہر قریبی شہر جا کر دو موہاں فونز لے آیا تھا ایک اپنے لیے اور دوسرا عالیہ کے لیے..... جب تک وہ شہر سے واپس آیا شام ہونے والی تھی یعنی عالیہ سے ملاقات کے لیے جو وقت طے تھا وہ قریب آ گیا تھا۔ گھر پہنچ کر نواب نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر نہادھو کر عالیہ سے ملنے طے شدہ جگہ پہنچ گیا جہاں عالیہ پہلے سے اس کی منتظر تھی عالیہ کو اپنے سے بھی پہلے وہاں موجود دیکھ کر نواب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”کہاں رہے گئے تھے میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ وہ شاید کچھ زیادہ ہی پہلے آ گئی تھی اسی لیے انتظار کر کر کے جھنجھائی ہوئی تھی۔ اسے یہ کہنے کی بجائے کہ وہ وقت سے پہلے وہاں آ گئی تھی نواب نے اپنے دیر سے

آنے پر اس سے معافی مانگی اور اسے مایا تو آخراں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور جب نواب نے موبائل نکال کر اس کے سامنے رکھا تو وہ اور بھی خوش ہو گئی اس نے نواب کو بتایا کہ اسے موبائل لینے کا کتنا شوق تھا لیکن وسیم کی وجہ سے وہ موبائل نہیں رکھ سکتی تھی اس روز دوسری باتوں کے علاوہ نواب اسے موبائل کا استعمال بھی سکھاتا رہا عالیہ بہت ذہین ثابت ہوئی تھی اس نے کچھ ہی دیر میں ضروری چیزیں سیکھ لی تھیں اور پرنٹس بھی کر لی تھی۔ عالیہ رانی کے گھر جانے کا کہہ کر جوہلی سے نکلی وہ زیادہ پر نواب کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی اسے رانی کے گھر پہنچنا تھا یہ خدشہ بھی تھا کہ جوہلی سے کوئی اسے بلانے کے لیے رانی کے گھر نہ پہنچ جائے اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ دیر بعد واپسی کے لیے اٹھ گئی اور تب نواب نے اسے اپنی واپسی کے بارے میں بتایا تو وہ نواب کے جانے کا سن کر اُداس ہو گئی۔

”تم واپس تو آؤ گے؟“ یہ پوچھتے ہوئے عالیہ کے لہجے میں ڈھیروں خدشے بول رہے تھے۔

”اس بات کے لیے پریشان مت ہونا میں بہت جلد واپس آؤں گا۔“ نواب نے اسے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے کہا اور پھر ڈھیروں وعدوں اور قسموں کے ساتھ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ عالیہ کو اللہ حافظ کہنے کے بعد نواب سیدھا قبرستان ساجدہ کی قبر پر چلا آیا کچھ دیر وہاں بیٹھنے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ گھر لوٹ آیا۔ نواب سے جدا ہو کر عالیہ سیدھی رانی کے پاس اس کے گھر پہنچی تھی اور پھر اس نے اسے موبائل دکھانے کے ساتھ ساتھ نواب کے جانے کا بھی بتایا تھا اور نواب کے جانے کا بتاتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی جس پر رانی نے بے اختیار اسے گلے لگا کر تسلی دی تھی۔ کچھ دیر اور رانی کے ساتھ گزار کر عالیہ جوہلی لوٹ آئی تھی لیکن اس کا دل وہیں نہیں نواب کے پاس رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

واپسی کے سفر میں نواب اکیلا ضرور تھا لیکن اس کے دل میں عالیہ کی یادیں اور محبت بھی تھی۔ سفر میں اس کے ساتھ بات کرنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے وہ مسلسل سوچوں میں کھویا رہا تھا بار بار اس کے ذہن میں آتا کہ عالیہ کو اپنی اصلیت نہ بتا کر وہ ایک طرح سے عالیہ کو دھوکا دے رہا ہے اور پھر یہ خیال بھی آتا کہ کیا سب کچھ جاننے کے بعد بھی عالیہ اس سے محبت کرے گی یا نہیں؟ اس کے گھر والوں کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ وہ کسی بھی صورت ایک جرائم پیشہ انسان کا رشتہ اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کے لیے قبول نہیں کریں گے اس لیے انہیں سب کچھ بتانا مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ کسی بھی صورت عالیہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ عالیہ کو اس کے ماضی اور حال کے بارے میں ہر بات معلوم ہوئی چاہے تاکہ وہ اپنی مرضی کا فیصلہ کر سکے اسے ایسا نہ لگے کہ نواب نے اسے دھوکا دیا ہے، لیکن عالیہ کو بھی اپنی اصلیت بتانا نواب کو مشکل لگ رہا تھا اس نے کئی بار سوچا مگر عالیہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا اور واپسی پر اس کے دل پر بوجھ سا رکھا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

دوسری طرف عالیہ بھی بے حد اُداس تھی ایک طرف تو اسے نواب پر بہت زیادہ اعتماد تھا اس کی محبت کا یقین تھا اور واپسی کا بھی لیکن دوسری طرف ڈھیروں خدشات تھے کہ کہیں شہر چا کر نواب اسے بھول نہ جائے یا پھر کوئی اور لڑکی اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر لے وغیرہ وغیرہ دوسرا جب وہ نواب سے شادی کے بارے میں سوچتی تو اسے گھر والوں کا خیال سنانے لگتا اور وہ پریشان ہونے لگتی اس بات میں اسے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ نواب کے رشتہ ماٹھنے پر اسے انکار ہی سننے کو ہوتا لیکن لاڈلی بیٹی ہونے کے باعث یہ امید بھی تھی کہ وہ ضد کر کے ہمیشہ کی طرح اپنی بات منوالے گی۔ اس کی بے فکری والی زندگی میں اچانک ہی سوچیں اور پریشانیوں آ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

نواب رات ڈھلے گاؤں پہنچا تھا اور وہاں سے عابد کے پاس سے گھوڑا لے کر فوراً ہی جنگل کی طرف روانہ ہو گیا

تھا، جنگل میں اس روز اس کے سبھی ساتھی اڈے بر موجود تھے ان میں جو جاگ رہے تھے وہ اس کے آنے کی خبر سنتے ہی ملنے چلے آئے۔ اسلم سویا ہوا تھا لیکن کھڑوں کی ناپوں سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی وہ بھی فوراً اپنے خیمے سے باہر آ گیا تھا باقی سب تو مل کر واپس اپنے خیموں میں چلے گئے لیکن اسلم اور اکرم کافی دیر اس سے باتیں کرتے رہے تھے پھر اسلم بھی سونے کے لیے اٹھ گیا تو اکرم اس سے عالیہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ کافی دیر وہ عالیہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر دونوں سونے کے لیے لیٹ گئے۔ نواب تو اتنی ہی ڈرا بیو کر کے تھکا ہوا تھا فوراً ہی سو گیا جبکہ اکرم بھی کچھ نیند سے جاگا ہوا تھا اس لیے اسے بھی جلد نیند آ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن سے نواب اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا اس کے پیچھے کیا کچھ ہوا تھا وہ سب تفصیل سے بتا دی گئی تھی اور اس دن اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر آئندہ کی پلاننگ کی تھی اس طرح اس کا وہ دن بہت مصروفیت میں گزرا تھا۔ جمال کو پچھتے ہی اس کی واپسی کی خبر ملی تھی اس نے اسے ملنے کے لیے بلوایا تھا اس روز وہ چاہنے کے باوجود بھی عالیہ کو کال نہ کر سکا کیونکہ عالیہ نے اسے سختی سے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ صرف رات کے وقت ہی اسے کال کرے دن میں کوئی اس کے پاس موجود ہو سکتا تھا اور اگر ایک بار بھی کسی نے اس کے پاس موبائل دیکھ لیا تو پھر انہیں ساری بات کا پتا چل جاتا۔ جیسے ہی رات ہوئی نواب نے گھڑی میں وقت دیکھ کر اندازہ کیا کہ اب عالیہ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ چکی ہوگی اور اس نے جب فون ملایا تو عالیہ نے تیل ہوتے ہی کال ریسپونڈ کر لی عالیہ کو اس طرح اپنا منتظر دیکھ کر نواب کا دل خوشی سے بھر گیا اور وہ دونوں کافی دیر فون پر بات کرتے رہے اور مستقبل کی پلاننگ کرتے رہے۔

☆.....☆.....☆

نواب جمال سے بات کرنے پہنچا تو جمال نے اسے جو کام بتایا وہ ایک سیاسی شخصیت کے اغواء کا تھا، جمال لاشعوری طور پر اس فیڈ کو چھوڑنے کا سوچ رہا تھا اس لیے یہ بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”کس سوچ میں پڑ گئے ہو نواب مانا کہ بندہ سیاسی ہے لیکن تمہارے لیے کسی کو بھی اٹھانا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔“ اسے سوچ میں پڑا دیکھ کر جمال نے کہا تھا۔

”کام مشکل ہونے کی بات نہیں ہے جمال صاحب بس میں سوچ رہا تھا کہ بندہ اچھا خاصا سیاسی بیک گراؤنڈ رکھتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ گلے پڑ جائے۔“ نواب نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

”ارے تم کب سے ایسی باتوں کو سوچنے لگے پہلی بات تو یہ کہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا لیکن فرض کرو کوئی مسئلہ ہو بھی تو ہم یہاں کہیں لیے بیٹھے ہیں، تمہارا مسئلہ ہمارا مسئلہ ہے بے فکر رہو۔“ نواب اور زیادہ چٹھ نہیں کہہ سکا تھا اور تصویر اور تفصیل لے کر وہاں سے واپس آ گیا تھا۔ یہ سچ تھا آج سے پہلے نواب نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ سوچی بھی نہیں تھی اس نے بھی کوئی جرم کرتے ہوئے اس کے انجام کے بارے میں نہیں سوچا تھا نہ ہی فائدے نقصان کا حساب کتاب کیا تھا لیکن وہ آج ایسا سوچ رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب وہ اکیلا نہیں ہے اب وہ جو کچھ بھی کرتا اس کا اثر عالیہ کی زندگی پر بھی پڑنے والا تھا اور وہ عالیہ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں دے سکتا تھا اسی لیے اس اغواء کے لیے سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ابھی اسے خود بھی اچھی طرح اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اندر ہی اندر بہت بدل گیا تھا اگر ہم کی دنیا جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا اور جس کا وہ عادی تھا اب اسے بوجھ محسوس ہونے لگی تھی لیکن اس نے ابھی تک یہ بات کسی کے ساتھ شئر نہیں کی تھی۔

☆.....☆.....☆

نواب کا پہلا کاروبار بھی بہت اچھا چل رہا تھا لیکن وہ اسے بزنس کو فروغ دینا چاہتا تھا اس نے مارکیٹ کا جائزہ لیا اور ایک ساتھ دو تین بزنس شروع کر دیے ساتھ میں ایک ٹیکسٹری بھی اشارت کر لی اس طرح بزنس کی دنیا میں

اس کا نام اور بھی معتبر ہو گیا۔ نواب بڑے دل والا اور رحم دل باس تھا اس لیے اوپر سے نیچے تک سارا عملہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ پہلے بھی نواب ہر کام لگن سے کرتا تھا لیکن اب جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ اپنے لیے نہیں بلکہ عالیہ کے لیے کر رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ جب وہ عالیہ کا رشتہ مانگے تو اس کے گھر والے انکار نہ کر پائیں اسی لگن میں وہ دن رات ایک گھر رہتا۔

☆.....☆.....☆

نواب اور عالیہ کی ہر روز موبائل پر بات ہوتی تھی نواب کے گروپ کا اصول تھا کہ ان میں کوئی بھی اپنے پاس موبائل نہیں رکھتا تھا سب لوگ حتیٰ سے اس پر عمل کرتے تھے اور جس نے بھی اپنے گھر والوں سے بات کرنا ہوتی تھی وہ باہر جا کر پی سی او کا فون استعمال کرتا تھا لیکن اب نواب نے عالیہ کے لیے یہ اصول توڑ دیا تھا اور اپنے پاس موبائل رکھ لیا تھا کیونکہ وہ عالیہ سے بات کیے بنا کسی صورت نہیں رہ سکتا تھا ہاں یہ ضرور تھا کہ اس نے اپنا نمبر صرف عالیہ کو دیا تھا اور وہ اس موبائل کا استعمال بھی صرف رات کو عالیہ سے بات کرتے وقت ہی کرتا تھا باقی وقت اس کا موبائل بند رہتا تھا لیکن ہر روز بات کرنے کے باوجود وہ عالیہ سے ملنے کو بے چین تھا اور سارے کام کرنے کے باوجود وہ کھویا کھویا سا رہتا۔

کام تو وہ پہلے کی طرح ہی کر رہا تھا لیکن اب اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا اکرم اس کی کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا "آخر ایک دن اس نے نواب سے اس بارے میں بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"کیا بات ہے نواب تو بہت کھویا کھویا اور بے چین رہتا ہے۔" نواب اپنے جھونپڑے میں بیٹھا عالیہ کی یادوں میں کھویا ہوا تھا جب اکرم اس کے پاس چلا آیا اور آتے ہی پوچھنے لگا اکرم کے پوچھنے کی دیر تھی نواب نے اپنا حال دل اُسے کہہ سنایا اکرم کا اندازہ درست تھا۔ یہ عالیہ کی یاد ہی تھی جس نے اسے خاموش اور اُداس کر رکھا تھا۔

"یار اکرم میں سوچتا ہوں کہ عالیہ کو اپنے بارے میں سب کچھ سچ بتا دوں۔" نواب نے اکرم کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد کہا۔

"اور اگر سچ جان کر اس نے تجھے چھوڑ دیا پھر کیا کرو گے؟" اکرم نے دل میں ابھرتے خدشے کے تحت سوال کیا۔

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہوگی تو کبھی نہیں چھوڑے گی۔" نواب نے جواب دیا۔
"محبت اپنی جگہ لیکن کوئی بھی لڑکی کسی ایسے ڈاکو سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوگی جس کی جان ہر وقت خطرے میں پڑی رہتی ہو۔" اکرم نے اسے حقیقت کا چہرہ دکھانے کی کوشش کی۔

"اور اگر میں یہ سب چھوڑ دوں تو؟" نواب کی بات پر اکرم نے چونک کر اسے دیکھا تھا اسے اندازہ نہیں تھا کہ نواب عالیہ کے لیے اس حد تک سنجیدہ ہو چکا ہے کہ اس کے لیے سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہو سکتا ہے۔
"تو سب کچھ چھوڑ دے گا؟" اکرم نے پتا نہیں کیوں تصدیق چاہی شاید اس کے ارادوں کی پختگی کو جانچنا چاہ رہا تھا۔

"ہاں اگر وہ مان جائے تو میں سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوں اور ویسے بھی شہر میں اپنا کاروبار اتنا اچھا چل پڑا ہے کہ یہ سب کیے بنا بھی میں عالیہ کو بہت اچھی زندگی دے سکتا ہوں تم کیا کہتے ہو؟" نواب نے اپنے دل کی بات بتاتے ہوئے اکرم کی رائے مانگی۔

"اگر تم ایک اچھی زندگی کی طرف چلے جاؤ اور اپنا گھر بساؤ تو اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے۔" اکرم نے نواب کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تم میرا ساتھ دو گے؟" نواب نے اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے میں ہر حال میں ہر حالات میں تیرے ساتھ ہوں۔" اکرم کے کہنے پر نواب

بے اعتبار آگے بڑھا اور اکرم کو گلے سے لگایا۔ اکرم نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی حوصلہ دیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اکرم زندگی کے آخری سانس تک اس کا ساتھ دے گا اور اگر زندگی میں ایک ایسا دوست موجود ہو تو زندگی اور زیادہ خوبصورت لگنے لگتی ہے ایک ایسا دوست جس پر آپ اعتبار کر سکیں جس کا آپ کو بھروسہ ہو یقین ہو اور جو آپ کا یقین کبھی نہ توڑے اس لحاظ سے نواب اور اکرم دونوں بہت خوش قسمت تھے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ایسے دوست تھے جس کی دوستی پر فخر کیا جاسکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

کچھ دن بعد ہی نواب نے واپس عالیہ کے گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اس بار وہ بالکل اکیلا جا رہا تھا اکرم کو اسلم کی مدد کے خیال سے وہیں چھوڑ دیا تھا وہ اس بار اس ارادے سے جا رہا تھا کہ اس بار عالیہ کو اپنی ساری حقیقت بتا دے گا۔ راستہ بھر وہ انہی خیالوں میں کھویا رہا تھا سوچتا رہا تھا کہ میں یہ کیوں گا یوں کہوں گا عالیہ یہ جواب دے گی وہ جواب دے گی اس طرح سوچوں میں اٹھے ہوئے اسے سفر کا احساس ہی نہیں ہوا وہ راستے میں کھانا کھانے کے لیے بھی نہیں رُکا تھا اُسے اپنی منزل پر پہنچنے کی بہت جلدی تھی شاید جہاں اس کی جان نے اس کی زندگی کا فیصلہ سنانا تھا۔

☆.....☆.....☆

گاؤں میں داخل ہو کر وہ پچھلی بار کی طرح سب سے پہلے قبرستان گیا تھا اور ساجدہ کی قبر پر کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ وہاں سے اٹھا تو ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے ماں کے پاس آتے ہی وہ لہجے چوڑے نوجوان سے دس سال کا چھوٹا بچہ بن جاتا تھا اور اس کا دل ماں کو دیکھنے کو اس سے بات کرنے کو تڑپ اٹھتا تھا راستے میں اسے گورکن مل گیا گورکن نے اسے دیکھ کر سلام کیا نواب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے جیب میں سے کچھ پیسے نکال کر گورکن کو ہتھ دیا جو اس نے شکر گزاری کے ساتھ قبول کر لیے۔ قبرستان سے نکل کر نواب سیدھا حویلی کی طرف گیا تھا وہ چوہدرائوں کو سلام کرنا چاہتا تھا اور عالیہ کو دیکھنے کی امید بھی اسے حویلی کی طرف لے جا رہی تھی لیکن حویلی پہنچ کر نہ تو اس کی چوہدرائوں سے ہی ملاقات ہو پائی اور نہ ہی عالیہ کی جھلک دکھائی دی اس کی ملاقات حویلی کے باہر ہی چوہدری اور وسم سے ہو گئی تھی دونوں اس کے ساتھ بڑے روکھے پھیکے انداز میں پیش آئے یقیناً وسم نواب کے حوالے سے چوہدری کے کان بھر چکا تھا، نواب کو کافی مایوسی ہوئی لیکن پھر اس نے حویلی جا کر چوہدرائوں سے ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ویسے بھی اسے نہیں لگ رہا تھا کہ چوہدری اسے حویلی لے جا کر میزبانی کرنے کے موڈ میں ہے۔ وہ چوہدری کو اللہ حافظ کہتا ہوا اپنے گھر کی طرف گاڑی بڑھالے گیا۔

☆.....☆.....☆

گھر آتے ہوئے وہ ہوٹل سے اپنے لیے کھانا لیتا آیا تھا کھانا کھا کر وہ وہیں چارپائی پر لیٹ کر آسمان کو سنبھنے لگا وہ رات گہری ہونے کا منتظر تھا تا کہ عالیہ کو فون کر سکے اس نے اپنے آنے کے بارے میں عالیہ کو نہیں بتایا تھا وہ اچانک اس کے سامنے پہنچ کر اسے خوش اور حیران ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا ایک بار عالیہ نے کہا تھا کہ اب اس پر پابندیاں بڑھ گئی ہیں اس لیے وہ اب شاید اس سے مل بھی نہ سکے اور پھر مذاق کرتے ہوئے عالیہ نے کہا تھا کہ اگر ہمت ہو تو تم میری حویلی میں آ جانا اور مجھ سے مل لینا لینے لینے نواب کو یہ بات یاد آئی تو وہ چارپائی سے اٹھ بیٹھا اس کے ذہن میں ایک پلان آ رہا تھا اور پھر اس نے زیادہ نہیں سوچا بلکہ گھر کا تالا لگاتے ہوئے باہر نکل آیا تھا اس کا رخ حویلی کی طرف تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ تیز تیز قدموں سے حویلی کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اسے حویلی کی طرف جاتے ہوئے کوئی نہ دیکھے جب وہ حویلی کے قریب پہنچا تو وہاں وہ کچھ دیر کے لیے رُک گیا بہت بچپن میں

اس نے حویلی کے اندر کا حصہ دیکھا تھا وہ کئی بار عالیہ کے کمرے میں بھی گیا تھا لیکن اب حویلی کا نقشہ اس کے دماغ میں کافی دھندلا گیا تھا اور اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ عالیہ کا اب بھی وہی کمرہ تھا یا اس نے اپنا کمرہ تبدیل کر لیا تھا لیکن اب جو بھی تھا وہ یہاں تک آ گیا تھا یہاں سے اسے واپس نہیں جاسکتا تھا اس نے کچھ دیر حویلی کے اندر ہونے والی نقل و حرکت کا جائزہ لیا اور پھر دسبے قدموں حویلی کی طرف بڑھا حویلی کے بڑے گیٹ پر کوئی پہریدار نہیں تھا کیونکہ گاؤں میں ایسا ماحول ہی نہیں تھا کہ پہریدار کھڑے کرنے کی ضرورت پیش آتی وہ ایک پراسن گاؤں تھا جہاں زمینوں پر ہونے والے جھگڑوں کے علاوہ کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا اور چوری یا ڈکیتی کا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا ویسے بھی یہ چوہدری کی حویلی تھی جہاں رات کے ہر پہر ملازموں میں کوئی نہ کوئی جاگتا ہوا ہی ہوتا تھا یا کوئی خدمت گار اپنے کام میں مصروف ہوتا اور ڈیرے پر آئے مہمانوں کی مہمان نوازی میں لگا ہوتا ایسے چہل پہل والے ماحول میں چوری کرنے کے لیے آنے کے لیے بھی کوئی ہزار بار سوچتا لیکن نواب بلا سوچے سمجھے وہاں آچکا تھا بلکہ حویلی میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ چور نہیں تھا ڈاکو تھا اور ڈاکو اس طرح دسبے قدموں نہیں آیا کرتے جس طرح وہ آیا تھا۔ ذہن میں حویلی کا نقشہ دہراتے ہوئے وہ آگے بڑھا جا رہا تھا اور پھر آخر اسے وہ کمرہ دکھائی دے گیا جو کہ عالیہ کا ہوا کرتا تھا اور امید تھی کہ اب بھی وہ کمرہ عالیہ کا ہی ہوگا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن کھڑکی کھلی ہوئی تھی نواب دھیرے سے کھڑکی کے ذریعے کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

عالیہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی موبائل ہاتھ میں تھا وہ نواب کے فون کا انتظار کر رہی تھی اتنے میں اس نے کھڑکی سے کسی کو کمرے میں چھلانگ لگاتے دیکھا ہلکی روشنی میں وہ نواب کو پہچان نہیں پائی تھی اور پھر اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ نواب اس وقت گاؤں میں موجود ہوگا خوف کے مارے عالیہ کے حلق سے کھٹی کھٹی چیخ نکل گئی وہ اور زور سے چلاتی لیکن نواب نے تیزی سے آگے بڑھ کر عالیہ کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا۔

”خاموش رہو یہ میں ہوں نواب۔“ نواب نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی تو اس کی جان میں جان آئی نواب نے ہاتھ عالیہ کے منہ سے ہٹایا تو وہ نواب کے گلے لگ گئی نواب نے بھی اسے اپنی بازوؤں میں سیٹھ لیا کافی دیر دونوں یونہی خاموش ایک دوسرے میں گم گم کھڑے رہے نواب کو کچھ عجیب سا احساس ہوا تو اس نے عالیہ کو خود سے الگ کیا دیکھا تو عالیہ رو رہی تھی اس کی آنکھوں سے لگا تا بہرہ رہے تھے نقل و عمارت سے نہ گھبرانے والا نواب عالیہ کے آنسو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”کیا بات ہے تم رو کیوں رہی ہو؟“ نواب نے عالیہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے پوچھا تو وہ دوبارہ سے نواب سے لپٹ گئی اور کچھ بھی کہہ بنا بچکیوں سے رونے لگی آخر بڑی مشکل سے نواب اسے چپ کرانے میں کامیاب ہوا۔

”مجھے کا تم دوبارہ کبھی نہیں آؤ گے۔“ اس نے اپنے رونے کا سبب بتایا تو نواب کو ہنسی آ گئی۔

”ہلکی ایسی بات تو نے سوچی بھی کیسے تو جانتی نہیں تیرے بنائے میں نے یہ وقت کیسا گزارا ہے۔ ہر وقت تیری یاد آتی رہتی تھی۔“ نواب نے اس کے گالوں سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے دل کا حال بتایا تو وہ شرمائی۔

”تم اچانک گاؤں کیسے آ گئے؟“ نواب اسے لے کر بیڈ پر بیٹھ گیا تو عالیہ پوچھے لگی۔

”بس تمہاری یاد آ رہی تھی اور تم سے کچھ ضروری بات بھی کرنا تھی اس لیے آ گیا تمہیں بتایا اس لیے نہیں اچانک پہنچ کر تمہیں حیران کرنا چاہتا تھا لیکن تم تو ڈر گئیں۔“ نواب کا لہجہ آخر میں پھینرنے والا ہو گیا۔

”میں ڈرتی تو نہیں تھی وہ تو مجھے لگا کہ پتا نہیں کون آ گیا ہے۔“ عالیہ کو اب اپنے اس طرح ڈرنے پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

”اچھا بتاؤ تو ایسی کیا بات کرنی تھی جس کے لیے تمہیں یہاں آنا پڑا۔“ شرمندگی سے نکلنے کے لیے عالیہ نے

بات بدلی تو اس کے سوال پر نواب ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ آخر فیصلے کا وقت آ گیا تھا اور پھر اس نے گاؤں چھوڑنے سے لے کر دوبارہ گاؤں آنے تک اپنی زندگی کی ساری کہانی کہہ سنائی اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔

”میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تم میرا ساتھ دیتی ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں سارے جرائم چھوڑ دوں گا اور تمہیں زندگی کی ہر خوشی دوں گا اور اگر تم مجھے چھوڑنا چاہو تب بھی میں تمہارا فیصلہ مانوں گا۔“ نواب نے ساری بات بتاتے کے بعد بے حد جذباتی لہجے میں کہا تھا۔

”جب تک میں زندہ ہوں مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا اب تم جو بھی ہو جیسے بھی ہو میرے ہو مجھے قبول ہو۔“ عالیہ نے بھی اسی طرح جذباتی لہجے میں جواب دیا تو اس بار نواب نے اسے اپنے سینے میں چھپایا ماحول بے حد جذباتی ہو رہا تھا دونوں کی آنکھیں نم تھیں لیکن ان میں ایک عزم جھلک رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کے قریب نواب حویلی سے رخصت ہوا تھا اس بار واپس جاتے ہوئے اس کے دل میں کوئی خدشہ تھا نہ ہی کوئی خوف وہ بے حد مطمئن تھا عالیہ اس کے ساتھ تھی اور اس کے ساتھ کے ہوئے دنیا کی کوئی طاقت نواب کو ڈرائیں سکتی تھی وہ بے حد خوش تھا عالیہ نے اس کی محبت کا مان رکھ لیا تھا اسے امید تھی کہ وہ اسے باپوں نہیں لوٹائے گی لیکن پھر بھی تھوڑا بہت ڈر بھی تھا کہ کہیں وہ یہ جان کر کہ وہ ایک ڈاکو سے اسے ٹھکانہ دے۔ لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا واپسی کے سفر میں وہ مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا وہ مستقبل جس میں عالیہ نے اُس کے ساتھ اس کے سفر کے روپ میں ہونا تھا۔

☆.....☆.....☆

واپس آ کر اس نے اکرم اور اسلم کو بلا کر عالیہ سے ہوئی ساری بات بتادی اور انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر سیدھی سادھی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اس کی بات سن کر اکرم نے تو کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ وہ پہلے سے اس بارے میں جانتا تھا اسے بس خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ عالیہ نے سچ جان کر نواب کو چھوڑا انہیں تھا لیکن اسلم یہ سب سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”کیا بات ہے ماما کیا تم نہیں چاہتے کہ میں اس زندگی سے دور ہو جاؤں تمہاری تو ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ میں اچھی زندگی گزاروں پھر اب اتنے خاموش کیوں ہو۔“ نواب کو اسلم کی خاموشی بے چین کر رہی تھی۔

”بیٹا تمہارا فیصلہ بہت اچھا ہے اور جب تم اس پر عمل کر لو گے تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہی ہوگی لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں بیٹا کہ اس راستے پر آنا آسان ہوا کرتا ہے لیکن واپسی اتنی آسان نہیں ہوا کرتی کیا تم لوٹ پاؤ گے پوری طرح چھپلے باتوں کو بھول کر چھوڑ کر۔“ اسلم نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

”اگر آپ کا اشارہ ڈاکو کے ڈالنے کی طرف ہے تو میرا جواب ہے ہاں میں یہ سب کچھ بھول کر پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں اور آپ کا ساتھ اور دعا رہی مٹی انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا اور اگر آپ چودھری شاہ کر سے انتقام کی بات کر رہے ہیں تو میں اس بارے میں اپنے عہد پر آج بھی قائم ہوں اور جب تک اس سے بدلہ نہ لے لوں گا سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔“ نواب نے تفصیلی جواب دیا اکرم خاموشی سے ان کے درمیان ہونے والی بات چیت سن رہا تھا۔

”ایک طرف تم نئی زندگی کی طرف جانے کی بات کرتے ہو دوسری طرف تم انتقام کی باتیں کر رہے ہو مجھے بتاؤ تم آگ اور پانی کو ایک ساتھ کیسے رکھ سکتے ہو کہ دونوں ایک دوسرے پر کوئی اثر بھی نہ کریں۔“ اسلم نے سوال کیا۔

”آپ کی اس بات کے جواب میں میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں کوشش کروں گا کہ اس انتقام کا اثر میری زندگی نہ بڑے۔“ نواب کو خود بھی اندازہ تھا کہ وہ جو بات کر رہا ہے وہ کتنی عجیب بلکہ بے لگتی ہے کیونکہ یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا کہ کوئی انتقام کی آگ میں جل رہا ہو اور وہ آگ اسے نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن اس کے پاس اور

کوئی چارہ بھی نہیں تھا اگر فرض کرو وہ شاکر کو بھول بھی جاتا (جو کہ ناممکن تھا) تو شاکر اسے کبھی نہ بھولتا جب تک شاکر زندہ تھا وہ نواب کی زندگی کے لیے خطرہ بنے رہتا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ان چیزوں سے آزاد کریں تاکہ میں اپنی پوری توجہ اپنے کاروبار کو دے سکوں، گروپ کے سردار آپ بن جائیں یا پھر اکرم یہ ذمہ داری سنبھال لے جیسے جی آپ مناسب سمجھیں۔“ نواب سارے فیصلے کیے بیٹھا تھا اور ان پر عمل کرنے میں بھی دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”بات یہ ہے بیٹا کہ میں بھی اب اس بھاگ دوڑ کی زندگی سے تھک گیا ہوں بڑھا پائی آ گیا ہے اب جو کچھ وقت بچا ہے اسے سکون سے گزارنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ بہتر ہوگا اکرم بھی اس زندگی کو چھوڑ کر نئی زندگی کا آغاز کر دے۔“ اسلم نے اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو نواب بھی سوالیہ نظروں سے اکرم کی طرف دیکھنے لگا۔

”آئیڈیا تو بہت اچھا ہے تم اس بارے میں کیا کہتے ہو اکرم؟“ آخر نواب نے اکرم کی رائے مانگ لی۔
 ”تم دونوں کو یہی ٹھیک لگتا ہے تو یہی ٹھیک ہے ویسے بھی جب تم دونوں یہ زندگی چھوڑ رہے ہو تو میں یہاں رہ کر کیا کروں گا میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔“ اکرم نے بھی اپنا فیصلہ سنایا تو اسلم اور نواب دونوں مسکرانے لگے۔

”نواب یہ طے ہو گیا ہے کہ ہم تینوں ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔“ نواب نے کہا۔
 ”انشاء اللہ.....“ اسلم اور اکرم نے بے ساختہ انشاء اللہ کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے ہی دن نواب نے سب ساتھیوں کو جمع کر کے گروپ چھوڑنے کے بارے میں بتا دیا تھا جس سے گروپ میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی کئی ساتھیوں نے نواب پر اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے زور بھی دیا لیکن وہ اپنے ارادوں کا پکا تھا ویسے بھی اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا ایسے پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا سب ساتھیوں کے مشورے سے اور اتفاق سے گروپ کے ایک سینئر بندے کو گروپ کا نیا سردار بنا دیا گیا اور اس طرح نواب باقاعدہ طور پر گروپ سے الگ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

کہتے ہیں عشق اور محبت چھپانے نہیں چھپتا عالیہ اور نواب کے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا ان کی کھیتوں میں ہونے والی ملاقاتیں لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھیں اور جو باتیں پہلے سرکوشیوں میں کی جاتی رہی تھیں اب ہر جگہ سر عام اس کا ذکر ہو رہا تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گاؤں میں عالیہ کے کئی عاشق موجود تھے ان کی اپنی پرورداری میں بھی اس کے کئی امیدوار تھے جس لڑکی پر اپنی نظریں مگی ہوں اس کی کوئی بھی ایسی حرکت کیسے چھپی رہ سکتی تھی جب یہ خبریں جو ہدرائن تک پہنچیں تو اس نے عالیہ کو اپنے پاس بلوا کر سیدھا اس سے پوچھ لیا کہ ان باتوں میں کتنی سچائی ہے۔

عالیہ چاہتے ہوئے بھی ماں کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی اور اس نے نواب سے اپنی محبت کا اقرار کر لیا تھا ویسے بھی وہ خود یہ بات اپنے ماں باپ تک پہنچانا چاہتی تھی انہیں نواب کے بارے میں بتانا چاہتی تھی تاکہ معاملات آگے بڑھائے جا سکیں اس لیے جب اسے ماں نے بلا کر اس بارے میں خود سوال کر دیا تو اس نے جھوٹ بولنے کی بجائے ساری بات سچ سچ بتا دی۔ جس پر جو ہدرائن کو زندگی میں شاید پہلی بار اپنی لاڈلی بیٹی پر اتنا شدید غصہ آیا تھا کہ اس کا ہاتھ عالیہ پر اٹھ گیا تھا ہمیشہ ماں کی محبت ماننے والی عالیہ کو بھی اتنے شدید رد عمل کی امید نہیں تھی اس لیے پھڑکھا کر وہ بھی ہکا بکا کھڑی ماں کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی پھر جب ذرا ہوش آیا تو بھائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

نواب نے بہت تیزی سے سارے معاملات بنائے تھے اور وہ اکرم اور اسلم کو لے کر شہر شفٹ ہو گیا تھا، فی الحال ان کا قیام کرائے کی ایک کوچھی پر تھا لیکن نواب نے اپنے سپنوں کا گھر بنانے کے لیے زمین دیکھنا شروع کر دی تھی۔ بہت جلد اس نے ایک پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے ایک پلاٹ پسند کر لیا اس کا رقبہ کافی زیادہ تھا لیکن نواب کا خواب تھا کہ وہ عالیہ کے لیے بہت شاندار گھر تعمیر کرے اور وہ اسی سلسلے میں یہ سب کر رہا تھا بہت جلد اس نے گھر کا نقشہ بھی بنوایا اور اکرم کی نگرانی میں اس گھر کی تعمیر کا کام تیزی سے ہونے لگا۔

☆.....☆.....☆

گھر کی تعمیر میں کئی مہینے لگ گئے تھے اس دوران فون پر نواب کا عالیہ سے مسلسل رابطہ تھا۔ گھر تعمیر ہوتے ہی نواب نے اسلم کو عالیہ کے گھر جانے کا کہا اس کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا سو عالیہ کے گاؤں رشتہ لے کر جانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، اسلم کا بس نہ چل رہا تھا کہ شگن کے طور پر ساری دنیا کی چیزیں عالیہ کے لیے لے کر چلا جائے اکرم اس کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

وہ لوگ کئی دن تک جانے کی تیاریاں کرتے رہے تھے اگرچہ اس وقت وہ حیثیت میں عالیہ کی فیملی سے بہت زیادہ آگے جا چکے تھے لیکن مالی حیثیت کے علاوہ بھی ایسا بہت کچھ ہوتا ہے جو رشتہ جوڑتے ہوئے دیکھا جاتا ہے اور انہی باتوں کی وجہ سے اسلم دل ہی دل میں فکر مند بھی تھا لیکن وہ اپنی فکر مندی ظاہر کر کے اکرم کے جوش و خروش اور نواب کی خوشی کو کم نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنی ساری سوچیں اپنے تک محدود رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے گاؤں جانے کا وقت قریب آ رہا تھا اس کی فکر مندی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے لیے خوشیاں لینے جا رہا تھا لیکن پتاہ نہیں آنے والا وقت ان کے لیے کیا لانے والا تھا۔

☆.....☆.....☆

تین شاندار گاڑیوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ جس وقت گاؤں میں داخل ہوا ہر دیکھنے والا متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ آگے والی گاڑی میں اسلم اور اکرم تھے گاڑی کو روٹی پوٹ ڈرائیور چلا رہا تھا پیچھے کی دونوں گاڑیوں میں سامان تھا جب یہ لوگ چوہدری کی حویلی پر پہنچے تو اس وقت چوہدری گھر پر موجود تھا اور اس کا بیٹا ویم بھی گھر ہی تھا ملازم نے انہیں مہمانوں کی آمد کا بتایا تو وہ مہمانوں کے استقبال کے لیے گیٹ پر چلا آیا اتنے سالوں میں اسلم کی شکل و صورت میں کافی تبدیلی آ چکی تھی کچھ دولت کی فراوانی اور مسکھری زندگی نے بھی اس پر بہت اچھے اثرات مرتب کیے تھے اس وقت سوٹ پہنے وہ کوئی خوشحال سیٹھ لگ رہا تھا۔ چوہدری نے اسے بالکل بھی نہیں پہچانا تھا ویسے بھی اس کے لیے اسلم کو پہچانا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس نے بہت سالوں پہلے اسے دیکھا تھا اور وہ بھی کوئی ایسی ملاقات نہیں تھی جس میں خاص طور پر اسلم کی طرف توجہ ہو سکتی۔ چوہدری کی معیت میں وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے چلتے حویلی کے اندر داخل ہوئے اور چوہدری انہیں لے کر بیٹھک کی طرف بڑھا۔ اسلم کے اشارے پر ڈرائیور سامان گاڑی سے نکال کر ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے اور کمرے میں سامان رکھ کر موڈ بانہ کھڑے ہو کر اگلے حکم کا انتظار کرنے لگے پھر اسلم کے اشارے پر وہ سب وہاں سے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

”میں اسلم ہوں اور یہ میرا بیٹا اکرم.....“ اسلم نے تعارف کی رسم نبھائی چوہدری مروت سے مسکرایا لیکن اس نے انہیں پہچانا نہیں تھا البتہ ان کی آن بان سے متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

”شاید آپ نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں چوہدری صاحب۔“ اسلم کو چوہدری کے رویے سے اندازہ ہو گیا تھا تبھی مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”واقعی میں ابھی تک آپ لوگوں کو نہیں پہچان سکا۔“ چوہدری نے معذرت خواہانہ لہجے میں اقرار کیا تو جواب میں اسلم اپنا تعارف تفصیل سے کروانے لگا اب نہ پہچاننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چوہدری کے رویے میں

واضح فرق محسوس ہو رہا تھا یعنی جن مہمانوں کو وہ زیادہ اہمیت دے رہا تھا وہ اب کتنے بھی دولت مند کیوں نہیں ہوتے تھے لیکن تھے تو اس کی رعایا میں سے ہی دوسرے اس خاندان کے لیے چوہدری کے دل میں کبھی بھی کوئی اچھے جذبات نہیں رہے تھے اور اب نواب اور عالیہ کی بات مشہور ہونے کے بعد تو وہ خاندان اس کے لیے قابل نفرت ہو چکا تھا۔ چوہدری کے روئے سے ساری گرجوشی ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ سردمہری نے لے لی تھی۔ چوہدری کے بدلتے ہوئے رویے نے اسلم کے خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ خاصی بے چینی محسوس کر رہا تھا اگر کم نے بھی ماحول میں تناؤ و محسوس کر لیا تھا اور اس کے چہرے سے بھی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

”چوہدری صاحب میں ایک خاص مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ مجھے مایوس نہیں لوٹائیں گے۔“ اسلم نے طریقے سے بات کا آغاز کیا چوہدری کے تاثرات مزید پیچیدہ ہو گئے وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا کہ ان کی آمد کا مقصد نہ جان سکتا، ویسے بھی عالیہ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ صرف اور صرف نواب سے شادی کرے گی ایسے میں ان لوگوں کی آمد کا مقصد واضح تھا۔

”اگر تم لوگ ہماری بیٹی کے سلسلے میں آئے ہو تو آگے بات کرنے کی ضرورت نہیں میری طرف سے صاف انکار ہے۔“ چوہدری نے بات سننے سے پہلے ہی انکار کر دیا۔

”چوہدری صاحب آپ تسلی سے میری بات سن لیں اور پھر سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔“ اسلم کو اس سے اتنے ہی صاف انکار کی امید تھی اس لیے اسے کوئی خاص جھنجکاہٹ نہیں لگا تھا کیونکہ وہ ذہنی طور پر اس سب کے لیے تیار ہو کر آیا تھا اور یہ بھی سوچ کر آیا تھا کہ وہ اپنی بات منوائے بنا وہاں سے نہیں اٹھے گا لیکن چوہدری کا بے لچک رویہ اس کے ارادوں کو کمزور کر رہا تھا۔

”مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں میں جواب دے چکا ہوں۔“ چوہدری نے پھر کہا۔

”دیکھیے چوہدری صاحب آپ بیٹی کے باپ ہیں فیصلہ آپ کو کرنا ہے اور آپ اپنی بیٹی کے لیے جو بہتر سمجھیں فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن میری گزارش ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ٹھوڑا سوچ سمجھ لیں، نواب میرا بھانجا ہے لیکن مجھے اپنے سگے بیٹے سے بڑھ کر عزیز ہے وہ ایک اچھا لڑکا ہے ہر طرح سے اس قابل ہے کہ آپ کی بیٹی کو خوش رکھ سکے۔“ اسلم ابھی بول ہی رہا تھا کہ چوہدری نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

”ابھی ہمارے خاندان پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ ہم چوراچکوں کے ساتھ اپنی بیٹیاں بیٹیاں لگ جائیں۔“ چوہدری کا لہجہ اور الفاظ اتنے زیادہ سخت اور ہتک آمیز تھے کہ اسلم اور اکرم دونوں کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، اکرم نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسلم نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا اتنا کچھ ہونے کے باوجود نہیں چاہتا تھا کہ معاملہ بالکل ہی ہاتھوں سے نکل جائے۔

”چوہدری صاحب نواب ایک باعزت بزنس مین ہے شہر میں دس لوگ اٹھ کر اسے سلام کرتے ہیں اور.....“ اسلم نے کچھ کہنا چاہا لیکن چوہدری نے ایک بار پھر اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

”اب وہ کوئی بھی بہرہ و بھروسے کے لوگ تو وہی کا وہی قائل باپ کا جراثیم پیٹہ بیٹا.....“ چوہدری کے لہجے میں حقارت تھی وہ یقیناً بہت کچھ معلومات حاصل کر چکا تھا۔

”وہ سب برائی باتیں ہیں چوہدری صاحب آپ آج کو دیکھیے۔“ یہ جاننے کے بعد کہ چوہدری ان کے بارے میں سب کچھ نہ سہی بہت کچھ جان چکا تھا اسلم نے بھی خواہ مخواہ پردے ڈالنے اور کچھ چھپانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینے کی بجائے سیدھی بات کی۔

”آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔“ چوہدری غصے سے کہہ رہا تھا اسلم اور اکرم کے لیے وہاں سے جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جاتے ہوئے اپنا سامان ساتھ لے جانا نہ بھول جانا۔“ چوہدری نے تاکید کی۔

”ایسا نہ کریں چوہدری صاحب وہ ہم عالیہ بیٹی کے لیے تحفے لائے ہیں انہیں واپس نہ کریں۔“ دروازے کی طرف جاتے ہوئے اسلم نے چوہدری کی بات پر مڑتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

”تحفے تحائف اپنے برابر کے لوگوں میں لیے دیے جاتے ہیں میاں جا کر کوئی اپنے برابر کے لوگ تلاش کرو جو دولت کی چکا چوند سے اندھے ہو کر تمہاری بات مان لیں یہاں اس مال و دولت سے زیادہ اہمیت خاندانی شرافت کی ہے۔“ چوہدری نے ایک بار پھر پہلے والے لہجے میں کہا، اب کوئی مہنجائش نہیں رہ گئی تھی وہاں رکنے کی اور رشتے کی بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اسلم اور اکرم بھاری دلوں کے ساتھ مایوس لوٹ گئے۔ جتنے خوش خوش وہ آئے تھے جاتے ہوئے اتنے ہی اداس اور ناخوش تھے باپ کی اتنی توہین پر چپ رہنا اکرم کے لیے مشکل ہو رہا تھا لیکن اسلم اسے مسلسل حل کا مظاہرہ کرنے کا کہہ رہا تھا۔

”چوہدری نے اچھا نہیں کیا ابا۔“ گاڑی روانہ ہوئی تو اتنی دیر سے خاموش رہنے والا اکرم بولے بیٹا نہ رہ سکا۔

”میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ نواب کو کیا جواب دوں گا۔“ اسلم نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اپنی فکر بیان کی۔

”جو جواب ملا ہے وہی جواب دے دینا اس میں سوچنے والی کیا بات ہے۔“ اکرم کو اپنے باپ کی بات سن کر تعجب ہوا تھا جس کا اظہار کیے بنا وہ نہیں رہ سکا تھا اسلم کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اکرم کچھ دیر اسلم کے بولنے کا منتظر رہا پھر اس کی خاموشی سے تھک کر اس نے اپنی نظریں کھڑکی سے باہر بھارتے دوڑتے مناظر پر جمادیں اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی سلو میں بتا رہی تھیں کہ اس کا موڈ بہت زیادہ خراب تھا اسلم اور نواب کے خیال سے وہ چوہدری کے سامنے خاموش رہا تھا لیکن اس کے اندر غصہ جمع ہوتا رہا تھا جواب باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

نواب کو بہت اچھی امیدیں تھیں اسے نہ جانے کیوں یہ یقین ہو چلا تھا کہ جس طرح اس نے اپنے ماضی کو چھوڑ دیا ہے اس طرح لوگ بھی اس کے ماضی کو بھلا کر اس کے حال میں اسے دیکھیں گے اور اسی حیثیت سے اسے اپنائیں گے۔ دوسری طرف عالیہ تھی جسے اپنے گھر والوں سے ایک فیصد بھی یہ امید نہیں تھی کہ وہاں سے اسلم لوگوں کو کوئی مثبت جواب دیا جائے گا لیکن اسے یہ امید بھی نہیں تھی کہ اس کی حویلی میں روایات کو بھول کر مہمانوں کی بے عزتی کی جائے گی مہمانوں کے جانے کے بعد گھر کے ملازم نے ایک ایک بات چوہدرائے کے سامنے بیان کر دی تھی اور عالیہ نے بھی وہ سب باتیں سنی تھیں۔

ایک طرف تو اسے اس بات کا غصہ تھا کہ اس کی بات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جو اس کے لیے بالکل ناقابل برداشت بات تھی دوسری طرف وہ نواب سے شرمندہ ہو رہی تھی وہ کیا سوچے گا اس کے بارے میں اور جب وہ اس بارے میں عالیہ سے سوال کرے گا تو بھلا وہ کیا جواب دے گی اسی طرح کی سوچوں نے اُسے بے چین کر رکھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دن میں ہی نواب کو فون کرنے کا فیصلہ کیا تھا غصے اور جھنجھلاہٹ میں اس نے ہر بات کو نظر انداز کر دیا تھا حتیٰ کہ اپنے کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں کیا تھا اس کے ذہن میں بس ایک ہی بات گھوم رہی تھی کہ کسی طرح نواب سے اس کی بات ہو جائے۔

☆.....☆.....☆

نواب بھی مسلسل فون کی طرف متوجہ تھا وہ بے چینی سے اسلم کی طرف سے کسی اچھی خبر کا منتظر تھا گاؤں پہنچنے تک کی اطلاع اسے مل گئی تھی اور اب اس بات کو دو گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے تھے اب تک ان کی طرف سے کوئی فون وغیرہ آ جانا چاہیے تھا نواب بے چینی سے ٹپکتے ہوئے سوچ رہا تھا پھر کچھ سوچ کر اس نے اکرم کا نمبر ملا دیا نہ جانے کیوں اسے اسلم سے براہ راست پوچھتے ہوئے جبکہ محسوس ہو رہی تھی لیکن اکرم نے دو تیل کے بعد ہی اس کا فون کاٹ دیا نواب نے حیرت سے موبائل کو دیکھا اکرم اس کی کال کبھی نہیں کاٹا کرتا تھا چاہے وہ کسی انتہائی ضروری

میٹنگ میں ہی کیوں نہ ہوتا۔

”اس نے فون کیوں کاٹ دیا؟“ نواب کا ذہن مسلسل اس سوال میں اٹکا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

”نواب کا فون ہے؟“ اپنی سوچوں میں گم اسلم اکرم کے فون پر ہونے والی گھنٹی کی وجہ سے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا پھر اس نے اکرم کو فون کاٹنے دیکھا اکرم کے چہرے کے تاثرات سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فون کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ نواب ہے۔

”جی نواب کا فون ہے۔“ اکرم نے جواب دیا۔

”فون کیوں کاٹا.....؟“ اسلم کے پوچھنے پر اکرم نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اور کیا کرتا کیا جواب دیتا نواب کے سوالوں کا۔

”بات کراؤ میری۔“ اسلم کے کہنے پر اکرم نواب کا نمبر ملانے لگا۔

☆.....☆.....☆

ابھی اسے فون بند کیے ہوئے چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کے فون پر کال آنے لگی اکرم کا نام دیکھ کر نواب نے جلدی سے لیں کا بٹن پیش کرتے ہوئے کال ریسیو کر لی دوسری طرف اکرم نے ہیلو ہائے کے بعد فون اسلم کو پکڑا دیا تھا وہ جو اکرم سے بہت کچھ جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اس کے اس طرح اسلم کو فون دینے پر جھنجھلا سا گیا، گھر وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

”ہم حویلی سے ہو آئے ہیں اب واپسی ہے گھر آ کر بات کرتے ہیں۔“ اسلم نے مختصر ترین الفاظ میں اپنی بات کہہ کر فون رکھ دیا تو نواب اُلجھا سا گیا اگرچہ اسلم نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن پھر بھی نواب کا دل پریشان ہو گیا تھا اسے لگ رہا تھا کہ وہاں کچھ غلط ہوا ہے ابھی وہ انہی سوچوں میں تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی اس بار فون کرنے والے کا نام دیکھ کر وہ چونک گیا اور جلدی سے کال ریسیو کر لی دوسری طرف عالیہ تھی جو اپنے گھر والوں کے روپے پر پریشان تھی اور شرمندہ تھی۔

”سنو مجھے ٹھیک سے بتاؤ کیا ہوا ہے تمہارے گھر والوں نے کیا جواب دیا۔“ عالیہ کے معذرت بھرے الفاظ سن کر وہ بولا تھا۔

”مجھیں نہیں معلوم کیا ہوا ہے؟“ عالیہ نے اُلٹا اس سے سوال کر دیا۔

”اگر مجھے پتا ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے کیا کہا تمہارے گھر والوں نے میرے ماما سے۔“ عالیہ کے سوال نے نواب کی بے چینی میں اضافہ کر دیا تھا اسے لگ رہا تھا کہ اس کی چھٹی حس اسے جو بتا رہی تھی وہی سچ تھا وہاں جو بھی ہوا وہ کچھ اچھا نہیں تھا اس سے پہلے کہ عالیہ اسے کچھ بتا پائی اسے عالیہ کی طرف سے شور سانسائی دیا یقیناً کسی نے اسے فون کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا لائن کٹ چکی تھی۔

نواب نے بے اختیار عالیہ کا نمبر ملا یا تیل جاری تھی لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا پھر کال کاٹ دی گئی، نواب نے دیوانگی سے دو بارہ نمبر ملا یا لیکن اس بار فون آف تھا نواب سب کچھ بھول گیا اسے اس وقت صرف عالیہ کی فکر ہو رہی تھی وہ تصور کر سکتا تھا اس وقت عالیہ کے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا۔

اس کا دل چاہا ایک بار پھر اکرم کا نمبر ملانے لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش رہا اسے صبر کرنا تھا اور انتظار کرنا تھا جب تک کہ اسلم اور اکرم گھر نہ پہنچ جاتے۔

☆.....☆.....☆

گھر پہنچ کر اسلم نے نہایت مناسب الفاظ میں چوہدری کا انکار نواب تک پہنچایا تھا لیکن پھر بھی وہ شدید غصے میں آ گیا تھا اسے یہ ملال بھی ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے ماما کی بے عزتی ہوئی ہے حالانکہ اسلم نے اسے کافی

سمجھایا تھا کہ اس طرح کے معاملات میں انکار ہو جائے تو اسے بے عزتی نہیں سمجھا کرتے لیکن نواب کا غصہ کسی طرح کم ہو کے نہ رہا تھا دوسری طرف اسے عالیہ کی بھی فکر ستا رہی تھی جو نہ جانے کس حال میں تھی عالیہ سے رابطے کا واحد ذریعہ وہ موبائل تھا جو اس وقت عالیہ کے گھر والوں کے قبضے میں تھا جب اور کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو نواب نے گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆.....☆.....☆

فیصلہ کرنے کے بعد نواب اسلم کے کہنے پر بھی نہیں رکا تھا اور سیدھا گاؤں چلا آیا تھا وہ جانتا تھا ایک بار وہ گاؤں پہنچ گیا تو کسی نہ کسی طرح عالیہ سے ملاقات ہو ہی جائے گی ورنہ کم از کم وہ رانی کے ذریعے اپنا پیغام تو اس تک ضرور ہی پہنچا دے گا اور ہوا بھی یہی اسے گاؤں پہنچے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ رانی عالیہ کا پیغام لے کر اس کے پاس آ گئی عالیہ نے شام کو اسے اپنی مخصوص جگہ پر ملنے کے لیے بلوایا تھا۔ پیغام دینے کے بعد رانی رکی نہیں تھی بلکہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی تھی وہ عالیہ کے لیے وہاں تک آ تو گئی تھی لیکن اب اسے یہ فکر بھی ستا رہی تھی کہ کوئی اسے وہاں سے آتے جاتے نہ دیکھے۔

☆.....☆.....☆

رانی کے جانے کے بعد کا سارا وقت نواب نے بہت بے چینی سے گزارا تھا اس روز وہ دن میں ایک بار بھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا کھانا کھانے کے لیے بھی نہیں کہ اس کی بیجوبک پاس سب کچھ موجودہ حالات نے اڑا دی تھی۔ اس نے ساری رات گاڑی ڈرائیو کی تھی اب وہ تھکا ہوا تھا بستر پر لیٹے لیٹے عالیہ کے بارے میں سوچتا ہوا وہ کئی بار غنودگی میں چلا گیا تو خواب میں بھی کسی عالیہ کا موبائل کوئی چھین لیتا تو بھی عالیہ اس سے ملنے کے لیے نہ آ پائی اس طرح سوتے جاتے اس نے دوپہر تک کا وقت گزارا تھا اور اس کے بعد وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اس روز وہ خود کو دنیا کا سب سے بے کار اور فالتو آدمی لگ رہا تھا جس کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی سوائے انتظار کرنے کے شام قریب آئی تو وہ نہانے کے لیے ہاتھ روم میں گھس گیا نہادھو کر وہ خود کو کافی فریش محسوس کرنے لگا اور پھر ناٹم ہونے پر وہ گھر سے نکل کر جانے پہچانے راستوں پر چلنے لگا۔

☆.....☆.....☆

اس روز عالیہ کے لیے گھر سے نکلنا آسان کام نہیں تھا اس کے لیے گھر سے باہر جانے پر پابندی لگی ہوئی تھی چوہدرائیں بھی اس سے ناراض تھی اس لیے اسے کسی قسم کی رعایت کی امید نہیں تھی آج کل اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں بند ہو کر ہی گزارتا تھا گھر میں کوئی اس سے بات کرنے کا ارادہ نہ تھا تو وہ بھی کسی سے بات کرنے کے موڈ میں کہاں تھی وہ سب سے روٹھی ہوئی تھی لیکن زندگی میں پہلی بار کسی کو اس کے روٹھنے کی کوئی پرواہ نہیں تھی جب سے اس کے پاس سے موبائل ملا تھا چوہدری خود کو تھکا ہوا اور ہارا ہوا محسوس کر رہا تھا تو چوہدرائیں اپنی تربیت پر شرمندہ نہیں لیکن ماں باپ ہونے کے ناطے عالیہ کو کچھ کہنے سے بھی گریز کر رہے تھے کہ وہ ان کے جگر کا ٹکڑا تھی جسے بھی انہوں نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا لیکن وسیم کے معاملے میں ایسا نہیں تھا وہ غصے میں تھا اور اپنے غصے کا بھر پورا اظہار بھی کر رہا تھا اس کے غصے کی وجہ سے عالیہ بھی اس کے سامنے آنے سے گریزاں تھی اور جب کبھی بھولے بھٹکے اچانک ان کا سامنا ہو جاتا تو وسیم کی آنکھوں سے نلکتے غصے کے شعلے عالیہ کو ہراساں کر دیتے اس کے باوجود جب اس نے سنا کہ نواب گاؤں پہنچ گیا ہے تو اس نے فوراً رانی کے ہاتھ اسے ملنے کا پیغام بھجوایا تھا یہ اور بات کہ اس وقت سے وہ باہر نکلنے کے بہانے تلاش کر رہی تھی اور مسلسل ناکام ہو رہی تھی اسے کوئی راستہ بھائی نہ دیا تو اس نے ایک بار پھر رانی سے مدد مانگی رانی کو اپنے بستر پر لٹا کر وہ چپکے سے حویلی سے نکل آئی اور تیز تیز قدموں سے اس طرف بڑھنے لگی جہاں اس نے نواب کو ملنے کے لیے بلایا ہوا تھا۔

اس سنسنی خیز ناول کے باقی واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے

چشم کشا کہانیاں

سچی کہانیاں جن کا انجام اور طرح کا ہے



مصباح حیات

اے شاخ شجر ہم سے نہ کر ترک تعلق
اک رت میں ترے جسم کی پوشاک تھے ہم بھی

میجر (ر) امتیاز حسین ملک

کی۔ وہ بولے۔

”مرسلین صاحب کو کوئی پریشانی لاحق ہے اس سلسلے میں آپ سے مشورہ اور مدد درکار ہے۔“ مرسلین مجھے خاصے مضطرب نظر آئے۔ میں نے انہیں تسلی دی۔

”فکر نہ کریں اگر میں کچھ کر سکا تو ضرور کروں گا۔“ ان کو سنبھالنے کے لیے میں نے انہیں چائے پیش کیا جو انہوں نے شکرے کے ساتھ قبول کیا۔ سبز چائے تو میرے آفس میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔ دودھ والی چائے چینی ہو تو منگوانی پڑتی ہے۔ لیکن انہوں نے سبز چائے ہی پسند کی اس لیے آسانی رہی۔ چائے وغیرہ پی کر یہ لوگ آرام سے بیٹھے تو میں نے مرسلین سے پوچھا۔

”اب بتائیں کیا مسئلہ ہے؟“

”کیا بتاؤں بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ آپ کے پاس مشورے اور مدد کے لیے آئے ہیں۔“ وہ بولا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

”اللہ رحم کرے گا۔ لیکن آپ بتائیں تو سہی آخر مسئلہ کیا ہے۔“ اس نے کچھ کاغذات میرے سامنے رکھ دیے ان کے ساتھ کچھ تصویروں بھی تھیں اور بولا۔

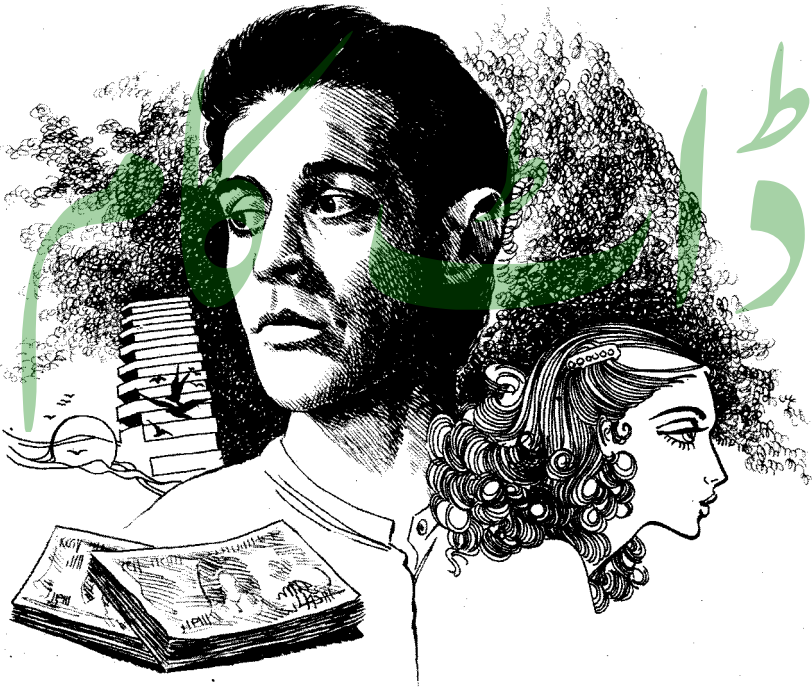
مارچ کے آخری ہفتے کی بات ہے میں ایک کام کے سلسلے میں سیکریٹریٹ گیا ہوا تھا۔ آفس واپس آیا تو پتہ چلا کہ منہاس صاحب دو چکر لگا چکے ہیں۔ کوئی اور صاحب بھی ساتھ تھے۔ کوئی ضروری کام تھا اس لیے پھر آنے کا کہہ گئے ہیں۔ بڑی حیرانی ہوئی آخر ایسا کیا کام پڑ گیا ان کو کہ اس طرح چکر لگا رہے ہیں۔

منہاس صاحب ایک مقامی ماہنامے کے ایڈیٹر ہیں۔ ان سے اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ اکثر ملنے آتے رہتے ہیں لیکن ان کا اس طرح بار بار چکر لگانا باعث تشویش تھا۔ پتہ نہیں بے چاروں کو کیا پریشانی تھی۔ انہیں فون کر کے معلوم کرنے کا سوچا۔ ابھی فون ڈائل ہی کر رہا تھا کہ منہاس صاحب آفس میں داخل ہوئے ان کے ساتھ مرسلین بھی تھے۔ مرسلین کے

ساتھ منہاس صاحب کے آفس میں ہی ایک دو دفعہ ملاقات ہوئی تھی لیکن کوئی ایسے تعلقات نہ تھے۔ ہم دونوں منہاس صاحب کے ماہنامے کے لیے لکھتے تھے۔ علیک سلیک ہوئی اور دونوں سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ منہاس صاحب سے خیر خیریت پوچھنے کے بعد میں نے اپنی غیر حاضری کے لیے معذرت کی اور پھر ان سے اس طرح بار بار چکر لگانے کی وجہ دریافت

کاغذات پڑھتا دیکھ کر مرسلین نے کہا۔
 ”آپ نسلی سے بڑھ لیں ہم لوگ بیٹھے ہیں۔“
 میں نے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ لوگ سامنے
 ہی بیٹھ گئے۔ میں نے نسلی سے سارا کیس پڑھا۔
 مرسلین کے کسی لڑکی سے تعلقات کا قصہ تھا جو منشی تک
 پہنچا لیکن پھر تھقل کا شکار ہو گیا۔ سارا معاملہ بڑی
 تفصیل سے لیکن بڑے جذباتی انداز سے لکھا گیا تھا۔
 قصے میں جذبات زیادہ تھے اور حقائق کم۔ اس لیے
 کیس ٹھیک طریقے سے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اسی طرح
 چیسے بیان کرتے ہوئے آواز جذبات سے زندہ
 جائے تو بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کئی چیزیں تشریح طلب
 تھیں تو کچھ تفصیل طلب۔ کاغذات پڑھنے کے بعد
 میں نے کچھ پوچھنے کے لیے مرسلین کی طرف دیکھا۔
 وہ پہلے ہی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے کچھ بولنے
 سے پہلے ہی اس نے پوچھا۔
 ”پڑھ لیا آپ نے؟“ میں نے کہا۔
 ”پڑھ تو لیا ہے لیکن اس میں کافی کچھ تشریح

”میں نے ان میں سب کچھ لکھ دیا ہے اگر آپ
 کے پاس وقت ہو تو پڑھ لیجئے گا۔“ لکھنے والے کے
 لیے بولنے سے زیادہ گھمنا آسان ہوتا ہے اس لیے
 اس نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ یا شاید میرے
 سامنے بیان کرنے میں جھجک محسوس کر رہا ہو۔ چونکہ
 نماز جمعہ کا وقت قریب تھا اس لیے میں نے تجویز پیش
 کی کہ پہلے نماز پڑھ لیتے ہیں پھر نسلی سے انہیں پڑھ
 بھی لیں گے اور ان پر گفتگو بھی کر لیں گے۔ وقت کافی
 ہوگا اس وقت تو ہمیں نماز کی وجہ سے ذرا جلدی کرنی
 ہوگی۔ ان کو تجویز پسند آئی اور ہم سب نماز کے لیے
 چلے گئے۔ میں تو اپنے معمول کے مطابق آفس سے
 نزدیک ہی زہری مسجد میں گیا اور دونوں پتہ نہیں کہاں
 گئے۔ نماز کے فوراً بعد ملاقات ٹھہری گی۔
 نماز میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ آفس واپس آیا تو
 ابھی منہاس صاحب اور مرسلین نہیں آئے تھے۔ سوچا
 ان کے آنے تک ان کے کاغذات ہی پڑھ لوں۔
 ابھی شروع ہی کیا تھا کہ وہ دونوں بھی آ گئے۔ مجھے



تک شادی نہیں کی۔ کوئی رشتہ گھروالوں کو پسند ہوتا ہے تو مجھے ناپسند کوئی مجھے پسند ہوتا ہے تو گھروالوں کو ناپسند۔ میری والدہ کو اس معاملے میں مجھ سے شکایت رہتی تھی وہ میرے متعلق فکر مند بھی بہت تھیں۔ ان کے خیال میں تو میری شادی کی عمر ہی نکلی جا رہی تھی۔ اب انہیں کون سمجھاتا کہ شادی کے معاملے میں مرد عمر سے زیادہ دل کے محتاج ہوتے ہیں۔ جب کوئی پسند آجائے یا کسی پر دل آجائے تو پھر عمر وغیرہ نہیں دیکھتے۔ ٹھوڑا بہت فرق ہو بھی تو نظر نہیں آتا یا دل خود ہی پورا کر لیتا ہے۔ پروین کی میرے ساتھ خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ اس سے بڑھ چلا کہ غفار خان اس کا حقیقی باپ نہیں تھا سو بیٹا تھا لیکن ماں حقیقی تھی۔ پروین کی والدہ کا تعلق سوات سے تھا۔ اس کی پہلی شادی اپنے خاندان میں ہی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد وہ شوہر کے ساتھ قطر چلی گئی۔ وہیں پروین اور اس کے دو چھوٹے بھائی پیدا ہوئے۔ قطر میں کافی عرصہ انہوں نے مانی آسودگی اور سکون و آرام سے گزارا۔ لیکن پھر کسی بیماری کی وجہ سے ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد مجبوراً اُن کی والدہ ان کو لے کر پاکستان واپس آ گئی۔ ان کا تعلق چونکہ غریب خاندان سے تھا اس لیے پاکستان آ کر انہیں اُن گنت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ غربت اور بیوگی ہی کچھ کم مصائب نہ تھے کہ اوپر سے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کے بوجھ نے تو پروین کی والدہ کی کمر توڑ دی۔ بچے چھوٹے تھے خود اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے سب کی نظر اس پر تھی۔ ہمدردی میں نہیں اس کی جوانی پر ایک تنہا جوان عورت کا زندہ رہنا ہمارے معاشرے میں بہت مشکل ہے۔ تنگ آ کر اس نے کسی مرد کے سہارے کی تلاش شروع کر دی۔ آخر غفار خان کی صورت میں اسے سہارا مل گیا۔ جس نے اس کے ساتھ شادی کر لی اور بچوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔

شروع شروع میں غفار خان کا رویہ ہمارے ساتھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ بدلتا گیا۔ جیسے جیسے والدہ بڑھا پے کی طرف اور میں جوانی کی

طلب ہے، اس میں دراصل جذبات زیادہ ہیں اور حقائق کم۔ میرے خیال میں بہتر ہوگا اگر یہ سب کچھ آپ خود سنائیں۔“
وہ خود بھی شاید یہی چاہتا تھا بھراس نکالنا چاہتا ہوگا۔

”یہ غفار خان ہے۔“ اس نے ایک تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ سندھ میں ہمارے کچھ عزیز رہتے ہیں ان کے ساتھ اس کی رشتہ داری ہے اس حوالے سے اس کا ہمارے ساتھ کچھ تعلق بنتا ہے۔ اس کی یہاں کونینڈ میں پوسٹنگ ہوئی تو یہ اسی حوالے سے مجھے ملنے آیا۔ اس کی یہاں ایک سرکاری منگے میں پوسٹنگ ہوئی تھی۔ رشتہ داری کا معاملہ تھا اس لیے ہم نے اس کی خوب خاطر تواضع کی۔ ہم پر خدا کا فضل ہے خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ غفار خان اس سے خاصا متاثر اور مرعوب ہوا۔ ہمارے پاس وہ ایک دن رہ کر واپس چلا گیا۔ تکلفاً ہم نے اسے دوبارہ آنے اور بچوں کو بھی ساتھ لانے کا کہا۔ اس نے یہ دعوت بخوشی قبول کر لی۔ کوئی ایک مہینے بعد وہ دوبارہ ہمارے گھر آیا۔ اس بار اس کے ساتھ اس کی بیٹی پروین اُس کی بیوی اور بیٹے بھی تھے۔ اس نے غفار کی بیٹی کی تصویر بھی دکھائی۔ مرسلین کے پاس ان لوگوں کی کافی تصویریں تھیں۔ دوسرے دن غفار خان یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ اسے تو ڈیوٹی پر جانا ہے البتہ بچوں کا چونکہ یہاں کافی دل لگ گیا ہے اس لیے وہ دو ایک دن مزید رہیں گے۔

بچوں کا دل ہمارے گھر میں کچھ ایسا لگا کہ وہ ایک دو دن کی بجائے پورا ایک ہفتہ رہے۔ ہم نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس دوران ان لوگوں کی ہم سے کافی بے تکلفی ہو گئی۔ گھر میں والدہ کے علاوہ ہم دو بھائی ہی موجود تھے میں اور چھوٹا بھائی نعیم۔ نعیم کی بیوی سیکے گئی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ہے تو چھوٹا لیکن اس کی شادی مجھ سے پہلے ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں اسے جلدی بھی پائیں ہی لیٹ ہو گیا تھا۔ اس کے تو ماشاء اللہ دو بچے بھی تھے۔ میری عمر اب 35 سال ہو گئی ہے۔ لیکن پسند و ناپسند کے چکر میں ابھی

کی ٹھہری۔ ان ہی کی درخواست پر ان کے گھر ہی میں بڑی خاموشی اور سادہ سی منگنی کی رسم ہوئی۔ لیکن ہم لوگوں کی تسلی نہ ہوئی اس لیے ہم نے اپنی طرف سے بڑی دھوم دھام کی تقریب منعقد کی۔ شہر کے بہت سے معززین کو تقریب میں مدعو کیا۔ منگنی کے بعد ہم لوگ خوشی خوشی شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ شادی بڑی دھوم دھام سے کرنے کا پروگرام تھا۔ میری والدہ شادی جلدی کرنا چاہتی تھیں لیکن پروین کے والدین جلدی شادی پر رضامند نہیں ہو رہے تھے۔ جب بھی ہم لوگ تاریخ لینے کے لیے جاتے یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ابھی ہم لوگ تیار نہیں۔ منگنی کے کچھ ماہ بعد غفار خان ہمارے گھر آیا اور اس نے مجھ سے ایک لاکھ روپیہ مانگا۔ اسے کسی کاروبار کے سلسلے میں رقم کی ضرورت تھی لیکن میں شادی سے پہلے اتنی رقم نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے میں نے معذرت کر لی۔ بس اسی دن سے ان لوگوں کا رویہ بدلنا شروع ہو گیا۔ ہم تاریخ کا تقاضا کرتے تو وہ لوگ کہہ دیتے کہ ابھی ہمارے پاس اتنی رقم نہیں کہ شادی کا بندوبست کر سکیں جو نئی رقم کا بندوبست ہو گیا شادی کی تاریخ دے دیں گے۔ لیکن ان کے رویے میں روکھا پن اور سرد مہری آتی گئی۔ پروین البتہ اسی طرح رہی۔ اس کی خط و کتابت بھی جاری رہی اور ملتی بھی رہی۔ یہ چیز میرے لیے ان کے بدلتے رویے کے باوجود تقویت کا باعث تھی۔ آخر ہمارے اصرار سے مجبور ہو کر انہوں نے شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ ہم لوگ بہت خوش ہوئے اور شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔

تمام تیاریاں مکمل کرنے کے بعد شادی کی تاریخ سے دو ایک دن پہلے کچھ معاملات طے کرنے کے لیے میری والدہ اور ہمیشہ غفار خان کے گھر گئیں۔ وہاں تو جیسے ایک طوفان ان کا منتظر تھا۔ غفار خان اور اس کی بیوی نے نہ صرف میری والدہ اور ہمیشہ کے ساتھ بدتمیزی کی بلکہ منگنی کے وقت دیا گیا سامان بھی واپس کر کے شادی سے انکار کر دیا۔ مجھے خبر ملی تو میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ساری تیاریاں مکمل تھیں لوگوں کو دعوت وغیرہ بھی دے دی گئی تھی۔ منگنی ٹوٹنا کوئی معمولی بات

طرف بدستے گئے ہم لوگ اس کے لیے بوجھ بنتے گئے۔ اب تو وہ روایتی سویتلا باپ بن گیا۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ، کچھ بولو تو مار پیٹ، امی کے ساتھ ہر وقت کی صحیح اور لڑائی اس کا معمول ہو گیا ہے۔ دیگر ضروریات پوری کرنا تو دور کی بات ہے وہ تو روزمرہ کی ضروریات کھانا پینا، کپڑے اور تعلیم کے اخراجات تک پورے نہیں کرتا۔ کچھ مانگو تو اُلٹی سیدھی سنا تا ہے۔ والدہ کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔ سب کچھ برداشت کرتی ہیں اس لیے بے سہارا ہیں۔ غفار خان کی صورت میں کم از کم مرد کا سہارا اور حفاظت تو میسر ہے۔ امی خاص طور پر میری وجہ سے پریشان رہتی ہیں اس لیے کہ جوان لڑکی کسی مرد کی حفاظت کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔

پروین کی داستان سے میں بہت متاثر ہوا۔ میں نے ان لوگوں کی مدد کا فیصلہ کیا۔ پروین خوش شکل اور جوان تھی جبکہ مجھے مناسب رشتے کی تلاش تھی۔ مجھے وہ پسند آئی اور میں نے اُسے دلہن بنا کر گھر لانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس سلسلے میں جلدی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا تاکہ ان کے متعلق تسلی کر لوں۔ ان کے واپس جانے کے کوئی دو ہفتے بعد میں ان کے گھر گیا۔ بہت اچھی طرح ملے۔ خوب خاطر تواضع کی۔ پھر ان کے گھر آ جانا میرا معمول بن گیا۔ پروین کے ساتھ میرا تعلق اور دوستی آہستہ آہستہ محبت کی صورت اختیار کر گئے۔ اس کے گھر والوں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ اس کی والدہ تو بہت خوش تھیں۔ وہ میرے ساتھ اہل سیرت و تقویٰ اور شائیکہ وغیرہ کے لیے جاتی۔ خوب فوٹو گرافی وغیرہ بھی ہوتی۔ اس نے بہت سی تصویریں بھی دکھائیں۔ ہماری خط و کتابت بھی رہی۔ خطوط کا بھی اس کے پاس پورا پلندہ تھا۔ تعلقات اس حد تک بڑھ گئے کہ آخر میں نے والدہ سے ان کے ہاں جا کر رشتے کی بات کرنے کا کہہ دیا۔ والدہ تو شاید اسی دن کی منتظر تھیں فوراً رضامند ہو گئیں۔ میری والدہ اور ہمیشہ ان کے ہاں رشتے کے لیے گئیں۔ وہ لوگ تو شاید منتظر ہی تھے فوراً راضی ہو گئے۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد منگنی کی رسم ادا کرنے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ایڈفرس لنکس ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
 ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
 ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔
 اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



ہوں۔“ میں نے اس سے پوچھا۔
 ”کیا عدالت میں جانے سے آپ لوگوں کی بے
 عزتی نہیں ہوگی؟ آپ کے خاندان کا نام نہیں اچھلے
 گا؟“ وہ بولا۔
 ”یہ تو ہوگا..... بے عزتی بھی ہوگی..... خاندان کا
 نام بھی اچھلے گا لیکن پھر کریں کیا؟ یہی تو مسئلہ ہے۔“
 میں نے کہا۔

”کیوں نہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں کہ
 عدالت تک جانے کی ضرورت ہی نہ پڑے اس سے
 پہلے ہی کام ہو جائے۔ میرے خیال میں ایسا کرتے
 ہیں ایک درخواست غفار خان کے انچارج افسر کے
 نام لکھتے ہیں۔ جس میں سارا قصہ تفصیل سے لکھ دیتے
 ہیں۔ پھر یہ درخواست لے کر آپ خود اس افسر کے
 پاس جائیں۔ امید ہے یہ قصہ یہیں ختم ہو جائے گا
 ورنہ کوئی اور طریقہ دیکھیں گے۔“ دونوں کو میری تجویز
 پسند آئی۔ فیصلہ ہوا کہ اگلے دن مرسلین درخواست لکھ
 کر لائیں گے اور مجھے دکھانے کے بعد غفار خان کے
 انچارج کے پاس جائیں گے۔

دوسرے دن مرسلین صبح ہی میرے پاس پہنچ
 گئے۔ میں نے درخواست پڑھی ٹھیک ٹھاک لکھی ہوئی
 تھی۔ میرے آفس سے ہی مرسلین غفار خان کے افسر
 کو ملے چلا گیا۔ ٹھیک اندازہ نہیں لگ سکتا تھا کہ اسے
 وہاں کتنا وقت لگے گا اس لیے اگلا دن ملاقات کا طے
 ہوا۔ اگلے دن وہ آیا تو پہلے سے بھی پریشان تھا۔
 پوچھنے پر اس نے بتایا کہ درخواست لے کر میں وہاں
 گیا تو پہلے مجھے ان کے اسٹاف افسر کے پاس لے جایا
 گیا۔ انہوں نے درخواست لے لی۔ درخواست اور
 سارا قصہ پڑھا اور پھر میری خوب بے عزتی کی یہ کہہ
 کر کہ تم ہمارے ایک ملازم کو بدنام کرتے پھر رہے ہو
 اور اس کی بیٹی کی تصویریں لوگوں کو دکھاتے پھر رہے
 ہو۔ اگر تم دوبارہ نظر آئے تو ہم تمہیں پولیس کے
 حوالے کر دیں گے۔ اس پر میں جب چاہ چاہ وہاں سے
 واپس چلا آیا۔ میں نے مرسلین کو سمجھایا کہ یہ تمہیں
 ڈرانے اور دباؤ ڈالنے کا طریقہ ہے تاکہ ڈر کر ان کا
 پیچھا چھوڑ دو۔ تم ایسا کرو کہ دو ایک دن انتظار کرو۔

تو نہیں تھی۔ ہمارا تو قبائلی سسٹم ہے یہاں تو سنگتیاں
 ٹوٹنے پر جانیں چلی جاتی ہیں۔ پھر کوئی چوری جیسے کی
 بات تو بھی نہیں سارے شہر کو پتہ تھا اس لیے عزت
 خاک میں مل جاتی تھی۔ ان سے فون پر بات کرنے کی
 کوشش کی لیکن وہ لوگ اتنے پھرے ہوئے تھے کہ
 بات تک کرنے کے روادار نہ تھے۔ پروین کو خط لکھا تو
 جواب ملا کہ تمہاری والدہ نے میرے والدین کی اتنی
 بے عزتی کی ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میری والدہ
 اور ہمشیرہ کہتی ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری بہت بے
 عزتی کی، جبکہ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ آپ کی والدہ نے
 ہماری بہت بے عزتی کی۔ اب میری تو سمجھ میں نہیں
 آتا کہ کیا کروں۔ اپنا قصہ ختم کرنے سے پہلے مرسلین
 نے مجھے ایک خط دکھایا اور بتایا کہ یہ خط میں نے پروین
 کو لکھا ہے۔ میں نے اسے لکھا ہے کہ یہ میرا آخری خط
 بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارا سوتیلا باپ تو رشتہ توڑ رہا ہے لیکن
 تم بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔ اگر تم مجھے چاہتی ہو اور میرے
 ساتھ شادی کرنا چاہتی تو چپ چاپ گھر سے نکل کر
 میرے پاس آ جاؤ میں سب کچھ سنبھال لوں گا یا پھر خط یا
 فون کے ذریعے اپنی خواہش بتا دو میں خود آ کر تمہیں
 نکال لے جاؤں گا۔ قصہ ختم کر کے اس نے میری
 طرف بے بسی سے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”آپ کے خیال میں غفار خان ایسا کیوں کر رہا
 ہے۔ اور یہ وہ اکیلا ہی کر رہا ہے یا پروین اور اس کی
 والدہ بھی اس میں اس کے ساتھ شامل ہیں؟“ وہ
 بولا۔

”یا تو وہ سوتیلہ ہونے کی وجہ سے سوتیلی بیٹی کی
 قیمت وصول کرنا چاہتا ہے کیا پتہ یہ دہندہ ہی کرنا چاہتا
 ہو یا پھر سوتیلی بیٹی کو خوں اور لیتے نہیں دیکھنا چاہتا
 اور اس طرح اس کی خوشیوں اور آرزوؤں کا خون کرنا
 چاہتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔
 ”اب کیا کرنا چاہتے ہو؟“ وہ بولا۔

”کرنا کیا ہے جی..... اس نے ہماری اتنی بے
 عزتی کی ہے کہ میں تو اسے عدالت میں لے جاؤں
 گا۔ اگر ممکن ہو تو شاید ملٹری کورٹ میں بھی لے
 جاؤں۔ یہی مشورہ کرنے تو آپ کے پاس آیا

ہو گئے۔ جب غفار خان نے مرسلین کو بات چیت کے لیے اے گھر لایا۔

مرسلین اور منہاس دونوں ان کے گھر گئے۔ خوب خاطر مدارات ہوئیں۔ کافی لمبے چوڑے مذاکرات ہوئے۔ پہلی شرط تو یہی رکھی گئی کہ مرسلین والدہ کو چھوڑ دے لیکن یہ انہوں نے نہیں مانی۔ پھر اس بات کی گارنٹی مانگی گئی کہ اس جھگڑے کا انتقام پروین سے نہیں لیا جائے گا اور اسے تنگ نہیں کیا جائے گا۔ بات معقول بھی اس لیے منہاس صاحب نے ان کی تسلی کرادی۔ آخر معاملات طے ہو گئے اور وہ لوگ شادی پر رضامند ہو گئے۔ باقاعدہ تاریخ مقرر کرنے کی رسم بعد پر چھوڑ دی گئی۔

اب جبکہ معاملات طے ہو گئے تھے اور مرسلین اور پروین کی شادی ہو رہی تھی میرا خیال تھا کہ مرسلین خوش ہوگا لیکن اگلی ملاقات پر پھر اسے اُداس اور مہمچایا ہوا پایا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

مجھے اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے لیکن چہرے سے نہیں لگ رہا کیا بات ہے؟“ وہ بولا۔

”خوشی کیسی جی..... یہ ٹھیک ہے کہ ہم لوگ بے عزتی اور بدنامی سے بچ گئے ہیں لیکن ان سے اب وہ پہلے والے تعلقات کہاں ہو سکتے ہیں۔ وہی پروین جس سے کبھی مجھے محبت ہی اور جس سے کبھی ملنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا اب مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔ اب تو یہ شادی اور تعلقات ہماری مجبوری ہے اس لیے گزارہ کرنا ہوگا۔ ورنہ خوشی اور محبت تو اب اس سلسلے میں ذرا بھی نہیں رہ سکیں۔“ مرسلین کی باتیں سنیں اور اس کی حالت دیکھی تو فریاد کا شعر یاد آ گیا۔

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مرام کے لیے
اب یہی ترک تعلق کے بہانے مانگتے

میرے خیال میں وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ان کی شادی اب جسموں کا ملاپ ہو تو ہودلوں کا ملاپ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ محبت کا کچا کھڑا تو غفار خان کا چناب لے گیا تھا۔

☆☆.....☆☆

اس کے بعد دوبارہ ان کے آفس جاؤ۔ لیکن اس دفعہ کسی اسٹاف افسر سے مت ملنا بلکہ آفسر انچارج سے ملنے پر اصرار کرنا۔ یہ بھی بتا دینا کہ دو تین دن پہلے میں نے درخواست دی تھی اسی کے متعلق چیک کرنے آیا ہوں۔ دو دن بعد یہ ان کے آفس گئے تو وہاں حالات ہی بدلے ہوئے پائے۔ انہیں دیکھ کر وہ لوگ کافی پریشان ہوئے۔ ان کے ارادے معلوم ہوتے ہی وہ اسٹاف افسر صاحب تو وہاں سے کھٹک گئے۔ لگتا ہے ان دونوں میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ پھر ایک صاحب آئے انہوں نے بتایا کہ آفسر انچارج آج موجود نہیں ہیں اگر آپ کل آجائیں تو ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ کل دوبارہ آنے کا کہہ کر وہاں سے واپس آ گئے۔ لیکن آفس سے نکل کر تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ غفار خان اور اس کی بیوی نے ان کو جالیا۔ وہ شاید کہیں ان کے منتظر تھے۔ ملنے ہی ان سے کہنے لگے۔

”ہمارے ساتھ گھر چلیں آپ سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔“ لیکن مرسلین نے ان کے گھر جانے سے انکار کر دیا اس لیے کہ پہلے وہ بات چیت سے انکار کر چکے تھے۔ اس پر انہوں نے وہیں بات چیت شروع کر دی۔

”پہلی شکایت انہوں نے یہ کی کہ آفس میں درخواست دے کر تم نے ہمیں بہت بدنام کر دیا ہے۔“ اس پر مرسلین نے جواب دیا۔

”ممنگنی تو ذکر کر آپ لوگوں نے ہماری بدنامی میں کیا کسر چھوڑی ہے۔“ پھر کہنے لگے تمہاری والدہ اور ہمشیرہ نے ہماری بہت بے عزتی کی ہے اگر تم ان کو چھوڑ دو تو ہم پروین کی شادی تم سے کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن مرسلین نے والدہ اور ہمشیرہ کو چھوڑنے سے انکار کر دیا اور وہاں سے چلا آیا۔ رات کو اسے پروین کا فون آیا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ اگر والدہ کو چھوڑ دو تو ہماری شادی ہو سکتی ہے کیونکہ میرے والدین تمہاری والدہ کے سخت خلاف ہیں۔ لیکن مرسلین نے پھر انکار کر دیا۔ اس پر پروین نے کہا کہ اب تم اگر آسمان سے تارے بھی توڑنا دو تو میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ لیکن تارے دوسرے ہی دن ٹوٹنے شروع

دوسری چشم کھانا کھانی کھڑی سے

بہرے پر اٹھو

عزم کی اللہ کے خیال

کسی خیال کی خوشبو، کسی بدن کی مہک
درِ قفس پر کھڑی ہے صبا پیام لیے

روشن آراء اسماء

لگیں تھیں۔

”نیرو میری بچی میں سجاد سے بات کروں گی۔“
امی انہیں تسلی دے رہی تھیں۔

”نہیں امی مجھے اب کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“
”دیکھو بیٹا ہم ابھی زندہ ہیں تمہیں پریشان
ہونے کی ضرورت نہیں۔“

ابو کی آواز آئی تھی۔

”امی یہ سب یکطرفہ نہیں ہے، اُس ثنا کی بچی کو
دیکھیں ناسجاد کی ہر بات پر کیسے اُن کی پذیرائی کرتی
ہے ضد کر کر کے اپنی بات منوانی ہے، اُس دن وہ آئے
تھے تو جلدی سے جا کر تیار ہوئی اور پھر اُن کے سامنے
آئی۔“ ہما کے مبر کا پیانا لبریز ہو چکا تھا۔

”ابھی مرے اُس کے ماں باپ روڈ ایکسیڈنٹ
میں اور یہ بلا ہمارے سر آگئی۔“ امی نے جملے کٹے لہجے
میں کہا تھا۔

”ایسے نہیں کہو صالحہ بیگم، وہ میرے مرحوم بھائی
بھائی کی اولاد ہے، اُن کے بعد اُس کی ذمہ داری
ہماری ہی ہے صرف تین دن کی تھی وہ جب یہ حادثہ ہوا
اور وہ ہمارے گھر آئی اور یہ تم ہی تھیں نا جس نے
اُسے گود میں لیتے ہی کہا تھا کہ یہ ہماری چوتھی بیٹی

اُس کی آنکھ سوتے میں اچانک کھل گئی تھی، حلق
جیسے پیاس سے سوکھ رہا تھا، ٹیبل پر پانی کا جگ نہیں تھا
اور نہ ہی کوئی پانی کی بوتل، کچھ دیر نسلندی سے لیٹ
کر وہ اٹھ گئی۔ کچن میں جا کر پانی پینے کے لیے لاؤنج
سے گزرتا پڑتا تھا، وہ لاؤنج تک پہنچی تھی کہ امی ابو کے
کمرے کی لائٹ چلتے دیکھ کر ٹھک گئی۔ وال کلاک پر
نظر ڈالی رات کے ڈھائی بجے تھے۔ (اتنی رات تک
امی ابو کے کمرے کی لائٹ کیوں جل رہی ہے
خدا نخواستہ کہیں کسی کی طبیعت تو خراب نہیں) سوچتے
ہی وہ اپنی پیاس بھول کر اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھی،
لیکن باہر آئی آوازوں نے اُسے زکے پر مجبور کر دیا۔
وہ دبے قدموں چلتی دروازے کے پاس کان لگا کر
کھڑی ہوگئی، اپنے نام کی بازگشت نے اُسے چونکا
دیا۔

”امی یہ ثناء کہنے کو میری بہن ہے، لیکن یہ میرا گھر
بر باد کرنے پر تلی ہے۔“ یہ ہما باجی کی آواز تھی۔

”مجھے تو سجاد پر سخت غصہ آتا ہے ہر وقت ثنا ثنا
کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ابھی برسوں کہہ رہے
تھے کہ جب رشتے کے لیے آئے تھے تو ثناء کو اگر دیکھ
لیتے تو میرے لیے کبھی ہاں نہیں کرتے۔“ وہ رونے

ہے۔“ ابو نے جیسے انہیں یاد دلایا۔

”ہاں..... ہاں مجھے سب یاد ہے اور میں نے کب اُسے پرایا سمجھا اپنی اولاد کی طرح ہی بالآخر کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی، لیکن یہ..... یہ لڑکی اپنی ہی بہن کے گھر پر ڈاکر ڈال رہی ہے تو میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔“ بڑا جتنی انداز تھا اُن کا۔

”دھیرج رھیں صالحہ بیگم شام ہماری سگی اولاد نہیں تو کیا ہوا“ تربیت تو ہمازی ہی ہے تا اُس کی ہم اُس سے بات کریں گے، ابھی آپ اتنا غصہ نہیں کریں اور ہا بیٹا تم بھی حوصلہ رکھو اللہ سب بہتر کرے گا، رات بہت ہو چکی ہے میرا خیال ہے اب بیٹا تم بھی کمرے میں جاؤ اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر سو جاؤ وہ بہتر کرے گا۔“ ابو کی آواز آتے ہی وہ جلدی سے بچن کی سمت بڑھ گئی مبادا کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔

دبے پاؤں جب وہ کمرے میں آئی تو ہمارے کے پیڈ پر لیٹ چکی تھی، وہ بھی برابر میں کروٹ لے کے

لیٹ گئی اور زبردستی آنکھیں موند لیں۔

ہمارے ریمیا، صائمین بیٹیاں تھیں عبداللہ صاحب اور صالحہ بیگم کی، ثنا ان کی چچا زاد بھی جو محض تین دن کی تھی جب ایک ایکسڈنٹ میں والدین کے گزر جانے کے بعد تاپاتاائی کے در پر آ گئی تھی۔ لیکن انہوں نے اُس کی پرورش اپنی بیٹیوں کی طرح ہی کی تھی، بھی اُسے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ اس کے والدین نہیں۔

ہا کی شادی چھ سال قبل ابو کے دوست کے بیٹے سجاد سے ہوئی تھی۔ سجاد دیکھنے میں بہت خوب رو تھا، ایک مقامی بینک میں منیجر تھا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ جب سجاد رشتے کے لیے اپنے والدین کے ہمراہ اُن کے گھر آیا تو اس دن ثنا اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہوئی تھی۔ سانو لی سی چیلنے نین نقش والی ہا سجاد کے ساتھ اس کے والدین کو بھی بہت پسند آئی اور یوں یہ رشتہ طے ہو گیا، لیکن اس کے بعد شادی کی تمام رسومات میں جب سجاد نے ثنا کو دیکھا تو جیسے اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ سرخ و



”ان سب کی کیا ضرورت تھی؟“ ہا جیسے جل ہی گئی تھی۔

”وہ ثنا کا دل تھا نا کھانے کو تو اسی لیے۔“ یہ کہتے ہوئے سجاد نے بڑی سرشار نظروں سے ثنا کو دیکھا تھا۔ جو خوش دلی سے ہنس دی تھی۔

”آپ بہت اچھے ہیں سجاد بھائی۔“ شاپر اس نے سجاد کے ہاتھوں سے لے لیے تھے اور شاپر لیتے ہوئے سجاد کے ہاتھ اُس کے ہاتھوں کو مس کر رہے تھے۔ شام کے انداز میں لاہر واپس تھی اور ہما کا دل آنے والے خطرات کی بوسونگ رہا تھا۔ اور پھر ایسا بہت بار ہوا سجاد کا بارے میں بہت حساس تھا۔ ہر وقت ثنا ثنا کی گردان سے ہاتھ لگتی تھی۔

”آپ کی شادی مجھ سے ہونی ہے شام سے نہیں۔“ اُس رات ہما نے سجاد سے کہا تو لہجہ بہت شکایتی تھا۔

”ہاں! یہی تو تم ہے تم لوگوں نے اس دن جاں بوجھ کر ثنا کو چھپا دیا تھا۔ ورنہ میرا انتخاب تم نہیں ہوئی۔“ ہما بھی کہ شاید سجاد مذاق کر رہا ہے لیکن جب اس کے چہرے پر نظر پڑی تو آنکھوں میں چھپی سچائی دیکھ کر وہ لرزئی پھر خود پر قابو پا کر ہنس دی۔

”آپ مذاق بہت اچھا کرتے ہیں۔“ اُس نے بات کو نالنا چاہا۔

”مذاق..... ہا ہا.....“ وہ ہنسنے لگا تھا۔

”مذاق تو تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا ہے۔“ ”کیا بگو اس ہے سجاد مجھے بھی آپ نے پسند کیا تھا، اس کے بعد ہی ہاں کی تھی۔“ ہما کو غصہ آنے لگا تھا۔

”ہاں! تو میں نے کب اس بات سے انکار کیا ہے، لیکن اب مجھے لگتا ہے میرا فیصلہ شاید جلد بازی کا نتیجہ تھا، مجھے کچھ دن انتظار کرنا چاہیے تھا۔“ سجاد کے لہجے میں جیسے پچھتاوے کو اُس نے محسوس کر لیا تھا وہ کروٹ لے کر سیڑھا تھا یا پتہ نہیں جاگ رہا تھا، لیکن ہما کی نیند اڑ چکی تھی۔ اور پھر دوسرے دن بہت سوچ کر اس نے امی ابو کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

اگلے دن شام کو بینک سے واپس پر سجاد اُسے لینے آیا تو خلاف توقع کسی نے بھی خوش دلی سے اس کا

سفید گڑ یا جیسی شاپر رسم میں اس کی مرکز نگاہ تھی، یہ جان کر تو اُسے بہت ہی دکھ ہوا تھا کہ وہ ہما کی چھوٹی بہن ہے۔

جس دن میں پہلی بار تمہارے گھر آیا تھا، اُس دن ثنا کہاں تھی۔ شادی کے صرف ایک ہفتے بعد اُس نے ہما سے پوچھا تو وہ حیران رہ گئی۔

”کیوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے آپ تو مجھے دیکھنے آئے تھے نا؟“

”ہاں! لیکن اگر..... چلو خیر کچھ نہیں۔“ سجاد جب ہو گیا۔ مگر ہما کے دل میں جیسے کوئی بات کھٹک گئی تھی اور اس کے بعد کتنی ہی مرتبہ اس نے سجاد کا شکا لے لیے والہانہ پن دیکھا اور ثنا پتہ نہیں کس نظریے سے اسے دیکھتی تھی، جو اس کے آتے ہی پھول کی طرح کھل جاتی۔

”سجاد بھائی! یہ سجاد بھائی وہ.....“ اس کی فرمائشیں ختم نہیں ہوتی تھیں اور وہ پوری کرتے نہیں تھکتا تھا۔ ہما اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ اُسے یاد آیا کہ ابھی کچھ دن پہلے اُس کا اُس کریم کھانے کا دل چاہا اور سجاد سے جب کہا تو اس نے تھکاوٹ کا بہانہ کر کے نال دیا تھا، اور وہ دل موسوس کر رہ گئی تھی اور شام کے تو بس منہ سے بات نکلتی اور وہ بوتل کے جن کی طرح پوری کر دیتا تھا۔

اُس دن وہ امی کے گھر آئی تو اُس نے شام کو بچن میں کام کرتے دیکھا، وہ رات کے کھانے کی تیاری میں رہا اور صبا کی مدد کر رہی تھی، پیچھے پیچھے سجاد بھی وہیں آ گیا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ وہ پوچھ تو سب سے ہی رہا تھا لیکن نظروں سے شاپر نہیں جو سرخ سوٹ میں اُس کے دل میں اتر رہی تھی۔

”ویسے تو بچن کڑا ہی اور بریانی بن رہی ہے، لیکن میرا دل تو بردست کھانے کو چاہ رہا ہے۔“ ثنائے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”میں ابھی آیا۔“ سجاد لٹے قدموں پلٹ گیا تھا اور نصف گھنٹے بعد جب واپس آیا تو شاپر میں بردست تھا، اس کے علاوہ اُس کریم بھی تھی۔

ہو گئیں ان کے استفسار پر ہانے سب کچھ بتا دیا تھا۔
 ”کہیں ایسا تو نہیں کہ شانے ہی اُسے اپنے پکر
 میں لے رکھا ہو ورنہ اُس کی اتنی جرأت تو نہیں
 ہو سکتی۔“ امی کا غصے کے مارے برا حال تھا۔

”آنے دو شا کو میں پوچھتی ہوں اُس سے۔“ اور
 پھر یہی ہوا کہ شانے کے آتے ہی امی نے اُسے اپنے
 کمرے میں طلب کر لیا تھا، ابو اور ہما بھی موجود تھے۔
 شانہ امی کے تپوڑ دیکھ کر گھبرا گئی تھی، اُس رات ہونے
 والی گفتگو کے بعد امی کا موڈ اُس سے خراب ہی رہتا
 تھا اور چاہنے کے باوجود وہ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ
 سکتی تھی، اور اس وقت سب کا خراب موڈ دیکھ کر وہ سمجھ
 گئی تھی کہ معاملہ کیا ہے۔

”شاخ بتاؤ کہ تم ہم سب کو کیا سمجھتی ہو؟“ بات
 ہانے شروع کی تھی۔ امی ابو منتظر نظروں سے اُسے
 دیکھ رہے تھے۔

”یہ کیا سوال ہے ہما، آپنی ظاہر ہے یہ میرے امی
 ابو ہیں اور آپ میری آپنی۔“
 ”پھر یہ سب کیا ہے شا؟ سجاد کے ساتھ تم کون سا
 کھیل کھیل رہی ہو، تم اپنی ہی بہن کا گھر برا دکھا رہی
 ہو۔“

امی کی قوت برداشت ختم ہو رہی تھی جس کا ثبوت
 ان کا بدلا ہوا لہجہ تھا۔
 ”شا کا بپ گئی تھی، پھر رونے لگی۔“

”امی ابو اور ہما آپنی میرا یقین کریں سجاد بھائی
 میرے لیے بھائی کی طرح ہیں، میں نے تو کبھی اُن
 کے لیے ایسے نہیں سوچا جس طرح آپ لوگ سمجھ رہے
 ہیں، اور مجھے مورد الزام قرار دے رہے ہیں۔“ وہ
 روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

ابو سمجھتے تھے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے، لیکن امی اور
 ہما کے آگے مجبور تھے، اس لیے تاسف بھری نظروں
 سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

پھر سجاد کا رو بہ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہے؟
 آخر صابو اور میرا بھی تو ہیں۔“ ہانے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ سجاد بھائی کا رو بہ کیسا ہے، میں
 تو صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ میرے بھائی کی طرح

استقبال نہیں کیا تھا۔
 ”کیا ہوا ہے؟ خیریت تو ہے؟“ اس نے ٹٹولنے
 والی نظروں سے ہما کو دیکھا۔ پھر اس کی نظریں جا کر
 امی کے چہرے پر پڑ گئیں۔
 ”کیا ہوا آئی؟“

”کچھ نہیں بیٹا، ذرا سر میں درد ہے۔“ انہوں
 نے بات بنائی اور ہما کو بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
 ”باقی سب کہاں ہیں؟“ سجاد نے متلاشی
 نظروں سے چاروں طرف دیکھا تھا۔ اُسے اپنے گوہر
 مقصود کی تلاش تھی۔

”صبا کی دوست کی برتھ ڈے پارٹی ہے، یہ سب
 وہیں گئی ہیں۔“ ہما کے جواب پر وہ خاموش ہو گیا۔
 ”گھر چلنے کا ارادہ ہے یا نہیں، ویسے میں کل دو
 ہفتوں کے لیے بینک کے کام سے ملائیشیا جا رہا ہوں،
 بہتر ہے کہ تم یہیں رہو۔“

”کیوں میں اپنے گھر میں نہیں رہ سکتی باقی سب
 تو ہیں نا وہاں۔“ ہانے غمی سے کہا۔

”میں تو تمہارے ہی لیے کہہ رہا ہوں، آگے
 تمہاری مرضی۔“ سجاد کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ اس کے
 خراب موڈ کو دیکھ کر ہانے جلدی سے کہا۔
 ”کیا شا بھی گئی ہے؟“ امی کے جانے کے بعد
 سجاد نے پوچھا۔

”اخواہ! کیا آپ ہر وقت شا ثنا کرتے رہتے ہیں
 میں امی کو بلاتی ہوں اب آپ ان سے ہی پوچھیے
 گا۔“ ہما کی کو آواز دینے والی گھی کے سجاد نے بڑی
 لجاجت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”انہیں کیوں پریشان کر رہی ہو، اچھا رہنے دو
 میں چلتا ہوں، اسلام آباد سے آؤں گا تو شا کو جی بھر
 کے دیکھوں گا اور.....!“
 ”اور کیا؟“ ہما ڈر گئی تھی۔ سجاد ہنسنے لگا۔

”اور کیا ہے تو سر پرانز ہے، تمہیں بعد میں بتاؤں
 گا۔“ وہ خاموشی سے اُسے دیکھنے لگی تھی۔ اُس کے
 جانے کے بعد بھی وہ اسی طرح سے بیٹھی رہی اور پھر
 رونے لگی تھی، امی تو اُسے روتے دیکھ کر پریشان

پر کوئی اعتراض نہیں تھا سو یہ رشتہ قبولیت کے مراحل طے کر گیا۔ اس کے بعد فوراً ہی انہوں نے شادی کی تاریخ بھی طے کر دی وہ چاہتی تھیں کہ سجاد کے اسلام آباد سے آنے سے پہلے ثنا کا قصہ ختم ہو جائے اور انہوں نے ایسا ہی کیا، ثنا کی رخصتی کے بعد ہوا اور امی نے خاص طور پر سکون کی سانس لی تھی۔

”امی سجاد کو جب پتہ چلے گا تو کیا ہوگا۔“ ہا بڑے بڑے جوش انداز میں وہ ماں سے پوچھ رہی تھی۔
 ”ہوگا کیا منہ دیکھتا رہ جائے گا۔“ وہ ہنسنے لگی تھیں اور ہانے بھی اُن کا بھر پور ساتھ دیا تھا۔
 اگلی شام سجاد آ گیا، گھر کا ماحول دیکھ کر ٹھنک گیا، مہندی اور پھولوں کی خوشبو اور کہیں کہیں مسلے ہوئے پھولوں کی پتیوں دیکھ کر وہ اُلجھ گیا۔

”کیا ہوا کوئی تقریب تھی کیا گھر میں؟“ چاروں طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ ہما کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہاں بیٹا! بہت جلدی میں تقریب ہوئی تھی، افسوس کہ تمہارا انتظار بھی نہیں کر سکے، دراصل ان لوگوں کو جلدی بہت تھی اور اتنا اچھا رشتہ میں ہاتھ سے نکال نہیں سکتی تھی۔“

امی کی مبہم گفتگو نے سجاد کو الجھا دیا، پھر اس نے نظر دوڑائی ریما اور صاحبہ جو حدیں اور ثنا! اُس کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

”کک..... کیا مطلب آئی؟“

”مطلب یہ بیٹا کہ تین روز پہلے ثنا کی شادی تھی۔ کل رات ولیمہ بھی ہو گیا۔ بہت اچھا رشتہ تھا، ثنا کو انہوں نے بہت پسند کیا اور شادی کے لیے جلدی کی تو ہمیں بھی کہا اعتراض تھا کر دی۔“

”لیکن! لیکن آپ لوگوں نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔“ بہت ٹوٹا ہوا لہجہ تھا سجاد کا۔

”بھئی ہم نے سوچا آپ کو سر پرانز دیں گے۔ کیسا رہا ہمارا سر پرانز؟“ ہمانے ہنستے ہوئے کہا تھا اور بے چارے سجاد کا منہ کھلا کھلا رہ گیا تھا۔

☆☆.....☆☆

ہیں۔“ زندہ گلے سے وہ کہہ رہی تھی۔
 ”اچھا تو پھر ٹھیک ہے، ہمیں تمہارا یقین ہے لیکن سجاد کے دل میں کیا ہے اسے ختم کرنے کے لیے تمہیں ہماری ایک بات ماننا ہوگی۔“ امی بڑے سوچ انداز میں کہہ رہی تھیں۔
 ”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں صالحہ بیگم۔“ ابو نے غور سے انہیں دیکھا۔

”ہماری چار بیٹیاں ہیں، ایک کی شادی ہم کر چکے ہیں۔ تین کی ہمیں کرنی ہے، ثنا سب سے چھوٹی ہے لیکن ضروری نہیں کہ پہلے ریما اور صاحبہ کی شادی ہو اس کے بعد ثنا کی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“ امی نے جس طرح کہا تھا اُس نے ثنا سمیت سب کو چونکا دیا تھا۔

”مطلب کیا ہے آپ کا؟“

”میرا مطلب واضح ہے، میں ثنا کی شادی کر رہی ہوں اپنی دوست کے بیٹے جواد کے ساتھ وہ پہلے بھی ثنا کے لیے کہہ چکی ہیں، پہلے میں نے منع کر دیا تھا، لیکن اب میں سوچ رہی ہوں کہ دیر نہیں کرنی چاہیے اور اللہ کا شکر ہے کہ جوادی ابھی تک شادی نہیں ہوئی ہے، ثنا تمہیں اعتراض تو نہیں دیکھو بیٹا، ہمیں تمہاری شادی تو کرنی ہی ہے ابھی کریں یا کچھ عرصے بعد اس سے کیا فرق پڑتا ہے، میں کل ہی رضیہ کو فون کر کے انہیں شام کو ہی گھر بلا رہی ہوں شکر ہے کہ سجاد اسلام آباد گیا ہے اس کے آنے سے پہلے ثنا اپنے گھر کی ہو جائے گی اور ہماری ہما کا گھر بھی آباد رہے گا۔“

امی کا انداز تھی تھا، لیکن ان کی بات نے ہما کے چہرے پر اطمینان بکھیر دیا تھا، ابوالبتہ خاموش ہو گئے تھے، وہ اپنی جلدی اس بات کے حق میں نہیں تھے لیکن ہما کی شادی کو بچانا بھی ضروری تھا، اور وہ جس کے متعلق اُس سے پوچھے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر دیا گیا تھا، وہ کچھ کرنے یا کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی، سو اُن کے فیصلے کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اگلے دن شام کو امی کی دوست رضیہ آئی اپنے بیٹے جواد اور دوسرے فیملی ممبرز کے ساتھ ان کے گھر آئیں۔ ثنا انہیں پہلے ہی پسند بھی، جواد کو بھی اس رشتے

تیری جہنم کتا کہانی چچی ملیاں سے

ڈسٹرٹ ہسٹری

سچی کھاں

اک درد میرے دل میں اڑتا رہا غبار
لمبوں خواب ہوتا رہا مجھ میں تار تار

رانا زاہد حسین

جب اُس کی ماں نے اُس کے ہاتھوں میں دم دیا تو صابر نے ایک دلدوز جھنجھاری جو اُس کے گھر کے درود پورا کر بلا گئی۔ صابر کی ماں کا ساکت جسم اُس کے ہاتھوں میں تھا۔ پانی کا گلاس اُس کے ہاتھوں سے گر کر فرش پر کرچی کرچی ہو گیا اور پانی فرش پر پھیل گیا۔

صابر ابھی سات سال کا ہی تھا۔ جب اُس کا باپ فوت ہوا تھا تو اُس کی عمر صرف ایک سال تھی صابر کی ماں نے باپ کے بغیر صابر کی پرورش بڑی مشکل سے کی تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھی۔ آج دل نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور دھڑکننا بند کر دیا تھا۔ صابر کی دنیا اجڑ چکی تھی، کروڑوں کی آبادی میں اُس کا اِس دنیا میں کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ ایک ماموں تھا جو شہر میں رہتا تھا۔ صابر کا ماموں اکرام کافی خوشحال تھا۔ اکرام کی شادی ایک امیر کبیر گھرانے کی لڑکی رخشندہ سے ہوئی تھی۔ رخشندہ نے اُس سے صرف اِس شرط پر شادی کی تھی کہ وہ گھر داماد بن کر رہے گا۔ اِس

ماں جی ماں جی کیا ہوا ہے آپ کو وہ دروازے سے ہی چینا۔

صابر اسکول سے واپس آیا تو اُس کی نظر اپنی ماں پر پڑھی۔ جو برآمدے میں پڑی چار پائی پر لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اُس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ صابر نے بستہ کندھے سے نیچے پھینکا دوڑ کر اپنی ماں کو گود میں لے لیا۔ صابر سات سال کا بچہ تھا اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔ وہ دوڑ کر جگ میں سے پانی گلاس میں ڈالنے لگا تو اُس کی ماں زور زور سے کھانسنے لگی۔ صابر نے پانی کا گلاس ماں کے لمبوں سے لگا دیا۔ صابر کی جنت اُس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اپنی جنت کے لمبوں سے پانی کا گلاس لگائے بیٹھا تھا لیکن پانی اندر جانے کی بجائے باہر آ رہا تھا۔ اُس کی جنت اُس کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی۔ صابر کے اِنسو گلاس میں گر رہے تھے۔ لیکن وہ بے بس تھا مجبور تھا۔ اُس کی ماں کا وقت آ گیا تھا۔

ماموں نے منمننا کر جواب دیا۔
ٹھیک ہے رکھو اپنے ساتھ مگر میری بیٹی کے
آس پاس بھی یہ غریب اور جاہل لڑکا نظر نہ آئے
وہ نخوت سے منہ بسورنی کمرے سے باہر چلی گئی۔
یہ صابر کی اس گھر میں پہلی رات تھی۔
”آؤ صابر میں تم کو اپنے کھلونے دکھاؤں۔“
تابندہ نے صابر کو بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں
لے جانا چاہا۔
”کوئی ضرورت نہیں کھلونے دکھانے کی۔“
رخشندہ نے بڑی حقارت سے صابر کا ہاتھ تابندہ

لپے اُسے گاؤں چھوڑ کر شہر رہنا پڑا تھا۔ اکرام
رخشندہ سے دب کر ہی رہتا تھا۔ صابر کی ماں کو
منوں مٹی میں دفن کر کے صابر کا ماموں اُسے شہر
لے گیا۔ صابر کی ممانی رخشندہ نے صابر کو دیکھ کر
ناک بھوں چڑھائی لیکن رخشندہ کی بیٹی تابندہ
صابر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔
اس مصیبت کو تم یہاں کیوں لے آئے۔
رخشندہ نے غصے سے پھنکارتے ہوئے پوچھا۔
رخشندہ اسے کس کے سہارے چھوڑ کر آتا
اب ماں کے بعد میں ہی اس کا سہارا ہوں۔ اکرام



بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگ کر جاتا کہاں وہ تو چڑیا کے بچے کی مانند تھا جس کے ابھی پر بھی نہیں نکلے تھے۔ وہ اڑ نہیں سکتا تھا۔ اُس میں طاقت پرواز نہیں تھی۔ اس لیے اب اُسے اسی گھر میں رہنا تھا اپنی ممانی کی کڑوی کیسی باتیں سننی تھیں۔ لوری دینے والی ماں تو اب اس دنیا میں رہی نہیں تھی۔ بیٹھی لوری کی بجائے اب ممانی کی کڑوی باتیں اُس کا مقدر تھیں۔

اُس کی تقدیر میں شاید یہی لکھا تھا کہ باقی کی زندگی اُس نے ممانی کے رحم و کرم پر گزارنی ہے۔ کہتے ہیں تقدیریں بدلتی ہیں دعاؤں کے اثر سے، لیکن صابر کے چھپے دعائیں کرنے والی ماں نہیں تھی۔ اب کون تھا جو اُس کے لیے دعائیں کرے گا۔ رخشندہ اِس لیے صابر سے حتیٰ سے پیش آتی تھی کہ کہیں اُس کی نرمی کو دیکھ کر اکرام تابندہ اور صابر کی شادی کا نہ سوچنے لگے۔

رشندہ تابندہ کی شادی کسی امیر گھرانے میں کرنا چاہتی تھی جن کا لیونگ اسٹینڈرڈ اس کے برابر کا ہو۔ رخشندہ نے صابر کو اپنے گھر رہنے کی اجازت تو دے دی لیکن صابر کی اِس گھر میں حیثیت اکرام کے بھانجے کی نہیں صرف ایک نوکر کی تھی۔

رشندہ تابندہ کو لے کر بازار گئی صابر کو بھی وہ ساتھ لے گئی تابندہ کو اُس نے دو تین بہت مہنگے ریڈی میڈ کپڑے خرید کر دیے جب وہ ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان سے باہر نکلی دکان کے باہر ایک ریڈمی والا بچوں کے کپڑے سجائے آوازیں گارہا تھا۔

”بچوں کا سوٹ سو سو روپے.....“ فرخندہ نے پرس سے دو سو روپے نکالے اور دو سوٹ صابر کو خرید کر دے دیے حالانکہ تابندہ کا ایک ایک

کے ہاتھ سے چھڑایا۔

اکرام رخشندہ کی یہ حرکت دیکھ کر تڑپ کر رہ گیا۔ صابر کو یوں لگا جیسے وہ شور اور ہوا تابندہ برہنہ خاندان کی بیٹی رخشندہ کا یہ روپ صابر کے لیے کوئی نیا نہیں تھا کیونکہ وہ جب بھی اپنے ماموں کے گھر آتا تھا اُس کی ممانی کا رویہ اسی طرح کا ہی ہوتا تھا۔ اسی لیے صابر بہت کم اپنے ماموں کے گھر آتا تھا۔ لیکن اب تو اُسے یہیں رہنا تھا گاؤں میں اُس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ شہر میں صرف ماموں تھا جو بے بسی کی تصویر بنا اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

”اِسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

رشندہ اکرام کو گھورنے لگی۔

”اِس کی ماں مر گئی ہے یہ یتیم بچہ ہے۔“

اکرام نے بڑی مشکل سے رخشندہ کو جواب دیا۔

”یتیم بچوں کے لیے یتیم خانہ ہے یہ میرا گھر ہے کوئی یتیم خانہ نہیں۔“ رخشندہ غرائی۔

”کیا کہہ رہی ہو رخشندہ اتنے بڑے گھر میں یہ رہ لے گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”آپ جس مقصد کے لیے اِس کو یہاں لائے ہیں وہ میں خوب جانتی ہوں۔“

”کس مقصد کے لیے لایا ہوں؟“

”جب سے تابندہ پیدا ہوئی ہے آپ کا مقصد تو صرف ایک ہی ہے۔“

”تو یہ ہے رخشندہ تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ جب اللہ وہ وقت لائے گا دیکھا جائے گا۔“

”دیکھا نہیں جائے گا میں ابھی آپ پر واضح کر دینا چاہتی ہوں آپ کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔“ رخشندہ کی باتیں صابر کے کانوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ اپنی ممانی کی باتیں سُنتا اُس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ یہاں سے

سے ہوئی جو جلدی جلدی کھلونوں کی دکان سے نکل جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ تابندہ بار پار صابر کی پسندی ہوئی گڑیا کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ اب شام ہو چکی تھی اگلے دن رخشندہ نے پھر صابر کو ساتھ لیا بازار سے کچھ اور شاپنگ کی سارے شاپر صابر پر لادے اور کھلونوں کی دکان پر پہنچ گئی۔

”کل میں نے اپنی بچی کے لیے کھلونے خریدے تھے وہ آپ کی دکان میں ہی رہ گئے۔“ رخشندہ دکان میں داخل ہوتے ہی دکاندار سے مخاطب ہوئی۔

”یہ رہے جی آپ کے کھلونے..... میں نے تو آپ کو آوازیں بھی دیں مگر آپ گاڑی بھگا کر لے گئیں۔“ دکاندار نے اپنے کاؤنٹر کے نیچے سے کھلونے نکال کر رخشندہ کو دے دیے۔

صابر کل والی گڑیا کو آج بھی بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا پتہ نہیں کیا کشش تھی اس گڑیا میں، گڑیا کی شکل کچھ کچھ تابندہ سے ملتی تھی۔ گڑیا کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔

”اس کی ٹانگ کو کیا ہوا؟“ صابر نے دکاندار سے پوچھا۔

”میں صبح دکان کی صفائی کر رہا تھا یہ نیچے گر گئی میرے پاؤں کے نیچے آ گئی۔ اب یہ گڑیا میں تم کو صرف سو روپے میں دے سکتا ہوں۔“ دکاندار نے اب اس بے کار گڑیا کی قیمت سو روپے ہی وصول کرنا ہی غنیمت جانا کیونکہ وہ تو اسے اب ڈسٹ بن میں پھینکنے والا تھا۔ صابر کی جیب میں تو سو روپے تو کپاسو پیسے بھی نہیں تھے۔ جیب خالی ہو تو سنے دیکھنے فضول ہوتے ہیں۔ دولت جیب میں ہو تو بندہ بڑے بڑے خواب بھی دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر بھی پالتا ہے۔ صابر نے اس گڑیا کے حصول کے لیے خواب اس لیے دیکھنا شروع

سوٹ اُس نے تین تین ہزار میں خریدا تھا۔ ریڑھی والا جس دکان کے سامنے کھڑا تھا وہ کھلونوں کی دکان تھی۔ کھلونوں کی دکان دیکھ کر تابندہ کھلونوں کے لیے ضد کرنے لگی تو رخشندہ تابندہ اور صابر کو لے کر کھلونوں کی دکان میں چلی گئی وہاں سے تابندہ نے دو تین کھلونے خریدے شوکیس میں سچی ایک خوبصورت گڑیا کو صابر بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا۔

”صابر تم کو یہ گڑیا پسند ہے؟“ تابندہ نے پوچھا۔

”بڑی خوبصورت گڑیا ہے مجھے بہت اچھی لگی ہے۔“

”امی صابر کو یہ گڑیا لے دیں۔“

”کتنے کی ہے یہ گڑیا؟“ رخشندہ نے دکاندار سے پوچھا۔

”صرف بارہ سو کی۔“

”لڑکے گڑیوں سے نہیں کھیلا کرتے چلو اب

نکلو دکان سے۔“ فرخندہ گڑیا کی قیمت سن کر فوراً دکان سے نکل جانا چاہتی تھی۔

”امی صابر کو یہ گڑیا لے دیں اس کو بہت پسند ہے۔“

”میں کہتی ہوں نکلو یہاں سے بہت دیر ہو گئی ہے۔“

پھر رخشندہ تابندہ کو زبردستی بازو سے پکڑ کر

دکان سے باہر آ گئی۔ صابر کو اُس نے کپڑوں

والے شاپر پکڑائے ہوئے تھے وہ ان کے پیچھے

پیچھے دکان سے باہر آ گیا۔ گاڑی رخشندہ خود

ڈرائیو کر کے لائی تھی سب گاڑی میں بیٹھے اور گھر

آ گئے۔ گھر آ کر جب سارا سامان چیک کیا گیا تو

پتہ چلا کہ تابندہ نے جو کھلونے لیے تھے وہ تو دکان

پر ہی رہ گئے یہ غلطی رخشندہ کی جلد بازی کی وجہ

تابندہ کا رشتہ شہر کے انتہائی امیر گھرانے میں طے کر دیا۔ اس گھرانے کے ہر فرد کے پاس اپنی اپنی گاڑیاں تھیں۔ سلیم اپنے والدین کی اکلونی اولاد تھا۔ اُن کی دولت کا کوئی شمار نہیں تھا۔ سلیم نے پہلی نظر میں ہی تابندہ کو پسند کر لیا تھا۔ پسند بھی کیوں نہ کرتا تابندہ لاکھوں میں ایک تھی۔

اُس کا لمبا قد صراحی دار گردن، موٹی موٹی آنکھیں، دودھ کی طرح سفید رنگت اُس کے حسن کو چار چاند لگاتے تھے۔ سلیم کے گھر میں صرف تین افراد تھے سلیم اُس کی ماں اور اُس کے باپ تینوں کے پاس اپنی اپنی گاڑیاں تھیں۔

رخشندہ نے یہ ساری صورت حال دیکھ کر تابندہ کو بھی ڈرائیونگ سیکھنے پر مجبور کیا۔ چند دنوں کی ٹریننگ کے بعد تابندہ تھوڑی تھوڑی گاڑی چلا سیکھ گئی تھی۔

تابندہ کی جب جبک ختم ہوئی تو وہ ایک دن گاڑی لے کر اکیلی ہی مین سڑک پر چلی گئی۔ میں سڑک پر جا کر اُس سے گاڑی سنبھالی نہ گئی اور اُس نے گاڑی ایک وین سے ٹکرا دی۔ جس سے وین میں بیٹھی سواریاں معمولی زخمی ہوئیں لیکن تابندہ کو شدید چوٹیں آئیں۔

تابندہ کی گاڑی قلابازیاں کھاتے ہوئے سڑک کے نشیب میں جا گری۔ جبکہ تابندہ گاڑی سے نکل کر سڑک پر جا گری اور بے ہوش ہو گئی۔ ایک ٹرک آیا اُس کا ایک ٹائز تابندہ کی بائیں ٹانگ کے اوپر سے گزر گیا جس سے تابندہ کی بائیں ٹانگ بری طرح چل گئی۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ہجوم میں سے کسی نے 1122 کو فون کر دیا تھوڑی دیر بعد ہی 1122 ایبویٹس اپنا مخصوص سائرن بجاتی ہوئی جائے حادثہ پر پہنچ گئی۔

کر دیے تھے کہ اب گڑیا کی قیمت بارہ سو کی بجائے صرف ایک سو تھی۔ لیکن ایک ٹانگ والی گڑیا اب بھی اُس کی پہنچ سے باہر تھی۔ یتیم بچوں کے خواب ادھورے ہی ہوتے، خواب تو صرف اپنے والدین ہی پورے کرتے ہیں۔

”یہ گڑیا! اس کو دے دو“ رخشندہ نے سو روپے کا نوٹ نکال کر دکاندرا کو دیا۔

صابر گڑیا لے کر بہت خوش ہوا۔ بارہ سو کا احسان اُس نے صابر پر ایک سو میں کر دیا تھا۔ رخشندہ کے لیے یہ کون سا مہنگا سودا تھا۔ صابر معصوم تھا رخشندہ کی چالاکی سمجھ نہ سکا۔

☆.....☆.....☆

وقت کا پھیہ چلتا رہا تابندہ اور صابر جوان ہو گئے۔ اکرام اور رخشندہ نے بڑھاپے میں قدم رکھ دیے۔ اولاد جب جوانی میں قدم رکھتی ہے تو والدین کے قدم بڑھاپے کی میزبانی کے پہلے زینے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ اب تو اکرام اور رخشندہ کے درمیان روز تابندہ کے رشتے کے بارے میں ٹکرا رہے تھے۔ اکرام تابندہ کی شادی صابر سے کرنا چاہتا تھا جبکہ رخشندہ تابندہ کی شادی کسی ہائی کلاس گھرانے میں کرنا چاہتی تھی۔ جہاں گھرانوں میں لمبی گاڑیاں اور نوکروں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوں لیکن تابندہ کو یہ سب کچھ پسند نہیں تھا وہ بھی صابر کو پسند کرتی تھی۔ صابر بھی اب پڑھ لکھ کر بینک میں اچھی جاب پر تھا لیکن رخشندہ تو ایسا لڑکا چاہتی تھی جو بینک میں کام نہ کرتا ہو بلکہ بینک کا مالک ہو۔ رخشندہ کے خیالات بہت اونچے تھے جبکہ صابر بہت چھوٹا تھا۔ رخشندہ کے خیالات تک پہنچنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ گھر میں ویٹو پاور بھی رخشندہ کے پاس تھا۔ اُس ویٹو پاور کو استعمال کرتے ہوئے رخشندہ نے

یوندا باندی ہو جائے تو دھول کو اڑانے کا ڈر نہیں ہوتا۔ صابر نے برس کر دھول کو محفوظ کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جلد عروسی میں تابندہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اُس کی بیساکھیاں بھی اُس کے پاس ہی پڑی تھیں۔ صابر نے تابندہ کا گھونگھٹ اٹھایا تو تابندہ نے شرم سے آنکھیں بند کر لیں۔ اب یہ پتہ نہیں تھا کہ تابندہ نے آنکھیں شرم سے بند کی ہیں یا ندامت سے، آخر تابندہ نے آنکھیں کھولیں تو اُس نے دیکھا صابر کے ہاتھ میں وہی ایک ٹانگ والی گڑیا تھی جو اُس کی ممانی نے اُس کو بچپن میں لے کر دی تھی۔

”صابر یہ گڑیا تم نے ابھی تک سنجال کر رکھی ہوئی ہے؟“ تابندہ نظر میں چراتے ہوئے پوچھی۔
”یہ گڑیا میں نے اس لیے سنجال کر رکھی ہے تاکہ یہ مجھے میری اوقات یاد دلائی رہے کہ میری اوقات کیا ہے؟“

”صابر مجھے یاد ہے جب ہم بازار شاپنگ کرنے گئے تھے میری ماں نے میرے لیے مہنگے کپڑے خریدے تھے اور تمہارے لیے دکان کے باہر لگی ریزم سے دو تے سے سوٹ خرید کر تم کو دے دیے تھے۔ جس گڑیا کی قیمت بارہ سو گھی جب وہ بے کار ہو گئی تو میری ماں نے وہ گڑیا تم کو سو روپے میں لے کر تم پر احسان چڑھا دیا۔ اب جب میں کسی کام کی نہیں رہی تو میری ماں نے مجھے بھی تم کو سو روپے دیا۔ صابر اپنی ماں کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ صابر مجھے معاف کر دو جو چیز بے کار ہو جاتی ہے وہ ڈسٹ بن میں پھینک دی جاتی ہے۔ صابر میں شرمندہ ہوں میری ماں نے تم کو ڈسٹ بن سمجھ رکھا ہے۔

☆.....☆.....☆

1122 کے اہلکاروں نے بے ہوش تابندہ کو ایسویٹس میں ڈالا اور شہر کے سب سے بڑے اسپتال پہنچا دیا۔ تابندہ کی ٹانگ بری طرح چکل گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بڑی کوشش کی ٹانگ بچانے کی، تابندہ نے پیسہ بھی پانی کی طرح بہایا، لیکن سب تدبیریں بے کار ہوئیں۔ ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود آخر کار تابندہ کی ٹانگ کاٹنی پڑی۔ ایک مہینہ اسپتال میں رہنے کے بعد تابندہ ایک ٹانگ کے ساتھ گھر واپس آ گئی۔ تابندہ کو گھر آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ لیکن سلیم کی طرف سے تابندہ کی مزاج پرسی کے لیے کوئی نہ تو اسپتال آیا تھا نہ ہی ابھی تک گھر آیا۔ رخشندہ روز سلیم کی راہ دیکھتی تھی لیکن سلیم نے نہ آتا تھا اور نہ ہی وہ آیا کیونکہ دنیا تو مکمل لوگوں میں نقص نکالنے سے باز نہیں آتی۔ تابندہ تو اب نامکمل ہو گئی تھی۔ اب وہ کسی کے سہارے کی محتاج تھی۔ غیر بھی کبھی کسی کا سہارا بنے ہیں۔ آخر چند دن بعد سلیم کا فون آ گیا کہ وہ تابندہ سے شادی نہیں کر سکتا یہ فون کال رخشندہ نے سنی تھی۔ رخشندہ کے لیے سلیم کی کال کال نہیں تھی بلکہ گالی تھی۔ خواہوں کے محل بھی کبھی ایسے بھی یکدم گرتے ہیں یہ تو رخشندہ نے بھی سوچا بھی نہ تھا۔ تابندہ اب ایک لمبے کا ڈیر تھی جو ہر وقت بیڈ پر پڑی رہتی تھی۔ اس لمبے کو اٹھانے والا اب کوئی نہیں تھا۔ رخشندہ اپنے تکبر کی سزا پا چکی تھی۔ اُس کا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ صابر کو دھول سمجھنے والی رخشندہ اب خود دھول بن چکی تھی۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی دھول کو اڑانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ دھول اڑ جاتی صابر ہلکی سی یوندا باندی بن کر اس دھول پر برس گیا۔ دھول اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ آندھی سے پہلے

ناول
کاوش صدیقی

خاتواہ

آخری قسط

خاتواہوں آستانوں اور باروں آستانوں سے ہر ایک مرد و عورت کی داستانِ عیب
تصرف اور حجت کی پھر اور عیب کی کہانی

”میرے بچو اللہ تمہیں ہر جگہ کامیاب فرمائے۔!“
آئی دیر میں عبداللہ شاہ گیلانی کے اشارے پر مٹھائی آگئی۔ قادری سرکار نے ایک گلاب جامن اٹھا کر



عبداللہ شاہ گیلانی کو کھلایا، پھر خادم حسین کو، پھر ہم کو ایک ایک گلاب جامن اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔

”اچھا عبداللہ بیٹے اب ہمیں اجازت دو۔۔۔!“ انہوں نے کہا۔

”سراکار رات کا کھانا کھا کے جائیں۔!“ عبداللہ شاہ نے درخواست کی۔

”رات کا کھانا تو ہم خادم حسین کے گھر کھائیں گے۔ ان سے ہم نے وعدہ کیا ہے۔ آپ بھی چلیں

بیٹے۔!“ قادری سرکار نے بڑے ملائم لہجے میں کہا۔

”بس رو چشم۔۔۔!“ عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔

ہم لوگ باہر آ گئے۔ عبداللہ شاہ گیلانی نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سب سے پہلے قادری سرکار بیٹھے

پھر ہم تینوں پیچھے بیٹھ گئے۔ عبداللہ شاہ ڈرائیورنگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ قادری سرکار کے ڈرائیور نے گاڑی ہمارے

پیچھے لگالی۔ ہمارا رخ خادم حسین کے گھر کی طرف تھا۔

راستے میں کئی لوگوں نے قادری سرکار کو پہچان لیا۔ قادری سرکار کے نعرے لگنے لگے۔ پھر کئی لوگوں نے

گاڑی میں جھانکا تو انہیں خادم حسین اور میں نظر آیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک جم غفیر گاڑی کے آس پاس جمع ہو گیا۔ اور نعرے لگنے لگے۔ اچانک خادم حسین کے

ساتھ ساتھ ایک اور نعرہ فضا میں گونجا۔

”عبداللہ شاہ گیلانی زندہ باد۔ عبداللہ شاہ گیلانی زندہ باد۔“ ہمیں لوگوں کے چھوٹے بڑے ہجوموں سے

گزر کر خادم حسین کے گھر تک پہنچنے میں اچھی خاصی دیر لگ گئی۔ وہاں پہنچے تو سینکڑوں لوگ جمع تھے۔ برقی رفتار

میدیا نے خبر کو لوگوں میں دنیا بھر میں پھینچا دیا تھا۔

ہم لوگ گاڑی سے باہر نکلے تو لوگوں نے فلک شکاف نعروں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ قادری سرکار

کو، خادم حسین کو، مجھ کو اور عبداللہ شاہ گیلانی کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ بالآخر غلام حسین، خادم حسین اور حافظ

سلیمان صاحب کی بار بار کی التجاؤں سے ہجوم پرسکون ہوا۔

اور لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے مگر ہر شخص جانے سے پہلے قادری سرکار کے، پھر میرے اور پھر

عبداللہ شاہ گیلانی کے ہاتھ ضرور چومتا تھا۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ کشور اور تاج ور جلدی سے آئیں اور انہوں نے سب سے پہلے قادری سرکار کے

باؤں دھلائے۔ انہیں چادر لگی گاؤں تھکنے والی بڑی چار پائی پر بٹھایا۔ جب ہم سب بیٹھ گئے۔ تو قادری سرکار

مسکراتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئے۔

”تذریل میاں۔۔۔!“

”جی سرکار۔۔۔!“ میں ہمدردی سے گوش ہو گیا۔

”کچھ دیکھا، کچھ محسوس کیا آپ نے؟“۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”سراکار بہتر جانتے ہیں۔!“ میں نے جواب دیا۔

”یہ ترک کا صلہ ہے۔“ انہوں نے فرمایا۔ ”جب ترک کو پالیتے ہیں تو دلوں تک رسائی مل جاتی ہے۔ اور

دلوں میں اللہ رہتا ہے۔!“

سبحان اللہ۔۔۔ سبحان اللہ۔۔۔! بے ساختہ کئی آوازیں گونجیں۔

مجھے لگا کہ جیسے کوئی چیز چٹاخ کر کے میرے اندر ٹوٹی ہو۔ میں نے اپنے اندر جھانکا۔ رعبیت دنیا کا، کاسے

سرا ایک چمکانے سے ٹوٹ کے کرچی کرچی پڑا تھا۔

اچانک میرے دل سے ایک سیلاب پھوٹا، اور میرے بدن کو ڈبوٹا ہوا آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔

کسی نے پوچھا۔ ”کیا ہوا خلیفہ جی کو؟“
 ”خلیفہ جی، خلیفہ جی کے منصب پر فائز ہو رہے ہیں۔!“ مجھے بہت دور سے آتی ہوئی غلام حسین کی
 آواز سنائی دی۔ اور اس کے ساتھ ہی میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

”میں واپس جا رہا ہوں۔۔۔!“ عبداللہ شاہ گیلانی نے نازاں سے کہا۔
 نازاں کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ عبداللہ شاہ گیلانی کو دیکھتی رہی، پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
 ”کیوں رو رہی ہو؟“ عبداللہ شاہ نے اس کے ہاتھوں کو چھوا، جو برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔
 ”آپ بہت بدل گئے ہیں۔!“ وہ دھیسے سے بولی۔ ”جو بھی ہوا مجھے صرف یہ بتائیے کہ اس میں میرا قصور
 کیا تھا۔؟“

”کیا ہوا۔؟“ عبداللہ شاہ گیلانی نے حیرت سے پوچھا۔
 ”میں انجان نہیں ہوں۔ دکھی ہوں۔ آپ نے یہ سچی نہ سوچا کہ اختلافات یا ناراضگی جو بھی ہے، آپ کی
 پاپا سے ہے۔ میرا کیا قصور ہے۔؟ میں پہلے بھی انتظار کرتی رہی۔ اب بھی انتظار کرتی رہو گی۔!“ وہ مرثض
 لہجے میں بولی۔ شدت جذبات سے اس کا بدن لرزنے لگا۔
 ”مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ تم میری آرزو، میری زندگی ہو۔ امریکا میں، ہر تنہائی میں صرف تمہارا
 خیال ہی تھا کہ جس نے مجھے تمہارے لئے وقف رکھا۔ وہ سچ سچ بھیجی بھی بہت پیاری۔ اس کی پیازنی رنگت جو
 رونے اور شدت جذبات کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھی۔ گلابی پیازنی رنگت۔ وہ بہت عزیز تھی، عبداللہ شاہ گیلانی
 کو۔“

”پھر بھی مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔؟“ نازاں نے دھیسے سے پوچھا۔
 ”ہاں میں ڈر گیا ہوں۔ میرا رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔“ عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ ”مجھے کاش پاپا
 کا بلیک ہیری موبائل نہ ملتا۔ کاش میں وہ آخری ریکارڈنگ نہ سنتا جو نجانے کس طرح محفوظ ہو گئی۔!“
 ”کیا تھا اس میں۔؟“ نازاں نے پوچھا۔

مگر عبداللہ شاہ گیلانی اپنی ہی ذہن میں بولتا رہا۔ ”ہمارے سوئٹزر لینڈ میں چھپن کر وڈ ڈالرجس ہیں۔ اور وہ
 بھی کسی اور کے بینک میں نہیں، ہمارے اپنے بینک میں ہیں۔“

وہ بینک جو چچا جان نے قائم کیا ہے۔ اور ان ہی پیسوں کے لئے میرے باپ کی جان گئی۔ سچ ہے کہ
 دولت اور اقتدار کے سامنے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ وہ شخص جس نے مجھے پیار دیا۔ اعتبار دیا۔ جس کی ذات
 میرے لئے مثال تھی۔

جن کی سیاست نے مجھے ہمیشہ ہی متاثر کیا۔ میرے آئیڈیل میرے باپ نہیں، میرے چچا تھے۔ مگر مجھے
 اس کا کیا صلاط۔؟ میں باپ سے محروم تو ہوا ہی تھا۔ چچا سے بھی محروم ہو گیا۔“ عبداللہ شاہ گیلانی کے لہجے
 میں بے پناہ دکھ تھا۔ ”میں یہاں کیسے رہوں۔؟ میرا دم گھٹتا ہے۔!“

نازاں چپ رہی۔ چند دن قبل اس نے سنا تھا کہ عبداللہ شاہ گیلانی اور شاہ ہارون گیلانی کے درمیان کسی
 مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مگر وہ سچی بھی تھی کہ انکیشن کے حوالے سے کوئی بات ہو رہی ہے۔ مگر یہ تو معاملہ ہی کچھ
 اور نکلا۔

”تمہیں ایک بتاؤں نازاں۔؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ اور نازاں کی
 طرف دیکھا۔ وہ اسی کی جانب متوجہ تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ”چچا جان میرا آئیڈیل ہیں۔ وہ بت جس کو میں ہر

حوالے سے پوچتا رہا۔ میرا مان، میرا درد، میں اپنے اس آئیڈیل کے ساتھ نہیں رہ سکتا جواب ٹوٹ گیا ہے۔
 بکھر گیا ہے۔! "عبداللہ گیلانی کی آواز بھاری ہو گئی۔ حلق تو نازاں کا بھی ٹمکین تھا۔
 "مجھے جانے دو۔۔!"

"اور میں۔۔۔؟" نازاں نے پوچھا۔
 "تم پر کوئی جبر نہیں۔ میں خود کو ترک کر رہا ہوں۔ تمہیں تو نہیں کہہ رہا۔ لیکن فیصلے کا اختیار تمہیں سوپ رہا
 ہوں۔"
 "میرا فیصلہ، میرا حاصل تو آپ ہیں۔!" وہ دھیمے سے، سر جھکا کے بولی۔ "روپیہ پیسہ نہیں آپ کا ساتھ
 چاہیے۔!"

عبداللہ شاہ گیلانی مسکرا دیا۔ بہت دنوں کے بعد اسے لگا کہ جیسے گھٹا توپ اندھیرے کے بعد سورج کی پہلی
 کرن نکلی ہو۔ محبت اور بھروسے کی۔
 بعض لوگ محبت سے سب کچھ کما لیتے ہیں۔ اور بعض لوگ بڑی محنت سے اپنا سب کچھ گنوا دیتے ہیں۔
 انسان کے نفع و نقصان کا کیا کہنا۔ وقت کی ہی گواہی ہے کہ انسان نقصان میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو اپنے وقت کو
 قابل قدر جانتے ہیں۔

اس مہلت کو قیمت جانتے ہوئے اعمال صالحہ بجالاتے ہیں۔ وہی فلاح پانے والے ہیں۔ مصیبتوں،
 دکھوں، پریشانیوں، ناامیدیوں اور ناخوشی میں اپنے رب سے امید قائم رکھتے ہیں۔ خالق کے کنبے کی
 خیر و فلاح کے لئے معروف عمل رہتے ہیں اور صرف اپنے رب سے مدد مانگتے ہیں۔ اسی کی تسبیح و تہلیل میں لگے
 رہتے ہیں۔ اس کے بجز جو ہیں۔ وہ خسارے میں ہیں۔ ایسا خسارہ جس میں رنی برابر بہتری کی گنجائش نہیں
 ہوتی۔

"چلئے میں آپ کو چائے پلاؤں۔!" نازاں اٹھی۔ اس کے انداز میں بلا کا اعتماد، اور مظہر اؤ تھا۔ جب
 انسان کسی فیصلے پر پہنچ جاتا ہے تو پھر جیسے سارے معاملات آسان ہو جاتے ہیں۔
 وہ دونوں بائیں باغ سے اندر آگئے۔ مرکزی ڈرائنگ روم میں تہا شاہ ہارون گیلانی بیٹھے ہوئے تھے۔
 کیونکہ سگار ان کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ جس سے دھوئیں کی ایک باریک گھیر بل کھاتی ہوئی فضا میں بلند
 ہو رہی تھی۔ ان کے چہرے پر سوچ کے گہرے دائرے پھیلے ہوئے تھے۔

پتا نہیں کیوں عبداللہ شاہ کو ان پر بہت ترس آیا۔ وہ ان کے پاس آ بیٹھا۔ مگر وہ نجانے بے خودی کے کس
 عالم میں تھے کہ انہیں اس کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔
 ریاضے کمدار آیا اور خاموشی سے ان کے قریب کھڑا ہوا۔ عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔ "کیا بات
 ہے۔؟"

"جی وہ خادم حسین آیا ہے سلام کرنے۔!" ریاضے کمدار نے بتایا۔
 آواز سن کر شاہ ہارون گیلانی نے نظر اٹھا کر اسکو دیکھا۔ پھر عبداللہ شاہ گیلانی کی طرف دیکھا۔ ان کی
 نگاہیں خالی خالی سی تھیں۔

"جاؤ بلا لو۔!" عبداللہ شاہ گیلانی نے اجازت دے دی۔ ریاضے کمدار نے سر کو خم دیا اور چلا گیا۔
 چند ہی منٹوں کے بعد خادم حسین اندر آ گیا۔ اس نے بڑے ادب سے اپنے جوئے قالین سے پرے
 اتارے اور ہتہ قدموں سے چلتے ہوئے شاہ ہارون گیلانی کے پاس آیا اور ان کے گھٹنے چھو کر انہیں سلام کیا۔
 پھر بڑے ادب سے پیچھے ہٹا۔ اور عبداللہ شاہ کے گھٹنے چھونے لگا۔

”ارے یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو۔؟“ عبداللہ شاہ گیلانی نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے۔ ”چلو اطمینان سے بیٹھو۔!“

خادم حسین وہیں قائلین پر بیٹھ گیا۔

”خادم حسین اوپر بیٹھو۔۔!“ عبداللہ شاہ نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

”سرکار ہم اپنی جگہ بچھانتے ہیں۔ دنیاوی رتے سے آدی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا ہے۔ بڑائی تو ادب سے حاصل ہوتی ہے۔“ خادم حسین نے کہا اور نظریں جھکا کے خاموش ہو گیا۔

”خادم حسین میں واپس جا رہا ہوں۔!“ عبداللہ شاہ نے بتایا۔ ”امریکا۔۔۔!“

”اور یہاں۔۔۔؟“ خادم حسین نے پوچھا۔ ”یہاں کیا ہوگا۔؟ امریکا میں تو سب منظم ہے۔ ہر چیز اپنی

اپنی جگہ پر ہے۔ وہاں جا کر کیا کریں گے آپ۔؟“

خادم کا لہجہ بہت سادہ تھا۔ مگر سوال نہایت ذہانت آمیز۔

”کیا کیا تم نے۔ ذرا پھر سے کہنا۔!“ عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ ”اتنی گہری بات۔؟“

”میں کیا جی میری اوقات کیا۔؟ کام کرنے کی ضرورت تو یہاں ہے۔ ہم لوگوں کو سیاست کا، ملکی امور کا

کیا پتا۔ وہ تو جی آپ لوگ جانتے ہیں۔ ہم تو جی ندیاں، نالے ہیں۔ دریا رسد تو آپ ہو، اگر سوتا ہی خشک

ہو جائے تو پھر ندی نالے کیا کریں گے جی۔ مٹی پر آنسو کی لکیر بن کر رہ جائیں گے۔!“

شاہ ہارون گیلانی اٹھے اور اس صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔ جس کے پاس خادم حسین بیٹھا ہوا تھا۔ خادم حسین

نے اپنا سر شاہ ہارون گیلانی کے گھٹنوں سے لگا دیا۔

”آپ ہی تو ہمارا پیار ہو۔!“ خادم حسین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ”ہم آپ سے باغی نہیں۔ آپ کو

احساس دلاتے ہیں جی کہ آپ جھک کر ہمیں تمام لو، قادری سرکار ہمارے مرشد کی توساری تعلیم ہی پیار و محبت

ہے جی۔ محبت اگر خوف سے کی جائے تو وہ ریا کاری ہوتی ہے۔ اطاعت اگر امید سے کی جائے تو عبادت ہوتی

ہے۔ اور اگر محبت اور اطاعت بغیر خوف، بغیر لالچ، بغیر طمع کے ہو تو جی وہ طاقت بن جاتی ہے۔ شاہ جی ہم تو

آپ کی طاقت بننا چاہتے ہیں اور بس۔!“

”سچ کہتے ہیں سرکار کہ یہ ہماری تربیت ہیں۔!“ عبداللہ شاہ گیلانی نے ایک گہری سانس لیکر کہا۔ ”ہم دنیا

کے جس ملک میں بھی جائیں، جس قدر بھی پیسہ لے جائیں۔ رہتے تو ہم وہاں دوسرے درجے کے شہری ہیں۔

اور پھر جن لفظوں میں ان ممالک میں شہریت کے لئے حلف لیا جاتا ہے وہ کسی بھی آزاد وطن کے پاسی کے لئے

جو غیرت مند ہو، اس کے لئے مرجانے کا مقام ہوتا ہے۔“

”جی جو اپنی مٹی کی قدر نہیں کرتے دوسرے کی مٹی انہیں کیا عزیز رکھے گی۔؟“ خادم حسین نے فلسفیانہ

انداز میں کہا۔

”دیکھ لیں جی ہماری دنیا میں صرف مسلمان ہی دہشت گرد، قدامت پسند ہیں۔ حالانکہ ساری دنیا، پورا

یورپ، امریکا بچوں کو ضبط تو لیکر تعلیم دے رہا ہے اور ہم کتنے بے فکرے ہوتے ہیں۔ ہمارے قدامت پسند

معاشرے میں پورے سال میں خواتین کی بے حرمتی کے اتنے واقعات نہیں ہوتے ہیں جتنے ایک ماہ میں صرف

امریکا میں ہوتے ہیں۔ پہلے یہ مسلمان اور جہاد کا نعرہ لگاتے ہیں، پھر جنت کا لالچ، ملوکیت کی برائی، موروثی

بادشاہت کے خاتمے کے لئے دوسروں کو کافر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ کام اثر توڑنے کے لئے مسلمان کے

جذبے کو لادینیت سے حفاظت کے لئے استعمال کیا۔ اس کے بعد ان ہی لوگوں کو دہشت پسند بنا کر ڈرون

حملوں میں مارنا شروع کیا۔ ہمارے ناعاقبت اندیش بچے اس کا شکار ہوتے چلے گئے۔“

خادم حسین کے پردے میں قادری سرکار کے لفظ بول رہے تھے۔ ”اگر آپ ہمیں، ہمارے نوجوانوں کو پیار دیتے، اعتبار دیتے، اپنے ساتھ ملا لیتے تو بھوک کے باعث غیروں کے ہاتھوں وہ اس طرح استعمال نہ ہوتے۔“ خادم حسین کے لہجے میں دکھ تھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور بولے۔ ”مگر اب تم اکیلے نہیں ہو۔ ہمارے ہو۔ ہمارے گناہ تو شاندا تھے زیادہ ہیں کہ سرکار ہم سے ملنا بھی پسند نہ کریں۔ اور شاہ عبداللہ بھی ہمیں معاف نہ کریں۔“ شاہ ہارون گیلانی کی آواز بھاری ہو گئی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں سرکار۔۔۔؟“ خادم حسین نے چہل کے ان پاؤں پکڑ لئے۔ ”مرشد سرکار جی پیار کا سمندر ہیں۔ وہاں تو نرمی ہی نرمی گداز ہی گداز ہے۔ آپ ایسا ہرگز نہ سوچیں۔ روشنی بھلا کہیں بھی اندھیرا رہنے دیتی ہے۔ محبت تو جی روشنی ہے۔ ہر شے کو، ہر دل کو اجال دیتی ہے۔ اور آپ تو ہمارے بڑے ہیں۔ گتختی اگر ہم سے ہوئی ہے تو سومرتیہ معافی کی طلبی ہے۔!“

شاہ ہارون گیلانی مسکرائے، ایک نم آلود مسکراہٹ، عبداللہ شاہ گیلانی اٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔ اور ان کے ہاتھ تمام کے بولا۔ ”چچا جان جو ہو جائے اس کو بدلا نہیں جاسکتا۔ جتنا ہو وقت واپس نہیں آسکتا۔ مگر ہم آنے والا وقت تو بدل سکتے ہیں۔ اپنی ہمت، اپنے حوصلے اور اپنی طاقت سے۔!“

وہ مسکرائے۔ ”اور تم جو یہاں سے جا رہے ہو۔؟“ انہوں نے پوچھا۔ خادم حسین نے کہا۔ ”کہ امریکا میں کیا ہے۔ وہاں تو ہر شے منظم ہے۔ اپنی اپنی جگہ، سٹم میں لوگ آتے ہیں اور ڈیوٹیاں نبھاتے ہیں۔ جبکہ یہاں تو سب کچھ ہوتا ہے۔ سٹم بنانا ہے۔ سٹم چلانا ہے۔ کام تو سچ سارے یہاں ہیں۔!“

”یہ اپنا خادم حسین بڑا سمجھ دار ہو گیا ہے۔!“ شاہ ہارون گیلانی مسکرائے۔ ”بڑی اچھی باتیں کرتا ہے۔!“

”جی یہ تو قادری سرکار کا کرم ہے ان کی تربیت ہے۔ وہ جی بہت پیار کرتے ہیں سب سے، پتا نہیں ان کے پاس اتنا پیار کہاں سے آتا ہے۔ کڑوے سے کڑوا بندہ شہد کر دیتے ہیں۔!“ خادم حسین کے لہجے میں مر جانے والی عقیدت تھی۔

اسی وقت احمد اور تک زیب اندر آیا۔ شاہ ہارون گیلانی نے اس کو دیکھ کر پوچھا۔ ”خیریت تو ہے کیا بات ہے۔؟“

”سردار حیات اللہ نے پارٹی چھوڑ دی ہے۔ ملک ریاض کی پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا ہے۔ اُن کا فون آیا ہے کہ وہ آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔“

”اچھا۔۔۔!“ شاہ ہارون گیلانی نے حیرت سے کہا۔ ”سردار حیات اللہ نے ملک ریاض کی پارٹی جو اسن کر لی۔؟“

اسی وقت شاہ ہارون گیلانی کا موبائل فون بج اٹھا۔ ”ہیلو۔۔۔!“ انہوں نے کہا۔ ”فوراً دار الحکومت آؤ بہت ضروری میٹنگ ہے۔ سردار حیات اللہ نے پارٹی چھوڑ دی ہے۔ کچھ دوسرے لوگ بھی پارٹی چھوڑ رہے ہیں اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔“

”لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔!“ شاہ ہارون گیلانی نے کہا ”اور۔۔۔!“

عین اسی وقت عبداللہ شاہ گیلانی کے فون پر بجیل ہوئی۔ عبداللہ شاہ کے فون اسکرین پر جانا پچھانا نام جگمگا رہا تھا۔

”اسلام علیکم!۔“ دوسری طرف سے قادری سرکار کی پرسکون نرم آواز سنائی دی۔
 ”جی سرکار۔۔!“ عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ شاہ ہارون گیلانی اپنی بات مکمل کرتے کرتے رک گئے۔
 قادری سرکار کہہ رہے تھے۔ ”توبہ اور سچی توبہ مقامات کو بلند کرتی ہے۔ جو بندہ سچے دل سے توبہ کر لیتا
 ہے۔ خدا اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔ ان سے کہو کہ پارٹی نہ چھوڑیں۔ اللہ بزرگ و برتر کے لئے دلی
 آرزوں کو پورا کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔“
 مارے حیرت کے فون شاہ ہارون گیلانی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

☆☆☆☆

جو پوری ہو جائے وہ طلب کہاں؟

ہم لوگ خانقاہ میں حاضر تھے۔ قادری سرکار کا درس جاری تھا۔ لوگ ہر دن گوش تھے۔ سراپا سماعت تھے۔
 ”محبت، تعلق، ایثار، قربانی یہ تمام رُخ، تمام جہتیں کسی ایک فرد کی ذات سے شروع ہوتی ہیں۔ فرد تنہا
 ہوتے ہوئے بھی تائید ایزدی سے تحریک کا روپ دھار لیتا ہے۔ پھر قربانیاں دیتے دوستوں، ساتھیوں، اہل
 محبت کو جنہوں نے تحریک کے لئے اپنا تن، من، دھن قربان کر دیا، ان کو سراہنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ کسی
 کو خطاب ملتا ہے۔ کسی کو اعتبار ملتا ہے۔ کسی کو اپنے ذاتی خاندان میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا
 ہے کہ قربانیاں دینے والے صاحب تحریک کو کس حد تک پیارے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
 کی سنت مبارکہ ہے۔ آپ نے اپنے دوستوں کو جنہیں ہم صحابہ اجمین کہتے ہیں۔ ان کو دیکھئے۔۔۔ آپ نے
 اپنے عزیز ترین صحابہ کرام کی دلجوئی، ان کی محبت، ان کے پیار کے احترام کے لئے ان سے رشتے دار یاں
 قائم فرمائیں۔ دلی تعلق کا ایک مظہر رشتے دینا، رشتے لینا بھی ہوتا ہے۔ لیکن صاحبو۔۔!“ قادری سرکار نے
 اپنے مخاطبین کو دیکھا۔ سب ان ہی کی جانب متوجہ تھے۔ اپنے مرشد کریم کی طرف، جو انہیں ہمیشہ پیار کا درس
 دیتے تھے۔

”لیکن صاحبو۔۔! ہم کیا کرتے ہیں۔؟ ہم اپنے دوستوں سے رشتہ کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے
 ہیں۔ ہم ناراض ہوتے ہیں کہ ہمارے دوست نے جو ہمارے گھر آتا جاتا ہے۔ اس نے رشتے کی درخواست
 کرنے کی خواہش کیسے کی۔؟ حالانکہ ہم ہر چیز کی خریداری میں مضبوطی، پائیداری، تعلق کی شدت، اور نوعیت کو
 سامنے رکھتے ہیں۔ مگر دیکھیے بھالے شخص کو شخص اس لئے طلب گاروں کی فہرست سے نکال دیتے ہیں کہ وہ ہمارا
 دوست، ہمارا محلے دار تھا۔ جاتے ہیں اس سے کیا ہوتا ہے۔؟“ انہوں نے حاضرین کی جانب دیکھا جو بہت
 دھیان سے ان کا درس سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

”صاحبو۔۔! اس سے ہوتا یہ ہے کہ ہم اچھے، دیکھے بھالے رشتے سے تو محروم ہوتے ہی ہیں۔ نادانگی
 میں دل آزاری کا سبب بھی بنتے ہیں۔ پھر ہماری بہن، ہماری بیٹی اچھے رشتے کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی
 ہوتی رہتی ہیں۔ اور ہم مناسب رشتوں کی تک و دو میں دوڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔ دوسرا ایک اہم معاملہ یہ
 ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں کہ پہلے اپنی بہن کی شادی کریں گے۔ پھر اپنی شادی کریں گے۔ اگر ہم
 اس پلان پر قائم رہتے ہیں اور صرف اسی شہر کے نوجوان یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم جب تک شادی نہیں کریں
 گے کہ جب تک ہماری بہن کی شادی نہیں ہوگی تو جانتے ہیں کیا ہوگا۔؟ تمام لڑکیاں بیٹھی رہ جائیں گی۔ ذرا یہ
 بھی تو سوچئے کہ ہر بیوی کسی کی بہن ہے۔ اسلام نے اس کا بہت سادہ سا، فطری حل رکھا ہے۔ جو لڑکا یا لڑکی
 بالغ ہو جائے۔ مناسب ذریعہ روزگار میسر ہو تو اس کی شادی کر دی جائے۔ اس سے نام صرف معاشرتی مسائل
 کم ہو جائیں گے۔ بلکہ جذباتی بیچان کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔ یاد رکھئے

--! اسلامی احکامات ہمارے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔ اے اللہ ہمیں ان احکامات، معاملات کی سمجھ عطا فرما۔ سید رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچی پیروی نصیب فرما۔!“

”آمین۔۔۔ آمین۔۔۔ سبحان اللہ۔۔۔“ کا ایک شور، مریدین، مداحین، عقیدت مندوں کی زبانوں سے بے ساختہ بلند ہوا۔ قادری سرکار خاموش ہو گئے تھے۔ لوگ دھیرے دھیرے ان کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔ کچھ ان سے اپنے مسائل پر مشورہ چاہتے تھے۔ کچھ دینی مسائل پر ان کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ علم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھے۔ ہر شخص ان سے اپنی موابدید کے مطابق، اپنے ظرف کے مطابق پیاس بجھا سکتا تھا۔

”چلو سرکار کو کارڈ دیں۔۔۔!“ قدر نے مجھ سے کہا۔

”تم دیدو۔۔۔!“ میں نے کہا۔ ”مجھے شرم آتی ہے۔۔۔ میں نے کون سی کوئی تصوف پر کتاب لکھی ہے۔!“

”محبت ہی تو اصل راستہ ہے تصوف تک جانے کا۔ عشق مجازی ہی تو بیڑی ہے عشق حقیقی تک پہنچنے کا۔!“ قدر نے مجھے سبھایا۔ میری کتاب ”سندے لیے جو کھو گئے“ کی تقریب رونمائی قدر نے آئرس ٹول میں رکھی تھی۔ جس میں اچھے خاصے ادیب آرہے تھے۔ کئی کالم نگار مدعو تھے۔ لیکن قدر کا فیصلہ تھا کہ اس تقریب کی صدارت قادری سرکار کریں گے۔ اس نے بغیر ان سے پوچھے ان کا نام کارڈ پر چھاپ دیا تھا۔ اب پہلا کارڈ ان کو دینے آیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”تم نے سرکار سے بغیر پوچھے ان کا نام چھاپ دیا ہے کارڈ پر، کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں!“

”نہیں وہ ناراض نہیں ہونگے۔۔۔!“ قدر نے بڑے بھروسے، بڑی عقیدت سے کہا۔ ”وہ تو ہم سے پیار کرتے ہیں۔ تم سے پیار کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور تشریف لائیں گے۔!“

”اچھا۔۔۔ چلو۔!“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ قادری سرکار کے درس میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی آتی تھیں اور ان سے راہ نمائی لیتی تھیں۔ درس کے بعد لوگ واپس جا رہے تھے۔ اچھی خاصی بھیر تھی۔ ہم لوگ اس بھیر میں راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک خاتون قدر سے ٹکرا گئیں۔ خاتون کے ہاتھ سے لنگر شریف والا لفافہ نیچے گر گیا۔ قدر اور خاتون دونوں ہی بے اختیار لنگر شریف کا لفافہ اٹھانے کے لئے تیزی سے جھکے تو انکے سر آپس میں ٹکرائے۔

”آف۔۔۔!“ خاتون کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔ ان کا نقاب سرک گیا۔

”آپ۔۔۔؟“ قدر نے انہیں لنگر شریف کا لفافہ اٹھا کر دیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ یہاں کیے۔۔۔؟“

”میں۔۔۔ میں وہ درس سننے کے لئے آئی تھی۔“ ان خاتون نے گھبراہٹ سے کہا۔ وہ بچہ خوبصورت تھیں۔ مجھے ان کے نقوش کچھ جانے بچانے سے لگے۔ ان کی آواز بھی ان کے چہرہ کی طرح خوبصورت و نغمہ سحر بھر پور تھی۔

”اچھا۔۔۔!“ قدر نے جواب دیا۔ وہ خاتون لفافہ لے کر تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔

”یہ خاتون کون تھیں؟ مجھے ان کا چہرہ کچھ جانا بچانا سا لگا۔؟“ میں نے قدر کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”ارے تم نے ان کو نہیں پہچانا۔ یہ یہ ماضی کی نامور گلوکارہ زبیدہ انصاری تھیں۔ سرکار کا درس سننے آئی

ہوگی۔“ قدیر نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔

میں چپ ہی رہا۔ یہاں تجانے کتنے مرد و خواتین اپنی تشدد روح کی پیاس بجھانے آتے تھے۔ ہم دونوں جا کر خانقاہ کے اسی کمرے میں بیٹھ گئے۔ جہاں اس سے قبل بھی آپکے تھے۔ تموڑی دیر کے بعد آہٹ ہوئی اور قادری سرکار دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے۔ ہم دونوں احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائے۔ ”کیا بات ہے۔ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔۔۔؟“ وہ نہایت ذکی الفہم تھے۔

”ایک چھوٹی سے درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔!“ قدیر نے کہا۔

”کہئے۔۔۔!“ انہوں نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے تو ہم بھی بیٹھے۔

”خزینہ خلیفہ جی کی کتاب ”سندیے جو کھو گئے“ کی تقریب رونمائی کر رہا ہوں۔ اس میں آپ کی شرکت ہمارے لئے باعث سعادت ہوگی۔!“

”اچھا۔۔۔!“ وہ مسکرائے۔ ”مگر آپ نے ہمیں کتاب تو نہیں دی پھر آپ کی کتاب پر کیا گفتگو کریں گے۔؟“

واقعی یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔

”میں اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔!“ میں نے معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔!“ وہ متانت سے بولے۔ ”آپ کا موضوع تو محبت ہی ہے نا۔ پھر محبت تو دل سے بھرتی ہے۔ اس لئے اس پر بولنا ہی محبت کو پھیلانے کا موجب ہے۔!“

”سرکار یہ پہلا کارڈ آپ کی نذر، آپ سے ہی تقسیم شروع ہو رہی ہے۔!“ قدیر نے انہیں کارڈ پیش کیا۔

انہوں نے کارڈ لے لیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”خزینہ میاں! آپ کو ہمارا آج کا درس کیسا

لگا۔؟“

”سرکار آپ کا ہر درس یوں لگتا ہے کہ ان گن شدہ حقیقتوں کا اعتراف، ادراک ہوتا ہے۔ جو ہمارے ارد گرد

ہوتی ہیں، لیکن ہم اپنی کوتاہ نظمی سے انہیں نہ دیکھ پاتے ہیں نہ سمجھ پاتے ہیں۔“ میں نے اپنے جذبات کا اظہار

کیا۔ ”اسلام کے اصول اگر سادگی سے، پیار سے سمجھائیں تو پھر دین سے دوری بھی ختم ہو جائے گی اور معاشرہ

سچ سچ ایک اٹرنڈ پر عامل کی طرح دیگر معاشروں کے لئے ایک مثال بن جائے گا۔!“

”خزینہ میاں ہر درس اثر بر ہوتا ہے۔ لیکن کامل اثر پزیری کے لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا

جائے۔ زبانی سراپنے کے بجائے عملی طور پر اس کو حقیقت بنایا جائے۔!“ انہوں نے مجھے بہت غور سے

دیکھا۔ اور مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں بہت پیار، نہایت نرمی تھی۔ سردیوں کی صبح کی دھوپ جیسی، زندگی

آميز حرارت لے۔

اتنی دیر میں خادم چائے لے آئے۔ وہی مخصوص خوشبو، جو اس خانقاہ کا خاصا سہمی۔ ہم نے چائے پی۔ پھر

قادری سرکار سے اجازت لیکر باہر نکل آئے۔

”دیکھا تم نے۔۔۔!“ قدیر نے کمرے سے باہر نکلتے ہی کہا۔ ”قادری سرکار نے ہماری دعوت قبول

فرمائی۔ مجھے ان پر یقین تھا۔!“

میں نے قدیر کو غور سے دیکھا۔ اس کا گندی چہرہ یقین کی آگ سے دک رہا تھا۔ سادہ اور سچے لوگ اپنے

معاملات میں کس قدر پر یقین ہوتے ہیں۔ ان کا یقین ہی ان کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔

”کیا سوچ رہے ہو۔؟“ قدیر نے چابی انیٹیشن ہول میں گھمائی۔ گاڑی کا انجن ایک جبر جبر آہٹ لیکر

بیدار ہو گیا۔

”کچھ نہیں۔۔!“ میں نے کہا۔ ”سوچنے کو رکھا کیا ہے۔؟“
 ”ہاں اب کیا سوچنا۔۔۔!“ قدر ہنسا۔ ”خلیفہ کے منصب پر فائز ہو گئے۔ قادری سرکار کی نگاہوں میں آ گئے۔ کتاب کے مصنف بن گئے۔ گویا راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔۔۔!“
 ”یار مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے خالی ہوں۔۔۔!“ میں نے جواب دیا۔
 ”خالی پن کو بھرنے کے لئے ہی تو دنیا کا سارا جھمیلا ہے۔۔۔!“ قدر ہنسا۔
 باتوں باتوں میں راستہ کٹ گیا۔ گھر آ گیا۔ میں گاڑی سے باہر نکل آیا۔ ”تم اندر نہیں آؤ گے کیا۔؟“ میں نے اسے گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔
 ”یار یہ کارڈ اماں کو دیدیتا۔!“ اس نے ایک کارڈ میری طرف بڑھایا۔ ”مجھے ذرا اور بھی کارڈ بانٹنے ہیں۔!“

”خود دو اماں کو کارڈ مہیاں پلشر۔۔۔!“ میں نے کارڈ پکڑنے سے صاف انکار کر دیا۔
 ”اچھا۔۔۔!“ وہ کارڈ لیکر باہر نکل آیا۔ اس نے گاڑی لاک کی۔ اتنی دیر میں، میں اطلاعی کھنٹی بجا چکا تھا۔ دروازہ کھولنے والی موی تھی۔
 ”اچھا ہوا آپ آ گئے۔ اتنی زور کی بھوک لگ رہی تھی کہ بس۔۔۔!“ وہ بلا ٹکان بولنا شروع ہوئی تھی کہ اس کی نظر میرے عقب میں کھڑے ہوئے قدر پر پڑی وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ اور دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میں اور قدر گھر میں داخل ہوئے۔ اماں حسب معمول دالان میں تھیں۔ اور اپنے وظیفے میں مشغول تھیں۔

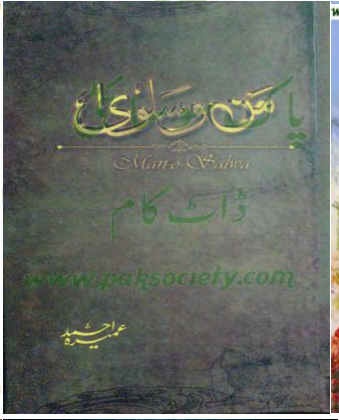
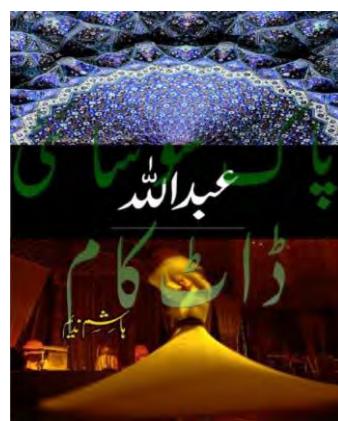
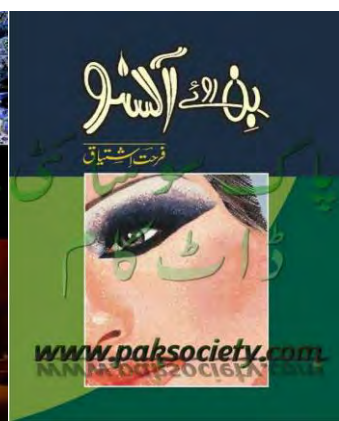
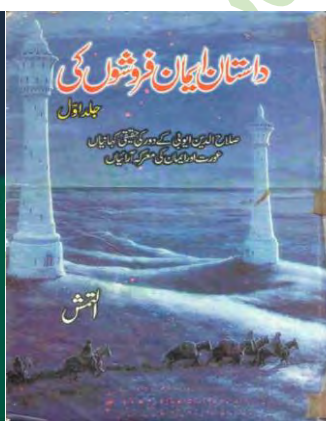
”اسلام علیکم“ میں نے اور قدر نے انہیں سلام کیا۔
 ”ولیکم اسلام۔“ انہوں نے سنج ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا۔ ”چلو جلدی سے ہاتھ دھولو، موی کو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ اب تک تمہارے انتظار میں دروازے کے پچاسیوں چکر لگا چکی ہے اور تم حسب معمول اپنا مو بائل گھر پر چھوڑ گئے تھے۔“ اماں کے انداز میں پیار بھری ڈانٹ تھی۔
 ہم لوگ ہاتھ دھو کر آئے تو کھانا چٹا ہوا تھا۔ ہم لوگ کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ ہمیں خادم حسین کے گاؤں سے واپسی کو ابھی تیسرا دن تھا۔ موی بے شمار باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آتے ہی کتاب کی تقریب رونمائی کے کاموں میں لگ گئے۔ یوں گھر پر زیادہ وقت دینے کا موقع ہی نہ ملا۔
 کھانے کے دوران ہلکی ہلکی گفتگو چلتی رہی۔ پھر قدر اماں کو کارڈ دے کر رخصت ہونے لگا۔

میں نے اس کو خدا حافظ کہتے ہوئے کہا۔ ”یار کارڈ خادم حسین، تاج ورا اور کشور کو بھی بھیج دینا۔!“
 ”فکر نہ کرو عبد اللہ شاہ گیلانی سمیت تمام لوگ ہی میری فہرست میں شامل ہیں۔۔۔!“ قدر نے مجھے تسلی دی۔ اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔
 میں قدر کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ باورچی خانے سے آتی ہوئی نرمس کی آواز نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔

”دیکھا آج بھی انہوں نے ایک لمبے کے لئے بھی تمہیں مخاطب نہیں کیا۔!“ میرا تجسس بڑھ گیا۔ کسی کی بات چھپ کر سننا معیوب ہونے کے باوجود میں وہیں کھڑا رہا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ کونسا ہم نے کبھی باتیں کی ہیں۔!“ موی کی آواز سنائی دی۔ ”اماں اور بھائی ہی مناسب فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میں تو کبھی بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اور مجھے معلوم ہے کہ وہ بھی کبھی نہیں کہیں گے۔ وہ اماں اور بھائی کے احترام میں کچھ نہیں بولیں گے۔ کچھ بحثیں موی شمعوں کی طرح ہوتی ہیں، جو شب بھر جل کر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ختم ہو جاتی ہیں۔“

دونوں چپ ہو گئیں۔ صرف برتنوں کے دھونے اور رکھنے کی آوازیں آتی رہیں۔ میں آہستہ قدموں سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ ”موسیٰ نفی بڑی ہو گئی۔ سمجھا رہو گئی ہے۔ اتنی بڑی کہ جذبے اس کے اندر انگڑائیاں لینے لگے، اور سمجھ دار آتی کہ اپنے جذبول پر ضبط کی قدرت رکھے ہوئے ہے۔ میں اپنے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ تب ہی جیسے اچانک میرے ذہن میں قادری سرکار کے درس کے جملے گونجنے لگے۔

”آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عزیز ترین صحابہ اجمعین کی دلجوئی، ان کی محبت، ان کے پیار، احترام کے لئے ان سے رشتے دار یاں قائم فرمائیں۔ دلی تعلق کا ایک مظہر رشتے لینا، رشتے دینا بھی ہوتا ہے۔ لیکن ہم کیا کرتے ہیں۔ ہم اپنے دوستوں سے رشتہ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ دیکھے بھالے شخص کو اس لئے طلاکاروں کی فہرست سے نکال دیتے ہیں کہ وہ ہمارا دوست، ہمارا محلے دار تھا۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ ہم اچھے، دیکھے بھالے رشتے سے محروم تو ہوتے ہی ہیں۔ نادانستگی میں دل آزاری کا سبب بھی بنتے ہیں۔“

میں ایک دم پسینے پسینے ہو گیا اور بیڈ سے اٹھ بیٹھا۔ قادری سرکار نے آج جو درس دیا تھا۔ شاید میرے لئے ہی تھا۔ تب ہی تو انہوں نے کہا تھا۔ ”کامل اثر پذیری کے لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ زبانی طور پر سنا ہونے کے بجائے عملی طور پر اس کو حقیقت بنایا جائے۔“

میرے سامنے کی باتیں مجھے اتنی دیر سے کیوں سمجھ میں آتی ہیں۔ مجھے معلوم ہو جانا چاہیے کہ قادری سرکار براہ راست کچھ نہیں کہتے۔ دلجوئی کے لئے ہمیشہ تمثیل کی صورت میں گفتگو کرتے ہیں۔ میں کتنا نا اہل ہوں۔ احساس بے بسی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور آواز آئی۔ ”تذلیل بیٹے۔!“

”جی اماں۔۔۔!“ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اماں بیچ پڑے باہر کھڑی تھیں۔ میں ان کا ہاتھ تمام کے انہیں اندر لے آیا۔ وہ میرے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ ”کیا نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے تمہارے کمرے کی جتنی جلتی دیکھی تو ادھر آ گئی۔!“

”جی اماں نیند نہیں آ رہی تھی۔!“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تم رورہے تھے۔؟“ اماں نے مجھے فور سے دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔؟“

اماں کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرا دل بھرا آیا۔ میں ان کے گھٹنے سے سر ٹیک کے خوب رو دیا۔ وہ کچھ نہ بولیں۔ بس مجھے تسلی دیتی رہیں۔ سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد میری طبیعت بحال ہوئی۔ میں نے انہیں آج کے درس کے بارے میں بتایا پھر میں نے کہا۔ ”اماں موسیٰ کے لئے آپ نے کیا سوچا۔؟“

”دو ایک لوگوں نے کہا تو ہے رشتے کے لئے۔“ اماں نے کہا۔ ”وہ آئندہ اتوار کو آئیں گے۔ وہ تو بھولی اتوار کو آنا چاہ رہے تھے۔ مگر تمہاری عدم موجودگی میں، میں نے انہیں نہیں بلایا۔“

”اماں۔۔۔!“ میں نے کہا۔ ”اتنے رشتے آرہے ہیں۔ کیا قدر کے گھر والوں نے آپ سے کبھی کچھ

کہا۔؟“

”نہیں۔۔۔!“ اماں نے نفی میں جواب دیا۔

”اگر قدر کار رشتہ آجائے تو کیا بھڑ نہیں رہے گا۔؟“ میں نے کہا۔ ”نئے رشتے میں اگر کوئی پسند بھی آ گیا تو اس کی دیکھ بھال، پوچھ پرہیز میں کتنا وقت لگے، پھر کسی کے کردار کا کیا بھروسہ، جو ظاہر ہوتا ہے بعض

ادوات بکریں ہوتا۔“

192

” کہتے تو تم ٹھک ہو بیٹا۔ لیکن جب تک کوئی خود سے نہ کہے ہم کیا کر سکتے ہیں۔!“ اماں نے جواب دیا۔
یعنی اگر قدر کے گھروالے آئیں تو آپ انہیں منح نہیں کریں گی۔؟“ میں نے پوچھا۔
” قدر دیکھا بھالالڑکا ہے۔ اچھا کھا تا کھاتا ہے۔ گھروالے سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ اس لئے اگر وہ رشتہ
مانگیں گے تو انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔!“ اماں نے جواب دیا۔ ”لیکن آج تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے
ہو۔؟“

” ایسے ہی۔۔۔!“ پتا نہیں کیوں میں ہلکا چھلکا ہو گیا۔ اماں مسکرائیں اور مجھے ایک پیار بھری چپت رسید
کراٹھ نکلیں۔ میں بے حد سرشار تھا۔ آج میں نے موی کو وہ خوشی دیدی کہ جس کا اس کے گمان میں شاید بھی نہ
ہوگا۔ میری اکلوتی نازوں کی بہن، جس نے ہمیشہ ہمیں پیار دیا۔ مان دیا۔ آج میں نے اس کی محبت کو، اس
کے اعتبار کو بجالایا تھا۔

☆☆☆

صبح میری آنکھ فون کی تیل ہی سے کھلی۔ ”اسلام علیکم!“ میں نے نیند بھری آواز میں کہا۔
”کیا بات ہے ابھی تک سوئے جا رہے ہو معلوم نہیں کتنا کام ہے نواب صاحب۔!“ دوسری طرف سے
قدر کی آواز سنائی دی۔ ”سارے شہر کو کارڈ بانٹتے ہیں۔!“
”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہو رہا ہوں۔ آ جاؤ مجھے لینے۔!“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ساڑھے دس بج
رہے تھے۔ میں بڑی تیزی سے نہا کر تیار ہو کر جانے بی رہا تھا کہ قدر کی کار کا ہارن سنائی دیا۔
”بھائی وہ قدر آئے ہیں۔!“ موی نے مجھے مطلع کیا۔
”ادھر آؤ۔!“ میں نے اسے بلایا۔

”جی بھائی۔۔۔؟“

”بس ایک بات یاد رکھنا کہ تمہارا بھائی تمہارے لئے ہر خوشی لائے گا۔ اپنی جان کی قیمت پر بھی۔!“
”جی ای سی۔۔۔!“ موی کی حیرت دیدنی تھی۔ ”آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟“
”جلدی سمجھ جاؤ گی۔!“ میں نے اس کے سر پر پیار سے چپٹ لگائی۔ اور گھر سے باہر نکل آیا۔
قدر مسلسل ہارن بجائے جا رہا تھا۔ ”بس بھی کرو۔!“ میں نے کہا۔ ”کیا بیٹری ڈاؤن کر دے۔؟“
”یاد دیر ہو رہی ہے۔ جمالی، غزالی آشفقہ سب ہی کو کارڈ دینے ہیں۔“ قدر نے کہا۔ اور گاڑی آگے
بڑھادی۔

”ایک کارڈ اور چھاپ لو۔!“ میں نے کہا۔

”کون سا کارڈ۔!“ اس نے سی ڈی پلیئر آن کرتے ہوئے پوچھا۔

”اپنی شادی کا۔۔۔!“ میں نے جواب دیا۔

”کیا بک بک کر رہا ہے۔۔۔۔۔ ٹپٹے۔!“ قدر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”حد ادب۔۔۔ بد تیز۔۔۔ بد تہذیب۔۔۔ دنیا میں کسی ہونے والے بہنوئی نے اپنے مجوزہ سالے کے
ساتھ ایسی ہرزہ سرائی نہیں فرمائی ہوگی۔!“

”کیا۔۔۔؟“ قدر نے اس زور سے بریک لگائے کہ پوری گاڑی گھوم کے رہ گئی۔ خود میرا سڑش بورڈ

سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟“

”جو تم نے سنا۔۔۔!“ میں نے کہا۔ ”قادری سرکار کیا فرماتے ہیں۔ تعلق کو جب تک کوئی نام نہیں دیا

جاتا وہ معلق ہی رہتا ہے۔!“

”تم۔۔۔ تم۔۔!“ قدیر نے اچانک کھنچ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”بڑا کمینہ ہے۔ تو بڑا دھوکے باز ہے۔ سب کچھ جان کر بھی انجان بنا رہا۔ تیرا دل بہت بڑا ہے۔ سچ سچ قادری سرکار کا خلیفہ ہے تو۔ خلیفہ جی۔۔۔!“ اس کے گرم گرم آنسو میرا سینہ، میرا دل بھگونے لگے۔

”چل بھی چل پورے شہر کو کارڈ بانٹنے ہیں۔!“ میں نے کہا۔

قدیر نے ہنستے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی۔ ہم لوگ سارا دن کارڈ بانٹتے رہے۔ شام کو قدیر نے جب مجھے گھر چھوڑا تو بولا۔ ”اماں سے کہہ دینا کہ کل شام کو امی آئیں گی۔!“ اور میرے کچھ کہنے سے قل ہی گاڑی آگے بھاگ لے گیا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ میں گھر میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

حکمران جماعت کا یہ ایک غیر معمولی اجلاس تھا۔ جس میں صرف خاص خاص لوگ ہی شامل تھے۔ یہ وہ بااثر افراد تھے۔ جنہوں نے پارٹی کو ناصرف سپورٹ کیا تھا، بلکہ ان کے زیر اثر کئی ایم این اے اور ایم پی ایز تھے۔ پھر یہ سب دیگر پارٹیوں پر، رشتوں اور بڑوں کی صورت میں خاصا اثر رکھتے تھے۔ اجلاس کا ایجنڈا بہت مختصر تھا۔ پارٹی کی گرتی ہوئی ساکھ اور اس کے طرز حکمرانی سے جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ عوام اور خواص دونوں ہی اس سے نالاں تھے۔ اس خصوصی اجلاس میں سردار حیات اللہ کو بھی بلایا گیا تھا۔ وہ پارٹی کا سب سے اہم فناسر تھا۔

اجلاس شروع ہوا۔ چند رسمی تقریروں کے بعد پارٹی سربراہ نے کہا۔ ”اختلافات رائے کو ہمیشہ پارٹی میں اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن ناراضگی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ پارٹی چھوڑ دی جائے۔ کسی معاملے اور مسئلے میں خرابی اگر اس کی بدانتظامی یا کم فہمی کی وجہ سے ہو تو اس کو ٹھنڈے دل سے سنبھالنا چاہیے۔ اگر آپ لوگوں نے پارٹی کو پسپا دیا ہے۔ تعلقات استعمال کر کے اس کو لوگ دیئے ہیں۔ تو یہ ناہوشی ہے کہ پارٹی نے ہزاروں کی جگہ لاکھوں اور لاکھوں والوں کو کوڑوں کما کے بھی دیئے ہیں۔ اس لئے پرسکون رہنا بہت ضروری ہے۔“ پارٹی سربراہ نے کہا اور ان کی طرف دیکھا۔

ایک سینئر وزیر نے کہا۔ ”آپ کی تمام باتیں بجا، لیکن ہمیں افسوس وزیراعظم صاحب کی کج فہمی کا ہے۔ یہ معاملے کو بگاڑنے کے بعد سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اس کو سنبھالتے سنبھالتے بالکل ہی ختم کر دیتے ہیں۔“

”تو پھر کیا کریں۔۔۔؟“ پارٹی سربراہ نے ان سے پوچھا۔ ”یہ وقت پارٹی بچانے کا ہے۔ عوام میں اپنی ساکھ بحال کرنے کا ہے۔ ہمیں مضبوط اور سخت فیصلے کرنے پڑیں گے۔ چاہے اس میں کوئی خوش ہو یا ناراض۔“ پارٹی سربراہ نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”آپ میری طرف سے آزاد ہیں مکمل کے اپنی رائے دیجئے۔!“

”میرا خیال ہے۔۔۔!“ وزیر خزانہ نے کہا۔ ”ہمیں عوام کے سامنے اپنا پروگرام رکھنا چاہیے، اور ایک ایسی شخصیت کو سامنے لانا چاہیے جس کے اوپر لوگوں کو اعتماد ہو، جس کے متعلق لوگوں کو یقین ہو کہ وہ کچھ ہمارے لئے کر سکتا ہے۔“

”آپ لوگ تجویز کریں۔!“ پارٹی سربراہ نے کہا۔ ”یہ فیصلہ مشترکہ رائے کے بعد ہی کیا جائے گا۔!“

”میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم صحیح فیصلے کریں اور ان لوگوں کو آگے لائیں جو بغیر کسی لالچ کے پارٹی کے ساتھ ہیں اور جن کے متعلق یہ کہا جاسکے کہ وہ قائد ایوان بننے کے بعد بھی کسی ممبر کی دھونس دھمکی میں

آنے کے بجائے اجتماعی مفاد کو سامنے رکھ کر فیصلے کریں گے۔“ پارٹی کے سینئر نائب صدر نے کہا، اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ”میری نظر میں ایسی بااعتماد اور موزوں شخصیت شاہ ہارون گیلانی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔“

سینئر نائب صدر کے نام تجویز کرتے ہی سب بیک وقت بولنا شروع ہو گئے۔ یوں لگا کہ جیسے سب ہی کچھ نہ کچھ کہتا چاہ رہے ہوں۔ چند منٹوں تک یہی صورت حال رہی۔ پھر پارٹی سربراہ نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کیا۔ ”اطمینان سے باری، باری اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔ اس طرح تو کسی کا بھی نکتہ نظر واضح نہیں ہو گا۔“

”بالکل ٹھیک۔۔!“ سینئر نائب صدر نے کہا۔ ”جو لوگ شاہ ہارون گیلانی کے نام پر متفق ہیں وہ ہاتھ اٹھائیں تاکہ چند ہی منٹوں میں فیصلہ ہو جائے۔!“

اتنا سنتے ہی سب نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پھر اچانک ہی سب بولنے لگے۔

”ہارون۔۔۔ ہارون۔۔۔ ہارون۔۔۔ ہارون۔۔۔!“

شاہ ہارون گیلانی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پارٹی سربراہ نے بڑے غور سے ان کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی، مگر ان کا چہرہ ہر دم کے جذبات سے عاری تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ شاہ ہارون گیلانی اس پر کوئی رائے دیں۔!“ پارٹی سربراہ نے کہا۔

اچانک جیسے خاموشی چھا گئی۔ تمام نگاہیں شاہ ہارون گیلانی پر مرکوز ہو گئیں۔ شاہ ہارون گیلانی نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ سب ان کو سننے کو بے قرار تھے۔ انہوں نے نہایت نپٹی تلی زبان میں کہا شروع کیا۔ ”آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے گزشتہ پچیس برسوں میں کبھی کسی عہدے کا لالچ نہیں کیا۔ نہ کوئی وزارت طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مالی معاملات سے آسودہ رکھا ہے۔ جو کچھ ہوسکا ہم نے پارٹی کے لئے، وطن کے لئے کیا اور آئندہ بھی یہی ہوگا۔ مگر آپ لوگ میری شخصیت کے پہلو جانتے ہیں۔ میں ضدی ہوں۔ کام کے معاملے میں بالکل کھرا ہوں۔ میرٹ کے علاوہ میں کوئی سفارش نہیں مانتا۔ نہ خود بدعنوانی کرتا ہوں، نہ کروں گا اور نہ ہی کسی کو کرنے دوں گا۔ اپنی پالیسی بناؤں گا اور اس پر عمل درآمد کرواؤں گا۔ اس معاملے میں کوئی کچھ کہے گا تو میں نہیں سنوں گا۔ اب دیجئے اپنی رائے۔۔۔!“ انہوں نے بڑے سکون سے کہا اور اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

ان کی باتیں سن کر لمحہ بھر کے لئے یوں لگا کہ جیسے ان سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ بے پناہ خاموش تھے۔ پھر اچانک سینئر نائب صدر نے تالی بجاتی۔ دو تین۔ چار۔۔۔ اور پھر سب نے کھڑے ہو کر تالیاں بجاتا شروع کر دیں۔ گویا وہ سب ہارون گیلانی سے متفق تھے۔ ان تالیوں کی گونج میں فیصلہ ہوا کہ شاہ ہارون گیلانی پارٹی کے آئندہ وزیر اعظم کے طور پر عوام کے سامنے لائے جائیں گے۔ جس کی پارٹی سے وفاداری، ملک سے پیار کو کسی صورت بھی کسی اور سے تقابل نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی پارٹی میں وہ ہی ایسی شخصیت تھے جنہوں نے اپنے بھائی کو قربان کر دیا تھا۔ اور عوام ان کے والد و شیدا تھے۔ پھر مٹنی انتخاب میں انہوں نے ایک پڑھے لکھے عام شخص کی حمایت کر کے اس کو عوامی نمائندہ بنوایا۔ اس سے وہ عوامی سطح پر بے حد محترم ہو گئے تھے۔ پارٹی جس مرشدین کو سامنے لانا چاہ رہی تھی، وہ اس کو مل گیا تھا۔ شاہ ہارون گیلانی کی صورت میں۔

سب ہارون گیلانی کو مبارکباد دینے لگے۔ ان سے ہاتھ ملانے لگے، گلے ملنے لگے۔ سینئر نائب صدر نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملا یا اور پھر ان سے بڑی گرجوشی سے گلے ملتے ہوئے ان کے کان میں بولا۔ ”ہارون صاحب اپنے اس خیر خواہ کو یاد رکھئے گا۔!“

شاہ ہارون گیلانی نے بے پناہ حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ تھا۔ وہ پراسرار مددگار۔ جس نے ہر اہم موقع پر

ان کی راز ہنمائی کی تھی۔ وہ مسکرا دیئے اور بولے ”شاہ ہارون گیلانی کے خون میں احسان فراموشی نہیں ہے۔“
 سینئر نائب صدر مسکرایا اور ان کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ پہلا آدمی تھا۔ جس نے مستقبل کے وزیر اعظم
 کو مٹا کر لیا تھا۔ سیاست میں غیر متوقع چال کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ بازی ہارنے کے بجائے جیت کر ایسی جگہ
 بٹھا دیتی ہے کہ جہاں سے کامیابی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ اور جو اس چال کا ادراک نہیں کر پاتے وہ پھر ہمیشہ
 موقع کی تلاش میں رہتے ہیں، اور کامیابی ان سے یوں بھاگتی ہے جیسے چھوت کے مریض سے صحت مند
 لوگ۔۔!

دار الحکومت سے واپسی پر نجانے کیوں شاہ ہارون گیلانی کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ جیت کے لالچ میں
 بہت کچھ گنوا بھی چکے ہیں۔ دل کے اندر کے احساسات بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ ان کے اعداد سے کوئی
 بھاگ نہیں سکتا۔ کبھی ضرب سے تقسیم ہو جاتے ہیں اور کبھی مٹتی ہیں۔ دل کے اندر کے
 حساب میں صفر نہیں ہوتا۔ وہ، وجود کو صفر کر دیتے ہیں۔
 وہ جو پہلی پہنچے تو ان سے پہلے ان کی خبریں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ سب ان کا بے چینی سے انتظار کر رہے
 تھے۔ کوئی مٹھائی لئے کھڑا تھا، کوئی ہار پھول لئے منتظر تھا۔ ان کے استقبال کو سب ہی آئے۔ چھوٹے بڑے
 اپنے اور غیر۔ مگر عبداللہ شاہ گیلانی نہیں آیا۔
 انہوں نے سگار سگاتے ہوئے، بڑے قیمتی لائٹر کے شعلے کو دیکھتے ہوئے بہت سرسری انداز میں پوچھا۔
 ”عبداللہ کہاں ہے۔؟“

نازاں نے انہیں دیکھا۔ وہ اس کے بجائے لائٹر سے نکلنے ہوئے نیلے شعلے کو دیکھ رہے تھے۔

”وہ انیکسی میں ہیں۔!“ نازاں نے جواب دیا۔

”اگر وہ فارغ ہو تو مجھ سے مل لے۔!“ پہلی بار انہوں نے کسی کی طلبی میں جواز کو اہمیت دی، ورنہ وہ تو
 صرف غیر مشروط حکم دینا ہی جانتے تھے۔

”وہ کبہ رہے ہیں کہ آپ اگر ملنا چاہتے ہیں تو صرف ایک ہی شرط ہے کہ آپ ان کی بات مان لیں
 گے۔!“

”کیا بات منوانا چاہتا ہے۔؟“ شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔ ”کچھ کہے گا تو ہی بتا چلے گا۔!“
 ”میں آپ دونوں کے درمیان نہیں آنا چاہتی۔ بہتر ہے کہ آپ لوگ خود ہی مل بیٹھیں۔ مجھے تو کسی حقیقت
 کا، کسی معاملے کا علم ہی نہیں۔!“ نازاں نے اطمینان سے جواب دیا۔

اسی وقت عبداللہ شاہ گیلانی اندر داخل ہوا۔ ”ہمیشہ بڑوں کا احترام ہی سیکھا، اس لئے خود آ گیا ہوں
 ۔ میری شرط یہ ہے کہ آپ وہ چھن کر وڈا روڈ واپس لائیں جو آپ کے غیر ملکی اٹاٹے ہیں۔ اس ملک کو پیسے کی
 ضرورت ہے۔ وہ پیسہ جس کو جیج کرنے کے لئے کوئی حساب کوئی کتاب نہیں رکھا گیا۔“

انہوں نے غور سے دیکھا۔ عبداللہ شاہ گیلانی انہیں اپنی بے حد چمک دار آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ان
 آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ انہیں ایسا لگا کہ جیسے ان کے سامنے عبداللہ شاہ گیلانی نہیں، سکندر شاہ گیلانی
 کھڑے ہوں اور انہیں دیکھ رہے ہوں۔ ان سے حساب کرنے آگئے ہوں۔ ان کی نگاہیں جھک گئیں۔

انہوں نے کہا۔ ”اگر میں تمہاری بات مان لوں تو تم جاؤ گے تو نہیں۔؟“

”نہیں۔۔!“ عبداللہ شاہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ساتھ ہی اس نے فون شاہ ہارون گیلانی کی

طرف بڑھایا۔

”یہ کیا ہے۔؟“ انہوں نے عبداللہ شاہ گیلانی کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اور فون تقام لیا۔

”کسی سے، کسی کی آخری گفتگو۔!“ اس نے سرسری انداز میں کہا اور تیزی سے واپس چلا گیا۔
شاہ ہارون گیلانی صوفے پر یوں دھم سے بیٹھے کہ جیسے کسی نے ان کے گھٹنوں سے اچانک توانائی کھینچ لی

ہو۔

قدرت بھی کیا کیا کر شے دکھاتی ہے۔ کامیابی اور تنہائی ساتھ ساتھ چلاتی ہے۔ آج انہیں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ انہیں شکست ہوئی ہے۔ وہ بھی ہر محاذ پر۔ گھر میں بھی، سیاست میں بھی۔ بظاہر وہ ہر جگہ کامیاب تھے۔ مگر صرف ملمع کاری سے، انہیں تو ایک بور یہ نشین نے شکست دی تھی۔ دو طرفہ مات، اپنی دعا اور تربیت دونوں سے۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ ان کی بیگم اندر آئیں تو وہ اسی حال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دبے پاؤں واپس چلی گئیں۔ وہ ان کے خیالات کے درمیان مخل نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ شاہ ہارون گیلانی کو احساس تک نہ ہوا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہیں۔

☆☆☆

میں نے اماں کو بتایا کہ قدرے گھروالے آج شام کو آرہے ہیں۔
”کیا تم نے بات کی تھی؟“ اماں نے پوچھا۔ ”اس نے اچانک ہی یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔؟“
”اماں۔۔۔!“ میں نے اماں کے پاس بیٹھ کر کے ان کے پاؤں دبانے شروع کئے۔ میں اس وقت رات کے کھانے بعد اماں کے کمرے میں تھا۔ مومی چائے دے گئی تھی۔ جب سے زنگس آئی تھی۔ وہ چائے دیکر تھوڑی ہی دیر میں چلی جاتی تھیں۔ ”ہوسکتا ہے کہ اس کے دل میں خیال ہو، اگر دوستی اچھی ہو تو اس کو مضبوطی کے رشتے میں باندھنے کا خیال آہی جاتا ہے۔ بقول آپ کے کہ اوگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ۔ جو پہلے ہی خواہش رکھتا ہو، اس سے اظہار مدعا میں کیا مانع۔؟“

میں نے مومی کی دلی آرزو، اماں کو نجانے کیوں بتانے سے گریز کیا۔ کچھ ننھے ننھے راز چھپانا اچھا لگتا

ہے۔

”یہ خوشی کی بات ہے۔“ اماں نے کہا۔ ”اللہ کے فضل سے یہ معاملہ خیر و عافیت سے طے ہو جائے تو پھر دوسرا معاملہ بھی طے کرتے ہیں۔!“

ان کا اشارہ واضح طور پر میری جانب تھا۔ میں ان سنی کر گیا۔
تھوڑی دیر میں اماں نے کہا۔ ”جاؤ بیٹا آرام کر لو۔ مسلسل کئی دنوں سے مصروف ہو۔ آج بھی سارا دن ہی کارڈ بانٹنے رہے۔ اللہ پاک میرے بچے کو بہت ساری کامیابیاں عطا کرے، نظر بد سے بچائے۔!“ انہوں نے دعادی۔ اور فکسرا کے مجھے شب بخیر کہا۔ میں نے انہیں سلام کیا اور رات کی مدہم روشنی کا نیلگوں پلب روشن کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

صبح ناشتے کے بعد اماں نے زنگس اور مومی سے کہا کہ ذرا گھر کی جھاڑ پونچھ کر لیں۔ اور شام کے کھانے کے لئے بھی کچھ اہتمام کر لیں۔ فرج میں مرغی، مچھلی، گوشت سب کچھ موجود ہے۔ پلاؤ اور کباب شامی بنا لیتا۔ ٹیبلے میں شاہی کٹڑے اور فیئرٹی بنا لیتا۔ باقی جو تمہارا دل چاہے۔!“

”اب بھی کچھ بچا ہے۔؟“ مومی ہنسی۔ ”کوئی خاص مہمان آرہے ہیں کیا۔؟“
”مہمان تو مہمان ہی ہوتے ہیں۔ اللہ کی رحمت کیا خاص کیا عام۔!“ اماں نے جواب دیا۔
”یعنی کہ آپ کا بتانے کا دل نہیں۔!“ مومی فوراً ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اماں ہنس دیں۔ زنگس مسکرائی۔

”اماں اگر کوئی پھل وغیرہ منگوانے ہو تو بتا دیجئے۔ میں لیتا آؤں گا۔ بلکہ میں شام کو جلد ہی آ جاؤں

گا۔!“ میں نے کہا۔

”ہاں یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ تمہاری تقریب جتنے کو ہے نا۔!“ اماں نے میری بات سن کر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ یوں ہلکی پھلکی گفتگو اور صبح ناشتے کی بعد کی محفل برخواست ہو گئی۔

☆☆☆

شامد کچھ وقت، کچھ لمحات ہمیں بہت زیادہ خوشیاں دیتے ہیں، حالانکہ ساعتیں وہی ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے احساسات کا رخ بدل جاتا ہے۔ شام تو برسوں سے اس گھر میں آرہی تھی۔ مگر آج اس شام کا سن ہی کچھ اور تھا۔ اماں بہت ہشاش بشاش تھیں۔ مجھے بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں پھل وغیرہ لیتا ہوا ساڑھے تین بجے ہی گھر آ گیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے مومی سے ایک گرم ماگرم چائے کی فرمائش کی، تو تھوڑی دیر میں وہ چائے کے ساتھ ساتھ گرم گرم نمک پارے اور سوسے لے آئی۔ مجھے واقعی بھوک سی لگ رہی تھی۔ میں اماں کے کمرے میں ہی تھا۔ مومی چائے رکھ کر واپس چلی گئی۔ میں چائے پینے لگا۔ ساتھ ساتھ سوسے اور نمک پاروں سے محفل بھی جاری تھا۔ اچانک ایک بڑے سے پیکٹ پر میری نظر پڑی۔ یہ پیکٹ شامد میرے آنے سے پہلے آیا تھا۔ ورنہ میں نے صبح نہیں دیکھا تھا۔ ”اماں کیا کچھ منادیا ہے آپ نے۔؟“ میں نے پوچھا۔

”قادری سرکار نے بھیجا ہے۔!“ اماں نے بتایا۔

”اس میں کیا ہے۔؟“ میں نے تبس سے پوچھا۔

”معلوم نہیں، میں نے سوچا تمہارے سامنے ہی کھولوں گی۔!“ اماں نے کہا۔

”اچھا۔!“ میں نے جلدی جلدی چائے کے گھونٹ لیکر پیالی خالی کی، نشو سے پکٹے ہاتھ صاف کئے اور پیکٹ کھولنے لگا۔ پیکٹ کے اندر مزید پیکٹ اور دو سفید لفافے تھے۔ میں نے لفافے اٹھائے ان پر لکھا تھا۔ ”مومی بیٹی کے لئے بہت پیارے“ دوسرے پر لکھا تھا۔ ”قدیر بیٹے کے لئے بہت پیارے۔“ تیسرے چھوٹے پیکٹ میں ایک بہت خوبصورت سونے کی انگوٹھی تھی۔ پانچ سوٹ تھے۔ دو مردانہ، دو زنانہ۔ پانچویں پر لکھا تھا بھاگ بھری کے لئے۔ مجھے یاد آیا کہ بھاگ بھری قدیر کے ہاں کئی برسوں سے ملازمت کر رہی تھی۔ اسی طرح پانچ سوٹ دوسرے لفافے میں تھے۔ جن میں سے دو مردانہ اور تین زنانہ تھے۔ ایک لفافے پر لکھا تھا برائے دعوت۔ اس میں پانچ ہزار روپے تھے۔ دوسرے پر لکھا تھا برائے نرس اور مومی اس میں دس ہزار روپے تھے۔ دوسرے دونوں سفید لفافوں میں گیارہ ہزار روپے تھے۔ قادری سرکار کے ان تحفوں میں سب کے لئے، دونوں گھروں کے ہر فرد کا خیال رکھا گیا تھا۔

”یہ تو منگنی کا سامان ہے۔!“ اماں نے کہا۔

”لیکن کیسے ہوا۔۔۔!“ میں بے حد حیران تھا۔ ”قادری سرکار کی اتنی عنایات، اتنی محبتیں۔۔۔!“

”کیا وہ لوگ منگنی کریں گے۔؟“ میں نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔۔۔!“ اماں نے کہا۔ ”مگر ان سب چیزوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قادری سرکار کے

علم میں ہے کہ شامد وہ منگنی کی رسم ادا کرنا چاہیں گے۔!“

”یہ انگوٹھی تو یہی ظاہر کرتی ہے۔!“ میں نے کہا۔ ”اگر سرکار نہ بھیجے، اور وہ اپنی انگوٹھی نکال لیتے تو پھر کیا ہوتا۔؟“

”اگر ایسا ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔ میرے پاس انگوٹھی رکھی ہے۔ وہ پہنا دیتی۔!“ اماں نے کہا۔ مجھے اماں پر بے حد پیار آیا۔ ”میں کتنے چیکے چیکے اپنے بچوں کے لئے نجانے کیا کیا تیار کیا کرتی رہتی ہیں۔ کتنے خواب الماری میں، انچی میں، پاندان کی تھالی کے نیچے، بستر کے نیچے تھے، اور بچوں کے ڈبے میں سینت

سینت کے رکھے ہوتے ہیں۔

مگر اس وقت قادری سرکار نے جس طرح تحائف کی صورت میں ہمیں یاد رکھا، اس نے ہمیں خرید لیا تھا۔ وہ بہت اچھے پو پاری ہیں۔ محبت کے سکوں، توجہ کے موتیوں اور پیار کے داموں پر ہر دل کو خریدنے پر قادر۔ اماں کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی تھی۔ نہ میں نے کچھ کہا۔ نہ اماں نے۔ بس ہم دونوں چپ رہے۔ مغرب کی اذان کے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ قدریر اس کی امی، بہن اور ابو کھڑے تھے۔ پیچھے ان کی ملازمہ بھاگ بھری ہاتھوں میں ایک بڑا سا ٹوکرا لئے کھڑی ہوئی تھی۔ واضح طور پر وہ مٹھائی تھی۔

میں انہیں سلام کر کے اندر لایا۔ وہ سب اندر آگئے۔ اماں نے اپنے تخت سے اٹھ کر استقبال کیا۔ وہ سب بڑی گرم جوشی سے مزاج پرسی کرتے ہوئے بڑے بڑے کمرے میں آگئے۔ رسمی گفتگو کے بعد قدریر کی والدہ نے کہا۔ ”بہن، ہم آج آپ سے ایک درخواست کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ قبول فرمائیں گی۔“ انہوں نے ذرا رک کے کہا اور میاں کی طرف دیکھا۔ قدریر کے ابا ان کا مدعا سمجھ گئے۔ وہ بولے۔ ”بہن بات سیدھی اور مختصری یہ ہے کہ ہم لوگ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ دونوں گھروں کا رہن سہن، ملنا جلنا معلوم ہے۔ پھر قدریر اور حزیل بچپن کے دوست ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس دوستی کے رشتے کو مضبوطی دیں۔ اس لئے قدریر کے لئے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگتے آئے ہیں۔ بے دوجہ رسمی تکلفات کا کیا فائدہ۔ ہماری طرف سے تو بسم اللہ ہے۔ آپ کی ہاں کے منتظر ہیں۔“ قدریر کے ابا نے بڑی سادگی سے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

اماں خاموش تھیں۔

قدریر کی بہن نے کہا۔ ”خالہ جان انکار نہ کیجئے گا۔ مومی تو میرے بچپن کی سہیلی ہے اور اتنی پیاری سہیلی مجھے بھابھی کے روپ میں مل جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ میری اچھی خالہ جان۔“ نصرت نے بڑے لاڈ سے کہا اور اماں کے پاس آئی۔

”یہ سارے معاملے تو طے ہوتے رہیں گے پہلے آپ لوگ کھانا وغیرہ تو کھالیں۔“ اماں نے دھیمے سے کہا۔

”کھانا تو کھالیں گے، مگر پہلے کوئی خوش خبری تو سن لیں۔۔۔!“ قدریر کی والدہ نے خوش دلی سے کہا۔

”آپ کا ہی بچہ ہے دیکھا بھلا۔!“ اماں مسکرائیں۔ ”بچوں کی شادی کرنا تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ بھلا ہاں وہ تو ہے۔“ اماں نے بہت خوبصورتی سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

”تو پھر منہ میٹھا کیجئے۔“ قدریر کی امی نے برجستہ کہا۔ اور اپنے ہمراہ لائی ہوئی مٹھائی کا ٹوکرا کھول کے اس میں سے ایک لٹو نکالا اور اماں کے منہ کی طرف بڑھایا۔

اماں نے لٹو تمام لیا اور پہلے ان کو کھلایا، پھر خود کھایا، پھر اچانک ہی جیسے نصرت بولی۔ ”ارے یہ ہم خود ہی لٹو کھا رہے ہیں ذرا بھلا میں اپنی ہونے والی بھابھی کو تولے آؤں۔“ نصرت اٹھی اور باہر نکل گئی۔

قدریر کے والد نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی ڈبی نکالی، میز پر رکھی اور بولے۔ ”بہن بلا وجہ کی رسموں پر پیسہ ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ میں آپ کی اجازت سے بیٹی کی انگلی میں انگوٹھی پہنانا چاہتا ہوں۔ شادی کی تاریخ دے دیجئے۔ جہیز کی مجھے ضرورت نہیں۔ سلیقہ، ادب اور گھر داری کے قرینے سے بڑا جہیز کوئی

نہیں ہوتا۔ جب آپ حکم کریں گی بارات لے کر حاضر ہو جائیں گے۔“
 اماں نے میری طرف دیکھا میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ تھوڑی دیر بعد نصرت اور زگس سموی کو لئے
 اندر داخل ہو گئیں۔ شرم سے سموی دھری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرم، حیا اور مسرت کا بے حد
 خوبصورت امتزاج تھا۔ اسے لاکر بڑے صوفے پر بٹھا دیا۔ قدر کے والدین نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
 ان کی بیگم نے ایک زری کا دوپٹہ سموی کے سر پر ڈالا۔ انگلی میں انگوٹھی پہنائی۔
 میں نے قدر کو بازو سے تھاما اور لاکر سموی کے ساتھ بٹھا دیا۔
 امی نے قدر کو انگوٹھی پہنائی، اور ایک لگانہ قدر کی گود میں رکھا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس
 کو دعائیں دیں۔

میں نے دیکھا کہ قدر کے رویں روئیں سے مسرت کی روشنی نکل رہی ہے۔ ایسی ہی روشنی سموی کے بدن
 سے نکل رہی تھی۔ میں نے سر جھٹک کے دیکھا۔ مگر روشنی بدستور نکل رہی تھی۔ ”کیا خوشیاں ریمک کی صورت
 ہوتی ہیں۔۔۔؟ کیا خوشیاں سب کو دکھائی دیتی ہیں۔۔۔؟“
 ”نہیں تنزیل میاں۔۔۔!“ مجھے ایک جانی بچھائی نرم آواز سنائی دی۔ ”خوشیاں محسوس تو سب کو ہو سکتی
 ہیں۔ مگر ان کا ادراک اور ان کی روشنی صرف آنکھوں والوں کو ہی دکھائی دیتی ہے۔ جب اندر کی آنکھ کھل جاتی
 ہے تب۔!“ قادری سرکار کی وضاحت کے ساتھ ہی جیسے اچانک سب کچھ بدل گیا۔ اور روشیاں غائب
 ہو گئیں۔

”تنزیل بیٹے مبارک ہو آپ کی دوستی رشتے داری میں بدل گئی۔!“ قدر کے والد میرے پاس کھڑے
 کھد رہے تھے۔ میں اٹھا اور ان سے گلے ملا۔ پھر قدر سے گلے ملا۔ اور اسے مبارکباد دی۔ اس نے گلے لگتے
 ہوئے آہستہ آواز سے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ”شکریہ یار۔!“
 میں ہنس دیا۔

سموی چند منٹ بیٹھی رہی۔ پھر اماں کے اشارے پر زگس اور نصرت اسے اندر لے گئیں۔ اماں بھی اٹھ کر
 کھانے کا انتظام دیکھنے چلی گئیں۔ قدر کی والدہ بھی تھوڑی دیر بیٹھی رہیں پھر وہ بھی اندر چلی گئیں۔ گھر میں
 سب بول رہے تھے۔ ہلکا ہلکا شور ہو رہا تھا۔ جو مجھے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

قدر نے کہا۔ ”کل تقریب ہے، کافی لوگ آرہے ہیں۔ تمہیں بھی کچھ کہنا پڑے گا۔!“
 قدر کے ابا نے کہا۔ ”یہ پہلی کتاب ہے جو اس نے ایسی چھاپی ہے کہ بک رہی ہے۔ ورنہ ہمیشہ اس کو
 نقصان ہی ہوا۔ اس لئے میں سخت خلاف ہوں ایسی کتابوں کے۔!“
 ”ابا اللہ کا شکر ہے کہ پریس کی کوئی مشین کی کسی وقت بھی بند نہیں ہوتی۔ پھر یہ شوق تو علم و ادب کے لئے
 صدقہ جاریہ ہے۔ بڑے بڑے معروف لوگ اتنی سکت نہیں رکھتے کہ کتاب چھپوا سکیں، نام بڑا اور درشن
 چھوٹے۔ اگر ان کی کتاب چھپ جائے تو کیا مضائقہ۔“ قدر نے کہا ”علم و حرف پھیلانے والوں میں ہمارا
 نام تو لکھا گیا۔!“

قدر کے ابا ہنس دیے۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔!“
 اسی وقت قدر کے موبائل پر تیل ہوئی۔ قدر نے فون کی طرف دیکھا اور بولا ”ارے سرکار کا فون
 ہے۔!“

”اسلام علیکم۔!“ دوسری طرف سے قادری سرکار کی نرم آواز آئی۔ ”کہاں ہیں آپ۔؟“
 ”جی سرکار یہاں تنزیل کے گھر ہوں۔!“

”اچھا بھئی بہت بہت مبارک ہو آپ کو، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو خوش و آباد رکھے!“ انہوں نے دعا دی۔

”سرکار یہ سب آپ کی دعاؤں کے طفیل ہے۔!“ قدیر نے عاجزی سے کہا۔
 ”اچھا یہ بتائیے کہ آپ کی تقریب کا مہمان خصوصی کون ہے۔؟“ انہوں نے پوچھا۔
 جو ابا قدیر نے دو تین نام لئے مگر ساتھ یہ بھی کہا کہ ان میں سے کسی نے ابھی تک باقاعدہ حامی نہیں بھری ہے۔

قادری سرکار نے فرمایا۔ ”عبداللہ شاہ گیلانی کا فون آیا تھا۔ آپ کے کارڈز ان تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اگر کوئی مہمان خصوصی نامزد نہیں کیا ہے تو وہ شاہ ہارون گیلانی کو لانا چاہتا ہے۔ اگر آپ لوگ چاہیں تو۔!“

”بالکل ٹھیک جیسا سرکار کا حکم۔!“ قدیر نے فوراً جواب دیا۔
 ”یہ حکم نہیں بلکہ آپ لوگوں کی صوابدید پر منحصر ہے!“ انہوں نے نرمی سے کہا۔
 ”سرکار کی زبان سے اظہار ہونا بھی ہمارے لئے حکم ہے۔!“ قدیر نے کہا۔
 ”تاج در، کسور، غلام حسین، خادم حسین، حافظ سلمان، حنیف صحرائی وغیرہ بہت سے لوگ بھی آرہے ہیں۔ ان کے خلیفہ جی کی کتاب کی تقریب رونمائی جو ہے۔“ سندھیے جو کھو گئے، مگر لوگوں کو مل گئے۔!“
 انہوں نے نہایت معنی خیز بات کی اور سلام کے بعد فون بند کر دیا۔

”ستریل یار تو تو گیا شوں!“ قدیر نے کرمجوشی سے ہاتھوں کا تیر بنا کے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔
 جس تقریب میں قادری سرکار، شاہ ہارون گیلانی جیسے لوگ آرہے ہوں، جن کی پیشگوئی سے ایک عالم واقف ہے تو اس تقریب کی کورتج کے لئے میڈیا ٹاؤٹ بڑے گا۔ ہر چینل چاہے گا کہ مستقبل کے وزیر اعظم کی زیادہ سے زیادہ کورتج کرے اور ابھی سے بہتر تعلقات بنائے۔!“

”اللہ مالک ہے!“ میں نے جواب دیا۔ مجھے خوشی ہوئی۔ لیکن نجانے کیوں ایسا لگا کہ جیسے خوشی مجھے بے قابو کرنے کے بجائے میرے اندر جذب ہو گئی ہو۔

اسی وقت نرگس نے آکر کہا۔ ”کھانا تیار ہے تمام لوگ آجائیں۔!“
 کھانے کی ٹیبل پر سب اکٹھا ہو گئے۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مومی نہیں تھی۔ اس کو شرم آرہی تھی۔ بے حد خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ نرگس ہر معاملے میں پیش پیش رہی۔ کھانے کے بعد اماں نے سب کو تحائف دیئے۔ سب سے زیادہ خوشی بھاگ بھری کو ہوئی۔ اس نے بے شمار دعائیں دیں۔ تھوڑی دیر میں سب رخصت ہو گئے۔ جاتے جاتے قدیر کے والد کہہ گئے کہ ان کا ارادہ ہے کہ وہ نصرت کے ساتھ ساتھ ہی قدیر کی شادی بھی رکھ لیں تاکہ ایک بیٹی جائے تو دوسری آئے۔ اماں نے کہا کہ نصرت کی تاریخ جب کچی کر لیں تو انہیں بتادیں۔ اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔

ان کے جانے کے بعد جب اماں کمرے میں آئیں تو مومی وہیں موجود تھی۔ اماں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ مومی اماں کے گلے لگتے ہی رونے لگی۔ اماں خود بھی روتی رہیں۔ وہ بھی روتی رہی۔ نرگس تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہی پھر چلی گئی۔

میں وہیں بیٹھ گیا۔ میں اس وقت ان کے درمیان کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آنسوؤں کا اپنا ایک علیحدہ رشتہ، علیحدہ زبان ہوتی ہے۔ ان کے اپنے جذبات ہوتے ہیں۔ گرم ٹمکین پانی کے یہ قطرے بڑے دیا لو ہوتے ہیں۔ کبھی اندر کی کشافت باہر نکالتے ہیں۔ کبھی خوشی کی بجلیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں، کبھی کوئی

منہاس دے جاتے ہیں۔ کبھی شکوے کا عنوان بن جاتے ہیں۔ کبھی تسلی، کبھی مرہم، کبھی پھاہا بن جاتے ہیں۔ گرم نمکین پانی کے قطرے بڑے دیا لو ہوتے ہیں۔
 تھوڑی دیر کے بعد دونوں ہی شیشہل گئیں۔ اور خود ہی ہنسنے لگیں۔ اتنی دیر میں زمرس چائے لے آئی۔
 ”اس وقت واقعی بڑی طلب ہو رہی تھی۔“ میں نے کپ تھاتے ہوئے کہا۔
 ”جو پوری ہو جائے وہ طلب کہاں؟“ زمرس نے آہستہ سے کہا۔ کپ میرے ہاتھ میں لرز گیا۔

☆☆☆

تقریب رومنائی میں بہت سارے لوگ آئے ہوئے تھے۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ قدیر کے کس قدر ملنے والے ہیں۔ اخبار نویس، کالم نویس، مصنف، ڈرامہ رائٹر، شاعر، نقاد، سول سوسائٹی کے نمایاں افراد، میں ان سے پہلی بار مل رہا تھا۔ ان سب میں جس تھا ملنے کا، ”سندھیے جو کھو گئے“ کے مصنف سے۔ پھر اچانک شور ہوا، معلوم ہوا شاہ ہارون گیلانی آگئے ہیں۔ تقریباً تمام مہمان آپکے تھے۔ انتظار تھا تو صرف قادری سرکار، وہ اس تقریب کے صدر تھے۔ پھر اچانک لوگ کھڑے ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرگوشیوں میں پھیل گیا۔ قادری سرکار آگئے۔ کسی نے نہیں کہا، مگر جو لوگ انہیں جانتے تھے وہ کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ چند لمحوں میں پورا ہال کھڑا ہو کے انہیں تعظیم دے رہا تھا۔ سچ ہے جو اللہ کے حضور جھک جائے۔ زمانہ اس کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے۔

قادری سرکار کے کرسی صدارت سنبھالتے ہی قرآن مجید کی تلاوت سے تقریب کا آغاز ہو گیا۔ شروع میں چند مقررین نے کتاب کے حوالے سے گفتگو کی۔ پھر ہارون شاہ گیلانی نے اپنے مختصر خطاب میں کہا۔ ”ہمارے نوجوانوں میں بہت توانائی ہے۔ اگر اس توانائی کو ملک کی ترقی اور تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے تو اس سے زندگی ہی نہیں ملک کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ ہمیں ایسے سوچنے والے، پیار کرنے والے، اہمیا کرنے والے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ جو قلم کے ذریعے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیں جہاں امن محبت اور پیار ہو۔ مجھے یقین ہے کہ قادری سرکار کے شاگرد، ان کے خلیفہ، ان کی خانقاہ سے منسلک نوجوان ایک ایسا فکری انقلاب لائیں گے، جو اس معاشرے کو بدل دے گا۔ میں تزیل میاں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے محبت کے موضوع پر لکھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا۔!“ تالیوں کی گونج میں ان کا خطاب ختم ہوا۔

اس کے بعد میزبان نے مجھے ڈانس پر آنے کی دعوت دی۔ میں نے اجازت طلب نگاہوں سے قادری سرکار کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے اجازت دے دی۔
 میں نے ڈانس پر آ کر سامنے دیکھا۔ پورا ہال کچھا کچھا بھرا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ اس تعفن زدہ معاشرے میں، جہاں کُل، انجما، ڈبیتی، اور دیگر جرائم روز کا معمول بنتے جا رہے ہوں، وہاں محبت کی پذیرائی اس بات کی دلیل ہے کہ ہم اندر سے امن، محبت پیارا اور اہمیا کے لئے ناصرف تیار ہیں، بلکہ اس کو سراہنے میں کسی قسم کے بجل سے بھی کام نہیں لیتے۔ یہ کتاب کی یا میری کامیابی نہیں یہ آپ کی محبت سے تعلق کی کامیابی ہے۔ قادری سرکار نے فرمایا۔ ”سندھیے جو کھو گئے، مگر لوگوں کو مل گئے“ میں آپ کے خلوص کا جواب نہیں دے سکتا۔ یہ صرف قرض کی صورت مجھ پر واجب رہے گا۔ اور یہی قرض مجھے محبت کے لئے اکساتا رہے گا۔ اللہ محبت ہے، وہ محبت دلوں میں ڈالتا ہے۔ میں آپ سے، آپ مجھ سے ہم سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بس اسی احساس کو محسوس کرنے اور اس کی منہم کو عام کرنیکی ضرورت ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔“ میں نے سر جھکا کے حاضرین کا شکر یہ ادا کیا۔

جب میں اپنی نشست پر آ کے بیٹھا تو قادری سرکار نے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ اور مسکرا دیئے۔ اس کے

بعد قادری سرکار نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا۔

”آپ سب اہل علم، حرف کی دنیا کے شاد ہوں۔ میں تو بس ایک طالب علم ہوں، ایک فقیر ہوں۔ جس نے دنیا کو صرف محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ یہ دنیا بڑی سخی، لیکن بنا تی تو آپ کے اور میرے خالق نے ہے۔ اور بنی تو میرے اور آپ کے سرکار کے لئے ہے۔ پھر ہم اس کی برائی سے، اس کے خبث سے، نفرت کے بجائے محبت سے کیوں نا بہتر کرنے کی کوشش کریں۔ محبت تو ترک ہے۔ ایثار ہے۔ اعتبار ہے۔ جو محبت کو جان گیا، محبت کو سمجھ گیا اس نے اس دنیا کو، کائنات کو فتح کر لیا۔ ہم سب محبت چاہتے ہیں، ہمیں اپنا آپ سراہا جانا اچھا لگتا ہے، مگر ہمیں دوسروں کو بھی محبت دینی چاہیے، دوسروں کو بھی سراہنا چاہیے۔

محبت کا جواب فقط محبت کے سوا کچھ نہیں۔ میں عزیزی تنزیل کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے محبت کو سمجھا، اور محبت کے دوسرے رخ ایثار کو اپنایا۔ ترک کو سمجھ لیا، اس کو سمجھنے میں ہی برکتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے معاشرے میں محبت اور ایثار کی اس نفا کو قائم رکھے اور قدیر میاں جیسے علم دوست کو عزم و حوصلہ عطا فرمائے۔ جو ایسی کتابوں کو لوگوں کے سامنے لاتے ہیں کہ جس سے محبتوں کا سفر آگے بڑھ سکے۔ اور معاشرہ بھر پور صحت مند سرگرمیوں میں پنپ سکے۔“

انہوں نے تقریب کے منتظمین کو کامیاب تقریب کے انعقاد پر مبارکباد دیکر اپنا خطاب ختم کر دیا۔ تقریب کے اہتمام پر اسٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ جو لوگ کتاب خرید کر مصنف کے دستخط لینا چاہتے ہوں، وہ کتاب خرید کر کے مصنف کے دستخط لے سکتے ہیں۔ ان کے اس اعلان کے بعد کئی لوگوں کا رخ ایک طرف بنے خوبصورت سے اسٹال کی جانب ہو گیا۔ جہاں کتاب کا ایک بڑا سائٹل بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میز پر کافی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔

قادری سرکار اور ہارون گیلانی فوراً ہی چلے گئے۔ میں لوگوں میں اتنا گھرا ہوا تھا کہ ان کو باقاعدہ خدا حافظ بھی نہ کہہ سکا۔ تاج ور اور کشور دونوں نے کتاب خریدی۔ مجھ سے اس پر دستخط لئے۔ تاج ور نے بہت خلوص سے مبارکباد دی۔ بولی ”ہم اپنے خلیفہ جی کا یہ روپ تو جانتے ہی نہیں تھے۔“

قدیر نے پرستہ کہا۔ ”سرکار کے ہیرے ہزار پہلو ترانے ہوتے ہیں ہر رخ خیرہ کرنے والا ہوتا ہے۔!“

”ٹھیک کہتے ہیں آپ۔!“ تاج ور مسکرائی۔ ”آپ کو سگنی مبارک ہو۔!“

”شکریہ۔“ قدیر نے کہا۔ ”چلیں اب چائے پی لیں۔!“ اس نے دوسری طرف اشارہ کیا۔ جہاں چائے کا اہتمام تھا۔

لوگ ملتے رہے، تبھرے کرتے رہے۔ سب بہت خواب آور تھا۔ بہت دل کش، مگر نجانے مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ سب میرے لئے ہونے کے باوجود میرا نہیں۔ کیا خوشیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی شدتوں کے بغیر ہوں۔ خوشی میں شدت بیقراری نہ ہو تو وہ چنگاری کے طرح اپنے ہی خول میں بجھ جاتی ہے۔

تقریب ختم ہو گئی۔ قدیر بہت خوش تھا۔ یہ اس کی پہلی تقریب تھی جو اس کو بحیثیت پبلسٹر متعارف کروا گئی۔ کئی نامور ادیبوں نے اس سے اپنی کتاب چھپوانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے تعلقات کی انتہاؤں کو سب نے دیکھا تھا۔ سیاست اور مذہب دونوں ہی جگہ اس کے تعلقات مثالی تھے۔ کامیابی کے لئے بس ایک دھکے کے ہی ضرورت ہوتی ہے اور اس کو وہ دھکا مل گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔

☆☆☆

حسب معمول خانقاہ میں ہجوم عشاق جمع تھا، اور قادری سرکار اپنے مخصوص تخت پر دھیمے لہجے میں اپنا درس دے رہے تھے۔

”دعائیں سب کے لئے یکساں تقسیم ہوتی ہیں۔ زمین اپنا سیدہ فراخ کرتی ہے تو اناج ملتا ہے۔ شہرت لیتے ہیں۔ سمندر، دریا اپنا دامن کھولتے ہیں تو وہاں بھی انسان کی پذیرائی کے لئے انواع و اقسام غذا میں ہیں۔ موتی ہیں مونگے ہیں۔ آسمان کی طرف دیکھو تو ستارے ہیں۔ چاندنی ہے۔ طیور ہیں۔ ابر باراں ہے۔ سورج کی دل کش حرارت ہے۔ غرض ہر جاتیری قدرت کا نظارہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اللہ پاک ان نعمتوں کی تقسیم میں رنگ، نسل، مذہب، خطے کی تخصیص نہیں رکھتا۔ سب کو ان کی ضروریات کے مطابق نعمتیں ملتی ہیں۔ مگر براہِ ملاحظہ کا، ہوس کا، ہم ان نعمتوں کو ذخیرہ کرتے ہیں۔ پابندیوں لگاتے ہیں۔ کہیں یہ عالم کہ مارے افراط کے ضائع کرنا پڑے، اور کہیں یہ معاملہ کہ ایک مٹھی اناج کے لئے عصمتیں بیچی جائیں، بچے فروخت کئے جائیں۔ کیا یہ اس ذات پاک کا مقصود و منشاء تھا؟“

انہوں نے ذرا ٹھہر کے اپنے مخاطبین کی جانب دیکھا۔

”نہیں ہرگز نہیں۔!“ ایک معمولی وقفے کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

”قادر مطلق ہر نعمت کو شمار رکھتا ہے۔ اور جو اس کا شمار لگاڑتے ہیں۔ ان معاشروں پر، ان خطوں پر، ان ممالک پر عذاب الہی مسلط ہونے لگتا ہے۔ کبھی زلزلے، کبھی بارشیں، کبھی قحط بھی پتاریاں۔ غرض وقفے وقفے سے آفتیں اس خطے کا رخ کر لیتی ہیں۔ معاشرہ عذاب الہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم صرف اپنی جیب بھرنے لگتے ہیں۔ خیر و فلاح کے معاملات زیادہ سے زیادہ امداد اکٹھی کرنے سے مشروط ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ سب ایک ایسی دوڑ میں شامل ہو رہے ہیں جہاں بندگان خدا کی مجبوریوں کو، بے بسی کو، پامالی کو، مال تجارت کی طرح بیچا جا رہا ہے۔ ایسا معاشرہ فلاح و خیر سے خالی ہو جاتا ہے۔ یا اللہ۔۔۔ ہمارے دلوں کی درنگی فرما۔۔۔ ہماری اصلاح فرما۔۔۔!“

حسب معمول پتا نہیں کیسے ان کا درس آخر میں دُعا کے قالب میں ڈھل جاتا تھا۔

”اے اللہ ہمیں معاف فرما۔۔۔ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرما۔۔۔ ہماری بد اعمالی کو معاف فرما۔۔۔ یا اللہ کرم فرما دے۔ ہم گناہگار ہیں تو غفار ہے۔ ہم عیب سے بھرے ہیں تو ستار ہے۔ ہم فانی ہیں تو ہی القیوم ہے۔ ہم جھوٹے ہیں تو سچا ہے۔ ہم ظلمت میں تو نور ہے۔ ہم تیرے بندے ہیں تو ہمارا پالنہار ہے۔ اللہ معاف کر دے۔ یا اللہ معاف کر دے۔!“

آنسوؤں کی چمڑی، معافی کی ٹھہرا، ہر آدمی، ہر نفس سے ایک ہی صدا بلند ہو رہی تھی۔ یا اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ سماعت دم بخود۔۔۔ یا اللہ معافی۔۔۔ نطق بے جان۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ یوں جیسے خانقاہ کو نور کے دائرے اوپر سے نیچے اپنی گرفت میں لینے کو عرش سے اتر رہے ہوں۔ اللہ معافی۔۔۔ نور۔۔۔ روشنی۔۔۔ زندگی۔۔۔ بندگی۔۔۔ عاشق معشوق کے انتظار میں۔۔۔ مجبور ملاقات کے خیال میں۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ ہر بن و مو سے صدا بلند ہو رہی تھی۔ ہر طرف نور ہی نور تھا۔ اور پھر روشنی کی شدت۔۔۔ معلوم سے نامعلوم کا سفر۔۔۔ ہمت سے نیست کی جانب۔۔۔ نیست سے ہمت کا شعور اور پھر شعور اعلیٰ کے رنگ کے آگے سب بے رنگ۔۔۔ بے کیف۔۔۔ اصل کیف۔۔۔ اصل کیف۔۔۔ تو ہی ہے۔۔۔ تو ہی ہے۔۔۔ تو ہی ہے۔۔۔ تو ہی ہے۔۔۔ اے اللہ۔۔۔ تو ہی تو۔۔۔!“

حواس رخصت ہو گئے۔ ایک میں ہی کیا۔ وہاں موجود سب ہی بے حواس تھے۔ سب ہوش و خرد سے بے گانہ ہو رہے تھے۔ سب ہی اُس رنگ ساز کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ جو کھرچ کھرچ کر رنگ اتار کر اپنا رنگ چڑھا رہا تھا۔ ارض و سما۔۔۔ تو ہی تو۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ یا اللہ۔۔۔

☆☆.....☆☆

آپ کی ڈاٹری

یہ ہے آپ کی پسند، آپ کا انتخاب

صرتبہ اشعر جواد

دروازوں پر دستک دیتی ہے جن میں سے ایک نہ ایک کھل ہی جاتا ہے وہ جذباتی ہے لیکن مردوں کی طرح جذبات کی رو میں بہہ نہیں جانی بلکہ ایک شہ سوار کی طرح جذبات کی لگا میں اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ موقع کی مناسبت سے لگام سنبھال لیتی ہے اور موقع کی مناسبت سے چھوڑ دیتی ہے۔ وہ ایک ماہر جزل کی سی نظر رکھتی ہے اور قابل مبارک باد ہے وہ دل جس کے قلعہ میں عورت کی نظر کوئی رخنہ نہیں پاسکتی اگر تمہارے دل میں جوانی کا جوش ہے تو وہ تمہارے بوسے لیتے نہ تجھے گی اگر تم جاہ و حشمت کے طالب ہو تو وہ تمہارے دل کا فضل توڑے گی اور تمہیں کامیابی و کامرانی کے ترابے پر لاکھڑا کرے گی اگر تم تھکے ہوئے ہو تو اسی عورت کی گود میں تمہیں اطمینان و سکون ملے گا اگر تم پستیوں میں گرے ہوئے ہو تو یہی عورت تمہیں پام عروج تک پہنچا دے گی اور تمہاری شکست کو فتح میں تبدیل کر دے گی۔ ہر..... عورت وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو مرد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قدرت اس کا ساتھ دے رہی ہے اور عورت کی خاطر جنگیں ہوتی ہیں اسی لئے بھائی بھائی کا باپ بیٹے کا اور بیٹا باپ کا گلا کاٹنے سے دریغ نہیں کرتا، عورت کے اشارے پر قسمتیں بنتی اور بگڑتی ہیں اس کی خاطر مرد نیکی اور بڑی کرتا ہے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ عظیم اور جلیل القدر بنتا ہے اسی کی خاطر وہ آگ کے دریامیں کود پڑتا ہے اور اسی کے لئے وہ آسمان کے تارے توڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن عورت اس ابوالہول کی طرح خاموش بیٹھی مسکراتی رہتی ہے اور کوئی اس کی مسکراہٹ کے راز کو آج تک نہیں پاسکا۔

خیر خواہی

سیدنا ابو ہریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جب کوئی امر پیش آئے تو اچھی بات کہے نہیں تو چپ رہے اور عورتوں سے خیر خواہی کرو اس لئے کہ وہ چلتی سے بنی ہیں اور پسلی میں اونچی پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے پھر اگر تو اسے سیدھا کرنے لگا تو توڑ دے گا اور اگر یوں ہی چھوڑ دیا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی عورتوں کی خیر خواہی کرو۔

انتخاب: سرور ندیم۔ حیدرآباد

عورت کی طاقت

ابھی تم عورتوں کی قوتوں سے واقف نہیں ہو۔ عورت کمزور اور ناتواں ہونے کے باوجود دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ لنگر نہیں رکھتی مگر حکومت کرتی ہے۔ خنجر نہیں رکھتی مگر زخمی کرتی ہے۔ زندان نہیں رکھتی مگر قید کرتی ہے۔ سانپ کا کاٹنا بچ سکتا ہے لیکن عورت کا ڈسائیں بچ سکتا۔ زرہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو اس میں کہیں نہ کہیں جوڑ ہوتا ہی ہے اور تلوار اس جوڑ کو تلاش کر لیتی ہے۔ اسی طرح آدمی کتنا ہی طاقت ور اور دور اندیش کیوں نہ ہو۔ اس میں ایک نہ ایک کمزوری ہوتی ہے اور عورت اسی کمزور حصہ پر ضرب لگاتی ہے۔ عورت وہ چوار ہے جو انسانیت کی عینیت کو جس طرف چاہتی ہے موڑ دیتی ہے اور ہزاروں روپ میں ظاہر ہوتی ہے اور ہزاروں

ڈالتے جاتے ہیں اور اس کے بعد کارڈ کے ساتھ بھیک مانگتے ہیں۔ مضمون کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔ ”یہ لڑکا گونگا ہے، اس کی ماں گونگی ہے۔ اس کا باپ ریلوے میں تھا جو مر گیا ہے لہذا ریلوے نے اس کا کرایہ معاف کر رکھا ہے۔ مسلمان بھائی اس کی مدد کریں اور یہ کارڈ ملاحظہ کر کے واپس کر دیں۔“ اس دنیا میں ہر طرح کے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے ان سب لڑکوں کے باپ ریلوے میں ملازم تھے کوئی ڈاک خانہ یا چٹنی بین نہ تھا۔ مور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کسی خیر نے اس مضمون کے کارڈ چھپوا رکھے ہیں جس کا جی چاہے پانچ روپے سینکڑوں کے حساب سے مانگ لے اور اپنا نام بھر کے استعمال کرے۔ ایک بار ہم نے بھی رحم کھا کر ایسے لڑکے کے چونی دی اور دلا سہ روپے کر پوچھا۔ ”بیٹے گونگے ہی ہو یا کوئی اور خرابی بھی ہے؟“ وہ جھٹ بولا۔ ”جی بہرہ بھی ہوں۔“

ابن انشاء کی تحریر سے اقتباس
انتخاب: رابعہ ظفر۔ کراچی

غلط انتخاب

اس زعفرانی جنگل میں میرے سامنے دو راستے تھے۔ میں دورا ہے پر کھڑا ہو گیا۔ میں دیر تک سوچتا رہا ان راستوں میں میرا راستہ کون سا ہے۔ مسافر ایک تھا اور راستے دو مجھے ایک راستہ پسند آ گیا۔ میں نے قدم بڑھائے اور چل پڑا۔ ایک خوب صورت اور صاف ستھرا راستہ تھا۔ اس پر گھاس بھی اور اس سے پہلے اس راستے پر کسی نے قدم نہیں رکھا تھا۔ مجھ سے سیدھی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی گھاس آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اے مسافر! تم اس راستے کے پہلے راہی ہو۔ میں خوش تھا۔ پہلے مسافر کی طرح خوش تھا مگر افسوس جب میں درمیان میں پہنچا تو مجھے احساس ہوا میں غلط راستے پر نکل آیا ہوں۔ میں نے سوچا کیا میں پلٹ کر واپس جا سکتا ہوں؟ کیا میں اپنے اصل راستے کی طرف واپس لوٹ سکتا ہوں؟ میں نے سوچا نہیں میں اب راستہ نہیں بدل سکتا۔ مدتوں بعد اب سن رہا ہوں۔ جنگل میں دو راستے تھے اور میں اس

فرعون کی آپ بیتی رابینڈر بیکر ڈ
انتخاب: سید نصیر شاہ۔ کراچی

طرز زندگی

ایک پاکستانی خاندان کو فرانس میں شہرت ملی۔ فرانس کا سوشل سیکورٹی کارڈ ہونے کے لئے اس خاندان کی ایک لڑکی سوشل کا سیکورٹی کے دفتر گئی۔ کارڈ بنانے والے معلومات کمپیوٹر کو فیڈ کرنا شروع کیں۔ پوچھا نام لڑکی نے نام بتا دیا تو سوال ہوا تاریخ پیدائش یہ بتا دی تو سال ہوا شادی شدہ یا غیر شادی شدہ لڑکی نے جواب دیا غیر شادی شدہ۔ اب اگلا سوال تھا کتنے بچے ہیں لڑکی نے کہا میں غیر شادی شدہ ہوں۔ اہلکار بولا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بچے تو ہو سکتے ہیں لڑکی نے کہا کیا بات کر رہے ہیں۔ آپ اس پر اہلکار نے کی بورڈ سے انگلیاں اٹھائیں اور لڑکی سے کہا۔ آپ فرانس کی طرز زندگی سے نا آشنا ہیں۔ ہمارا طرز زندگی سیکھ کر آئیے تو کارڈ بنے گا لڑکی مایوس ہو کر گھر واپس چلی گئی اس کی عمارت میں ایک ہندوستانی خاندان رہتا تھا لڑکی نے ان سے تذکرہ کیا۔ انہوں نے فرانس کے طرز زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کیں چنانچہ وہ لڑکی انٹرویو کے لئے دوبارہ گئی پھر سوال ہوا شادی شدہ یا غیر شادی شدہ لڑکی نے جواب دیا غیر شادی شدہ سوال ہوا کتنے بچے ہیں جواب دیا بچے نہیں ہیں پھر سوال ہوا کیوں لڑکی نے جواب دیا مجھے کوئی بوائے فرینڈ ہی نہیں ملتا۔ اہلکار بولا کیوں آپ تو اچھی خاصی اسٹارٹ ہیں لڑکی نے کہا آپ بن جائیں میرے بوائے فرینڈ اہلکار سٹ پنا گیا اور بولا میری تو پہلے چار فرینڈز ہیں لڑکی نے کہا یہ ہے میری قسمت اہلکار نے خاموشی سے کمپیوٹر پر کام کیا اور بولا دس منٹ بیٹھ جائیں آپ کو ابھی کارڈ مل جائے گا۔

عظیم سرور کی تعریف ’قصہ مختصر‘
انتخاب: شعیب محی الدین۔ لاہور

گونگا اور بہرہ

آپ نے ریل میں چھوٹے بچوں کو مطبوعہ کارڈ تقسیم کرتے دیکھا ہوگا جو وہ ہر مسافر کی جمبلی میں

نے ایک صاحب کو اذان کے لیے کہا یوں سات صدیوں بھی مسجد کی خاموش فضاؤں سے اذان کی صد اگوجھی۔

منظور الہی کی تصنیف ”درد دلکشا“
انتخاب: اشعر جواد۔ کراچی

سنہری باتیں

☆ بہت سارے سوالات سے نکل کر انسان جب ایک سوال میں داخل ہوتا ہے تو اس کا سفر واضح ہو جاتا ہے۔

☆ اچھے عمل کی یاد کو ایک بڑا لفظ ہمیشہ کے لئے تباہ کر سکتا ہے۔

☆ رشتے ناتے بھی کپے دھاگے کی طرح ہوتے ہیں، ٹوٹ جائیں تو انہیں جوڑا جاسکتا ہے لیکن گرہ ضرور لگ جاتی ہے۔

☆ مخلص کی تعریف یہ ہے کہ وہ آپ کے ساتھ اپنے آپ سے زیادہ مہربان ہو۔

☆ خود شناس نہ ہو تو خدا شناسی کا عمل ممکن نہیں ہوتا۔

☆ مصنفین اپنی کتابوں کی شکل میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کی لائبریری میں محفوظ رکھتے ہیں۔

☆ جب تک کوشش کی ناکامیاں سمجھ میں نہ آئیں نصیب کو سمجھنا نہیں جاسکتا۔

☆ اگر دل میں محبت آجائے تو زبان میں شائستگی آنا شروع ہو جاتی ہے۔

☆ زندگی کے جواز تلاش نہیں کئے جاتے صرف زندہ رہ جاتا ہے۔ زندگی گزارتے چلے جاؤ جواز مل جائے گا۔

☆ موت سانس ختم ہونے کا نام نہیں بلکہ موت تو یہ ہے کہ ہمیں یاد کرنے والا کوئی نہ ہو۔

ڈاکٹر ذکریا کی تصنیف ”گوہر آبدار“
انتخاب: رضوانہ کوثر۔ لاہور

خوشی اور غم

خوشی اور غم انسان کی زندگی میں اہم کردار ادا

راستے پر چل پڑا جو خوب صورت تھا مگر میرا نہیں تھا اور یہ وہ غلط انتخاب تھا جو میری زندگی گھما گیا۔

جاوید چوہدری کی تصنیف ”زیر پوائنٹ“
انتخاب: سعد مگھلو۔ حیدرآباد

انسان اور بندر

بڑھاپے میں ایک بندر کی نظر کمزور ہو گئی۔ اس نے انسانوں کی زبان سے سنا تھا کہ یہ کوئی اتنی بھی بد قسمتی کی بات نہیں۔ بس اتنا ہے کہ عینک لگا لینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے کہیں سے درجن بھر عینکیں حاصل کیں۔ کبھی سر پر رکھا، کبھی دم پر باندھنے کی کوشش کی کبھی سونگھا، کسی کو چانا، پھر بھی کسی عینک نے اس کی بینائی میں اضافہ نہ کیا۔

”واہیات!“ اس نے کہا۔ ”الحق ہیں وہ جو آدمیوں کی بگواس سنتے رہتے ہیں۔ اب یہی عینک کے بارے میں انہوں نے بالکل زلزل ہانک دی ہے۔ ان کا تو ذرا بھی فائدہ نہیں۔“

عجیب بات تو یہ ہے کہ آدمی بھی کبھی کبھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کوئی چیز قیمتی ہی مفید کیوں نہ ہو ناواقف آدمی جو اس کی قدر نہیں جانتا ہمیشہ اس کی برائی کرتا ہے اور اگر تھوڑا بہت اختیار رکھتا ہو تو اس کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔

پوس محمد بٹ کی کتاب ”خندہ پیشانیوں“
انتخاب: فیضان حسین عثمانی۔ حیدرآباد

مسجد قرطبہ

سلطان سعود ہسپانیہ کا سرکاری دورہ کر رہے تھے۔ وہ اپنی جماعت کے ساتھ مسجد قرطبہ میں داخل ہوئے تو نماز کا وقت آ گیا۔ سلطان نے نماز ادا کرنے کے لئے پروٹوکول کے افسران سے اجازت چاہی۔ انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ مسجد کلیسا میں تبدیل ہو چکی ہے۔ سلطان کا چہرہ تھمتھا اٹھا۔ انہوں نے کہا۔ ”میں اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے ہوں جس نے نصرانیوں کے وفد کو مسجد نبویؐ میں عبادت کرنے کی اجازت دی اور تم مجھے اپنی مسجد میں نماز ادا کرنے سے روکتے ہو؟“ سلطان

سائچے

زندگی ہمیں بنے بنائے سانچوں میں ملی ہے۔ مہذب صرف اس کو کہا جاتا ہے جو ان سانچوں کے مطابق ڈھل کر زندگی گزار دے، جو ان کو توڑے یا باہر نکلنے کی کوشش کرے اسے دہشت گرد کہا جاتا ہے یا پھر بہرو۔

خیال آرائی: خضر فرحان۔ کراچی

زندگی

زندگی ایسا پودا ہے جس پر کانٹے اگتے ہیں۔ انسان ان کانٹوں کو نکالنے ہوئے اپنی عمر گزار دیتا ہے لیکن ان کانٹوں سے آزاد نہیں ہو پاتا اگرچہ زندگی میں پھول بھی اگتے ہیں مگر یہ جلد مر جھکا جاتے ہیں۔ انسان خوب صورت پھول جن کرا بھی ان سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہیں ہو پاتا کہ غم کے کانٹے دوبارہ اگ آتے ہیں اور پھر انسان اس کانٹوں پر جی کر ایک حسین یادوں میں کھو جاتا ہے کیونکہ اس کی قسمت میں یہی لکھ دیا جاتا ہے۔

خیال آرائی: ایم ملک۔ کراچی

دل

سینے میں دل ہے دل میں درد ہے درد میں نشہ ہے نشہ میں مٹھاس ہے۔ مٹھاس میں ٹٹکی ہے ٹٹکی میں آرزو ہے آرزو میں حسرت ہے۔ حسرت میں امید ہے امید میں یقین ہے یقین میں خیال ہے خیال میں تصور ہے تصور میں تو ہے تجھ میں ادا ہے ادا میں حیا ہے حیا میں نزاکت ہے نزاکت میں شونہ ہے شونہ میں شرارت ہے شرارت میں غصہ ہے غصے میں بناوٹ ہے بناوٹ میں اپنائیت ہے اپنائیت میں چاہت ہے چاہت میں خلوص ہے خلوص میں پیار ہے پیار میں عبادت ہے عبادت میں خدا ہے خدا سے دعا ہے دعا میں قبولیت ہے قبولیت میں تو ہی تو ہے۔

خیال آرائی: قطبین حیدر۔ کراچی

دور کے ڈھول سہانے

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو چیز ہمارے پاس ہوتی

کرتے ہیں اگر انسان کی زندگی میں غم نہ ہوں تو جینے کا مزہ نہیں آتا۔ خوشی تو عارضی چیز ہے پل میں آتی ہے اور پل بھر میں چمن جانی ہے مگر ہمیشہ رہتا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ خوشی میں انسان خوش رہ سکتا ہے مگر میرا کہنا ہے کہ خوشی میں انسان غم زدہ ہو جاتا ہے کہ یہ پل بھر کی خوشی ہم سے چمن نہ جائے۔ غم تو ہمیشہ کا ساھی ہے کچھ انسان اپنی خوشی کی خاطر کتنے لوگوں کے اصولوں پر پانی پھیر رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں کرتے ہیں جو اپنی خوشی کی خاطر دوسروں کی خوشی لوٹتے ہیں جو لوگ دوسروں کو خوش رکھنے کی خاطر غم کو اپناتے ہیں اصل میں وہ لوگ ہی انسانیت کا حسن ہیں۔

خیال آرائی: ظفر اقبال خان۔ کراچی

اگر تم نہ ہوتے

یہ یادیں کتنی ظالم ہوتی ہیں صرف ایک پل میں انسان کا رہا سہا سکون بھی برباد کر دیتی ہیں۔ کیا تھا اگر یہ اذیت ناک لمحے میرا مقدر نہ بنتے۔ پچھلے سال جا رجون کے دن کی طرح یہ دن بھی گزر جاتا خبر نہیں خوشی کے لمحات اتنی جلدی کیوں بیت جاتے ہیں۔ اجنبی ابھی تو میں نے جی بھر کے تمہیں دیکھا ہی نہیں۔ اخباروں سے تراشی ہوئی ان تصویروں کو میں کب تک دیکھوں؟ تم مجسم حقیقت بن کر میرے سامنے کیوں نہیں آتے؟ تمہیں یہ خوف کیوں ہے کہ محبت میں صرف خسارہ ہی ملتا ہے تم محبت کی راہوں میں آنے سے ڈرتے کیوں ہو۔ اتنی حقیقت پسندی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ کیا خبر تمہاری یہ حقیقت پسندی مجھے زندگی سے محروم کر دے۔ تمہیں خبر ہے نا کہ تمہاری یہ خاموشی مجھے اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ مگر اجنبی میں تم سے کیسے کوئی گلہ کروں اس میں تمہارا تو کوئی دوش نہیں۔ بس میرا پگل پن ہی مجھ سے یہ حرکتیں کروا تا ہے تم تو میری اندھیری زندگی میں روشنی کی کرن ہو۔ اگر تم نہ ہوتے..... تو شاید رسوں رواجوں کی اس دوزخ میں میرا وجود کب کا جل کر خاسترہ ہو چکا ہوتا تمہیں کیا خبر..... اجنبی.....

خیال آرائی: ج۔ س۔۔ قادر پور راں

کی ہر خواہش پوری ہوگی لیکن کیا اس دفعہ بھی خواہش راستے میں ہی تم ہوگئی۔ پتا بھی نہ چلا یہ کیا ہو گیا اس کی ذات تو رحمت ہے جس کے ہاتھ میں پوری کائنات ہے وہ تو اپنے بندوں سے ماں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔ ماں اپنے بچوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تو پھر اس نے مجھے کیوں تکلیف دی۔ اب میں کسی سے کوئی امید نہیں رکھوں گا وہ انہی سوچوں کے سمندر میں غلطان مایوسی کے اندھروں میں ہوتا ہے تو پھر اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ جو ہوا صبح ہوا جو وہ جانتا ہے وہ ہم نہیں جانتے۔ میرا رب واقعی میرا دوست ہے میرا بچن ہے جس کو میرے ماضی حال اور مستقبل کا علم ہے۔ ہو سکتا ہے میری خواہش میرے لئے نقصان دہ ہو اس نے مجھے بڑی تکلیف سے بچانے کے لئے تھوڑی تکلیف دی ہو ہے اگر آگ سے کھلنا چاہیں تو ماں انہیں روک لیتی ہے۔ بچ کو پتا نہیں ہوتا لیکن ماں جانتی ہے۔ آگ سے کھلنا خطرناک ہے وہ اس کا رونا برداشت کر لیتی ہے لیکن اسے آگ سے کھیلنے نہیں دیتی۔ ہمارا رب بھی جانتا ہے کیا صبح ہے کیا غلط وہ رونا بھی ہمارا برداشت کر لیتا ہے لیکن ہمیں آگ سے کھیلنے نہیں دیتا۔ وہ بھی ہماری ہر جائز خواہش کو پورا کرتا ہے اب میری ہر امید کا مرکز وہ ہے اس سے امیدیں باندھنا بھی آدمی کے ایمان کی دلیل ہے۔

خیال آرائی: راشد خواجہ۔ راولپنڈی

کاش ہم بھی پڑھے لکھے ہوتے

پچھلے کئی ہفتوں سے یہ گانا میری زبان سے خوشخود ادا ہو رہا ہے اور وہ کہ نہیں اپنی اس کمزوری کا احساس ہو رہا ہے۔ اگر ہم پڑھے لکھے ہوتے پڑھے لکھے پنجاب کی طرح تو ہم بھی ایکشن میں اپنے رہنماؤں کے نام کا اشتہار گاڑی رکھ لیتے اور شہر بھر میں گشت کرتے۔ اگر ہمارا تعلق بھی پاکستان کے چند پڑھے لکھے گھرانے سے ہوتا تو ہم بھی اپنے پسندیدہ امیدوار کے نام پر ٹپے پہنچے لگاتے ہم تو اپنی جاہلیت میں مارے گئے۔ صرف ایک مہر لگا کر پلٹ گئے۔ یہ تو بعد میں علم ہوا کہ پڑھے لکھے لوگ کئی

ہے۔ ہم اس کی قدر نہیں کرتے اور جو چیز ہماری پہنچ سے دور ہوتی ہے۔ ہم اس کے پیچھے لپکتے ہیں۔ تعریف اور پسندیدگی کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ جس کے ہم مداح ہوتے ہیں۔ اس سے واقفیت بڑھنے اور اسے قریب سے دیکھنے کے بعد یہ جذبات بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے قریب کی چیز میں کشش محسوس نہیں ہوتی بلکہ دور کی چیز ہمیں حسین دکھائی دیتی ہے۔ قریب جا کر پتہ چلتا ہے کہ یہ فریب نظر تھا۔ سب اچھا ستارے زمین پر کھڑے ہو کر دکش لگتے ہیں مگر ماں جا کر پتہ چلتا ہے کہ خبر تو ہیں سو ہیں مگر ان کی روشنی بھی چرا لی ہوئی ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔

خیال آرائی: شاہد نسیم۔ کچھ موڑ

یقین

آدمی اپنے ساتھ کئی خواہشات لئے پھرتا ہے۔ حد سے زیادہ توقعات باندھنا بھی اس کی فطرت میں شامل ہے۔ جب وہ کسی آدمی سے بہت بڑی توقعات باندھتا ہے تو اسے خود بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ بہت بڑے دھوکے میں ہے اس کا اسے تب پتہ چلتا ہے جب کسی سے بندھی ہوئی خواہش چھننا کے سے ٹوٹ کر دل کو ریزہ ریزہ کرنی ہوئی اسے بلند یوں سے پستی کی طرف اچھال دیتی ہے۔ تب اسے احساس ہوتا ہے کہ میں بڑی خود فریبی میں ہوں۔ آنسوؤں پر اختیار کس کا ہے۔ خود فریبی سے نکلنے کے بعد یہ آنسو بھی اس کی آنکھوں سے بڑی بے دردی سے بہتے ہوئے اس دردناک کہانی کو بھی اپنے ساتھ ہی بہا دینا چاہتے ہیں جو ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ اعتبار کی داستان تھی جب یہ کہانی ختم ہوئی تو دوسری شروع ہوئی۔ آدمی پھر سے اپنے اندر ایک نئی خواہش پالتا ہے جو اس کی ہر خواہش کا ملتا جلتا عکس ہوتی ہے۔ اب وہ اپنی ہر خواہش کو اپنے رب کے سپرد کرتا ہے اس امید کے ساتھ کہ بندوں کے ساتھ کی توقعات سے دھوکا ملتا ہے لیکن وہ پاک ذات ہے جو مجھے کبھی بھی مایوس نہیں کرے گی پھر آدمی ایک نئی امید کے ساتھ چلتا ہے کہ اب وہ رو نہیں ہوگی اس

☆ 558 رکوع ہیں۔

☆ عرصہ نزول 23 سال ہے۔

☆ اس میں بسم اللہ 113 مرتبہ آیا ہے۔

مرسلہ: نورین درآب خان۔ میرپور خاص

مہکتے گلاب

☆ محبت کا ایک لمحہ سو برس کی نفرت سے بہتر

ہے۔

☆ جن لوگوں کے ذہن میں اچھے خیالات ہوں

وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

☆ ہمیشہ مسکراتے رہو کیونکہ تمہاری مسکراہٹ

کسی کے درد کا مداوا بن سکتی ہے۔

☆ زندگی ایک سگھول ہے جس میں مقدر کی

خیرات ملتی ہے۔

☆ مور کے پاؤں بھی اس کے پروں کی طرح

خوب صورت ہوتے تو وہ بھی زمین پر چلنا پسند نہ

کرتا۔

☆ زبان تلوار نہیں لیکن قتل کر دیتی ہے زبان کا

زخم تلوار کے زخم سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

مرسلہ: اُم فروا۔ کراچی

انمول موتی

☆ اچھی کتاب سے اچھا کوئی دوست نہیں۔

☆ دوست کے دشمن کو اپنا دوست مت بناؤ ورنہ

دوست بھی دشمن بن جائے گا۔

☆ خاموشی اختیار کرنا سب سے بڑی عبادت

ہے۔

☆ تین چیزیں واپس نہیں آتی، والدین، حسن

جوانی۔

☆ مہر قسمت کے طوفان کے مقابلے کے لئے

بہترین لشکر ہے۔

☆ ہر ہنسنے والا چہرہ دل سے خوش نہیں ہوتا۔

☆ ہر موڑ پر زندگی کی خوشی نہیں ملتی۔

☆ کسی کو پانے کی تمنا مت کرو بلکہ اپنے آپ کو

اس قابل بناؤ کہ دنیا والے تمہیں پانے کی تمنا کریں۔

مرسلہ: عائشہ اشعر۔ کراچی

کئی نام لکھ کر ٹھپے لگا گئے۔ پڑھے لکھے ہونے کے بہت سے فوائد ہیں اگر ہمیں لکھنا آتا تو ہم بھی ایک ہی اخبار اور میگزین میں کئی کئی نام سے لکھتے۔ کئی کئی شناختی کارڈ بناتے ہم نے سنا تو ہے کہ انسان کی کئی شخصیات ہوتی ہیں۔ اندر سے کچھ باہر سے کچھ اور کئی روپ ہوتے ہیں مگر ہم ان پڑھ بھلا کیا جانیں بڑے لوگ اپنی دیگر حیثیت کی بھی الگ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنواتے ہیں۔ سوبال کی سم لگواتے ہیں۔ خیر جناب اب اس عمر میں اپنی اس کمزوری کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔

اگر ہمیں پڑھنا آتا تو ہم بھی بس میں آگے لکھے حصے میں جڑھتے جہاں بڑا بڑا ایڈیٹر لکھا ہوتا ہے مگر میں ان پڑھ کیا جانوں سارے مرد آگے کے دروازے پر لٹکے ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے ہونے کے بہت سے فائدے ہوتے ہیں۔ ہم الیکشن لڑ سکتے ہیں اور پڑھے لکھے دوستوں کی مدد سے جیت کر آئین اپنی مرضی سے لکھ سکتے ہیں ہمیں لکھنا آتا تو ہم بھی تاحیات رہائش گاڑی اور دیگر سہولیات مفت لکھ لیتے۔ لکھنا آتا ہوتا تو ہم بھی روشن مستقبل کے لئے مستقبل کے معماروں کے اسکولوں کی چھٹیاں لکھ دیتے۔ لکھنا آتا ہوتا تو مخالفوں کے لئے دیواروں پر گالیاں لکھ دیتے۔

پڑھنا آتا ہوتا تو یہ گاڑی روکتے لال جتی کی روشنی یہ چلاتے Slow پر تیز کرتے ہارن پر ہاتھ رکھے گاڑی چلاتے مگر ہم پڑھ نہیں سکتے تو بس رک رک کر آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہیں کیونکہ Sigh board پڑھنا جو نہیں آتا۔ اب اس سے زیادہ اپنی داستان ام کیا بیان کریں۔ اب افسوس کے علاوہ کیا رہ گیا کیا آپ بھی میری طرح ان پڑھ ہیں؟ خیال آرائی: ڈاکٹر کرن نورین۔ کراچی

تعارف قرآن

☆ قرآن کے 30 سہارے ہیں۔

☆ کل 114 سورتیں ہیں۔

☆ کل آیات 6666 ہیں۔

☆ 14 سجدے ہیں۔

کامیاب زندگی

☆ کسی پر تنقید کرنا یا اسے برا بھلا کہنا بے وقوفی ہے۔

☆ دوسروں کا محاسبہ نہ کرو ورنہ وہ تمہارا محاسبہ کریں گے۔

☆ میں کسی کی برائی نہیں کرتا بلکہ اس کی جو خوبیاں مجھے معلوم ہوتی ہیں بیان کرتا ہوں۔

☆ کسی شخص سے کام لینا چاہتے ہیں تو اس کی ضرورت کا ذکر کریں اور اسے یہ ضرورت پوری کرنے کا طریقہ بتائیں۔

☆ کامیابی کا راز بس یہی ہے کہ دوسروں کے نکتہ نظر کو سمجھا جائے۔

☆ جو شخص بے لوث خدمت کرتا ہے ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے۔

☆ دنیا میں سب سے مشکلات اس شخص کو پیش آتی ہیں جو دوسرے لوگوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔

☆ ہم میں سے ہر شخص اس کو پسند کرتا ہے جو اس کی تعریف کرے۔

☆ اگر آپ دوست بنانا چاہتے ہیں تو دوسروں کی خدمت کے لئے ہمیشہ تیار رہیں۔

☆ گھریلو زندگی میں مسکرانے کی عادت جادو کا سا اثر رکھتی ہے۔

☆ ہنس کھل آدمی کو ہر کوئی خوش آمدید کہتا ہے۔

☆ لوگوں کا نام ان کے لئے سب سے میٹھی آواز ہے۔

☆ مرسلہ: شرجیل اقدس۔ جیکب آباد

مسکراہٹ

کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا میں سب سے سستی اور اچھی چیز مسکراہٹ ہے یہ مسکراہٹ کسی بھی وقت کسی کو دے سکتے ہیں لیکن نہیں دیتے مگر جب غرض یا کوئی مفاد ہو تو مسکراتے ہیں۔ ورنہ منہ پھیر کر گزر جاتے ہیں۔ اب تو انسان کی مسکراہٹ ڈالر سے بھی مہنگی ہے۔ اگر نہ ہو تو مولیٰ زاکہ کی مسکراہٹ تو ایک عجائب گھر سے چرا کر دوسرے عجائب گھر تک نہ پہنچایا

سنہری حروف

□ زندگی ایک ایسی قیمتی چیز ہے جو قیمتی ہونے کے باوجود نہ تو خود خریدی جاسکتی ہے اور نہ ہی کسی کو بیچی جاسکتی ہے۔

□ جو شخص آپ کو ہمیشہ دکھ پہنچائے اور پریشانی میں اضافے کا سبب بنا رہے اس سے تعلق توڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

□ آنسو مسکراہٹ سے زیادہ اسپیشل ہوتے ہیں کیونکہ مسکراہٹ تو ہر ایک کے لئے ہوتی ہے مگر آنسو صرف ان کے لئے ہوتے ہیں جنہیں ہم کھونا نہیں چاہتے۔

□ کبھی کبھی ہم دانستہ یا نادانستہ غلط راہوں پر نکل جاتے ہیں۔ کبھی تو خود کو آزمانے کے لئے اور کبھی دوسروں کو۔

□ کچھ لوگوں کی خوشیاں پیڑ پر بیٹھے پرندوں کی مانند ہوتی ہیں۔ نہیں معلوم پرندہ کب اڑ جائے اور پیڑ کو داغ جدائی دے جائے۔

□ محبت نہ ملے تو انسان جی لیتا ہے لیکن جسے وہ محبت سمجھتا ہے اگر وہ ہی شخص آپ کا مان نہ رکھے تو انسان ایسے ٹوٹتا ہے کہ پھر ریزے بھی نہیں ملتے۔

□ محبت بے سبب نہیں ہوتی، کبھی اس کا سبب انسان کی کوئی خواہش ہوتی ہے، کبھی کسی پر ترس کھا کر محبت کی جانی ہے اور کبھی انسان محبت کی طلب میں محبت کرتا ہے۔

□ انسان جب حد سے زیادہ خوش ہوتا ہے تو فطرت اس سے انتقام لیتی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

□ بعض ناموں کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہوتی ہیں مگر وہ وقت کی مجبور یوں کے ساتھ اس لئے زبان پر نہیں لائے جاتے کہ کہیں ان کے ساتھ کسی قسم کی گراؤ نہ منسوب کر دی جائے۔

□ خدا کی تلاش میں سمیٹنے کی کوئی ضرورت نہیں دیکھنے کی نظر میں دیکھو خدا شہ رگ سے زیادہ قریب ملے گا۔

☆ مرسلہ: رعنا تنویر۔ کراچی

جاتا۔

غصے سے کہتے ”بگھی الودیکھا ہے۔“ اور میں شرم سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا تو کہتے ”ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔ میری طرف دیکھو۔“

مرسلہ: وقار چیمہ۔ فیصل آباد

پریشانی

ایک دوست دوسرے دوست سے: ”یار آج کل میں تین بیویوں سے پریشان ہوں۔“

”تین بیویاں! مگر تمہاری تو شادی ہی نہیں ہوئی۔“

”مگر ہوئی ہے ایک میرے نانا کی دوسری میرے دادا کی تیسری میرے پاپا کی ابھی تینوں زندہ ہیں.....“

مرسلہ: نور خان۔ کوئٹہ

بزم آرائی

☆

بڑا کٹھن ہے راستہ جو آسکو تو ساتھ دو
یہ زندگی کا فاصلہ ملا سکو تو ساتھ دو
بڑے فریب کھاؤ گے بڑے ستم اٹھاؤ گے
یہ عمر بھر کا ساتھ ہے بھاسکو تو ساتھ دو
جو تم کہو یہ دل تو کیا میں جاں بھی کروں فدا
جو میں کہوں تو اک نظر ملا سکو تو ساتھ دو
رلا سکو تو ساتھ دو
ہسا سکو تو ساتھ دو

مرسلہ: (قابل اجیری) رجب علی۔ حیدرآباد

☆

میں نے کہا شیر کے حق میں دعا کرو
اس نے کہا کہ بات غلط مت کیا کرو
میں نے کہا رات سے بجلی بھی بند ہے
اس نے کہا ہاتھ سے پکھا جھلا کرو
میں نے کہا شہر میں پانی کا قحط ہے
اس نے کہا کہ چینی کولا پیا کرو
میں نے کہا کار ڈکیتوں نے چھین لی

مرسلہ: ساحل ایڈو۔ ڈیرہ اللہ یار

لو بھئی اپنی پلیٹ لے جاؤ

کسی انگریز کا پاکستان کے کسی گاؤں سے گزر ہوا۔ گاؤں والوں نے حسب روایت اس کی خوب آؤ بھگت کی اور ایک موٹی سی کٹی کی روٹی پر ساگ رکھ کر پیش کیا۔ انگریز نے ساگ کھا کر روٹی واپس کرتے ہوئے کہا۔

”لو بھئی اپنی پلیٹ لے جاؤ۔“

مرسلہ: محمد اقبال۔ کراچی

سجھوتہ

ایک نوآموز شاعر نے ایڈیٹر سے شکوہ کیا۔
”آپ لوگوں نے شاعروں اور ادیبوں پر یہ باندی کیوں لگا رکھی ہے کہ وہ کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں؟“

”یہ تو ہم نے حالات سے سجھوتا کیا ہے۔“
ایڈیٹر نے گہری سانس لے کر کہا۔

”حالات سے سجھوتا؟ کیا مطلب؟“ شاعر نے حیرت سے کہا۔

بعض لوگوں کے بارے میں تو یہ باندی لگانے کو جی چاہتا ہے کہ وہ کاغذ کے کسی طرف بھی نہ لکھیں۔“ ایڈیٹر نے جواب دیا۔

شائستہ جبین جو نجو۔ بورڑی خیر پور ناٹھن شاہ

الو!

صحافی نے سیاست دان سے پوچھا۔ ”بچھلے سالوں میں آپ نے کیا تعمیری کام کیا؟“

”آپ میرے سالوں کو درمیان میں مت لائیں اور جہاں تک تعلق ہے تعمیری کاموں کا تو میں اپنی کوئی تعمیر کردار باہوں۔“

”لیکن ہمارا خیال ہے کہ آپ کو ٹھیاں نہیں الو بنا رہے ہیں۔“ صحافی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”دیئے الو بنانا اتنا آسان کام بھی نہیں ڈرائنگ ماسٹر مجھے ہمیشہ کہتے ’الو بناؤ‘ مگر مجھ سے نہ بناتا تو

میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشائے نہ
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں
اے شاعر آنکھیں اسی طرح بجھائے رکھنا
جانے کس وقت وہ آجائے پتہ کچھ بھی نہیں
(اختر شاعر)
مرسلہ: سلیم احمد۔ کراچی

☆

مولوی صاحب کی نیک بیوی کہتی ہے
سال کے بارہ مہینے مضامین ہونا چاہئے
بیگم کہتی ہے شاعری سے پیٹ بھرتا نہیں
گھر میں کچھ کہانے کا سامان ہونا چاہئے
اس کی یہ خواہش مجھے لے ڈوبے گی
سمندر کے چچ میں مکان ہونا چاہئے
مرسلہ: دادا مشتاق جمالی۔ حیدرآباد

☆

ہے اس کے گرد یہ محفل جو اک سوال میں چپ
گلی ہے اس کی بھی ایسے کسی خیال میں چپ
ہے ایک طرفہ تماشہ طبیعت عشاق
کبھی فراق میں باتیں کبھی وصال میں چپ
خبر ہے اس کو بہت وقت کے گزرے گی
ہے حسن اپنے ہی انزوہ لازوال میں چپ
مگر میں حسن بیاں جن کے بولنے سے تھا
ہوئے وہ اہل ہنر رئیس زوال میں چپ
بہت کلام گزشتہ میں کر چکے ہیں میر
دکھائی دیتے ہیں جو ہم بیان حال میں چپ
(منیر نیازی)

مرسلہ: رضوانہ کوثر۔ لاہور

☆

نظم

معاف کر دینا میری جاں کہا سنا میرا
یہ رات آخری تھی جو آخر شب تک
خزاردی تیرے پہلو میں جاگ کر میں نے

اس نے کہا کہ اچھا ہے پیدل چلا کرو
میں نے کہا کہ کام ہے نہ کوئی کاروبار
اس نے کہا کہ شاعری پر اکتفا کرو
میں نے کہا کہ سو کی بھی گنتی نہیں ہے یاد
اس نے کہا کہ رات کو تارے گنا کرو
میں نے کہا غزل پڑھی جاتی نہیں صحیح
اسنے کہا کہ پہلے ریہرسل کیا کرو
میں نے کہا کہ کیسے کہی جاتی ہے غزل
اس نے کہا میری غزل گا دیا کرو
ہر بات پر جو میں کہتا رہا بجا بجا!
اس نے کہا یوں ہی مسلسل بجا کرو
(دلادورنگار)

مرسلہ: عبید سخی۔ کراچی

☆

ہجوم میں تھا وہ کھل کر نہ رو سکا ہوگا
مگر یقین ہے کہ شب بھر نہ سو سکا ہوگا
وہ شخص جس کو سمجھنے میں مجھ کو عمر لگی
پھنچنے کے مجھ سے کسی کا نہ ہو سکا ہوگا
لرزتے ہاتھ، شکستہ سی ڈور سانوں کی
وہ خشک پھول کہاں تک پرو سکا ہوگا
بہت اجاڑتے پاتال اس کی آنکھوں کے
وہ آنسوؤں سے نہ دامن بگھوسکا ہوگا
مرے لئے وہ قبیلے کو چھوڑ کر آتا
مجھے یقین ہے یہ اس سے نہ ہو سکا ہوگا
(حسن نقوی)

مرسلہ: عائشہ شاعر۔ کراچی

☆

اس کے نزدیک غم ترک وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں
اب تو ہاتھوں سے لکیریں بھی مٹی جاتی ہیں
اس کو کھو کر تو مرے پاس رہا کچھ بھی نہیں
کل پھنچتا ہے تو پھر عہد وفا سوچ کے باندھ
ابھی آغاز محبت ہے گیا کچھ بھی نہیں

اور دکھ کے بھی
اور اگر تعبیر ہو
تو پھر مل کیوں گئے ہو
ہو سکتا ہے یہ میری خوش نہی ہو
اور میں ملنے اور پالینے کے
فرق کو سمجھ نہ پایا ہوں

(فرحت عباس شاہ)

مرسلہ: سید فیضان عثمانی - حیدر آباد

نظم

وہ چنچل اٹھیلی لڑکی میری نظمیوں پر ہوتی ہے
جیسے ان نظموں کا محور
اس کی اپنی ذات نہیں ہے
(یعنی اپنی سند لڑکی اور کوئی بھی ہو سکتی ہے)
جیسے اس کو علم نہیں ہے ساری باتیں اس کی ہیں
ساری گھاتیں اس کی ہیں
ہر آہٹ ہے اس کی آہٹ سب سائے ہیں اس

کے سائے

سارے عمل اس کے ہیں
ہر خوشبو اس کی خوشبو سب چہرے ہیں اس کے
چہرے

سارے آنچل اس کے ہیں
جیسے اس کو علم نہیں ہے اسی لڑکی کے سارے کام
سارے نام اسی کے ہیں
ہر کھڑکی ہے اس کی کھڑکی سارے باج اسی کے ہیں
اس لڑکی کے نام سے میں نے جو چھاپنے نام

لکھا ہے

اسی سے ہی منسوب ہوا ہے
(شاید میرا وہ ہم ہو لیکن میں نے محسوس کیا ہے)
جب میں نظم سناتا ہوں وہ آنکھ جمانے لگتی ہے
مجھ سے نظر پل پل جائیں تو وہ شرمائے لگتی ہے
کچھ لمبے وہ چنچل لڑکی کم صدم سی ہو جاتی ہے
لیکن تھوڑی دیر میں پھر سے پتھر کی ہو جاتی ہے
جیسے میری نظم کی لڑکی

(احمد اسلام احمد)

مرسلہ: ارم آغا - کوئٹہ

خنے ہیں خواب خوابوں میں رات بھر میں نے
غم یہ خواب نہیں فیصلے کو ان کو
کہ جو بھی خواب ہے اک فیصلے کا حامل ہے
کسی سے آپ ہی ہو جائے جب پرے کوئی
تو پھر بناؤ ایسے میں کیا کرے کوئی
جیسے تو کس کے لئے کس لئے مرے کوئی
پرائے درد کے زخموں میں کیا بھرے کوئی
کہ زخم عشق ہیں اور عشق ایک منزل ہے
کہیں سکون نہیں دھوپ میں نہ چھاؤں میں
نہ ہی خلوص کی خوشبو ہے اب دفاؤں میں
یقین رکھ کے محبت کی انتہاؤں میں
میں جا رہا ہوں بہت دوران فضاؤں میں
جہاں سے لوٹ کر آنا بہت ہی مشکل ہے
یہ ٹھیک ہے میرے پاس زرتیں کوئی
درست ہے میرا پنا گھر نہیں کوئی
بجا کہا میرا درد نہیں کوئی
میری نواؤں میں پنہاں اثر نہیں کوئی
مگر وفا کا شجر اتنا بے ٹمبھی نہیں
مجھے خبر ہے تو اتنا بے خبر بھی نہیں
کہ تیرا قرب سند نہیں ہے ساحل ہے
محاف کرنا میری جاں کہا سنا میرا

مرسلہ: عطا الرحمن - کراچی

نظم

خوشی کے ایک خواب سے نکلتا ہوں
دکھ کے ایک خواب میں آپڑتا ہوں
یہیں کہیں
یعنی بہت ساری تعبیریں کم کر بیٹھا ہوں
تعبیریں چاہے اچھی نہ بھی ہوں
ان کو کھود بنا
یا کم کر بیٹھنا
یا حاصل نہ کر پانا
دکھ کے خواب سے بھی زیادہ دکھ دینے والی بات ہے
خوشی کے ہر موڑ پر یہی سمجھتا ہوں
میں دکھ سے بھاگ آیا ہوں
اگر تم کو اب ہو تو خوشی کے بھی ہو

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے اڈیلین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس ماڈی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد ہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپروڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی سچائی کی دعا اور مسکین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعا کے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپروڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مدد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات کو منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔



- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود ہے تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔



88-C II - خیابان جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

بیان کر رہا ہوں۔ ان کا جواب علیحدہ علیحدہ دیجیے گا۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کے فضل و کرم سے حافظ قرآن ہوں لیکن میں صحیح زوانی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ باباجی! میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں میرے باپ اور میرے چچا ج کے لیے چلے جائیں۔ پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتادیں۔ آپ استخارہ کر کے بتائیں کہ میرے لیے جگہ کا بند و بست ہو جائے گا کہ نہیں؟ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

☆ بیٹے نعمان! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ روزانہ سورۃ یسین کی با آواز بلند تلاوت کیا کرو۔ والد سے کہو اللہ سے دُعا کیا کریں کہ وہ اپنے گھر ضرور بلائے۔

□ صوفیہ گوبرا نوالہ۔

○ باباجی! آداب! میں کافی عرصے بعد آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہو رہی ہوں۔ باباجی! اب سے چار سال پہلے میرے شوہر نے قرض لے کر پلاسٹک مولڈنگ کی مشین خریدی تھی ایک سال تک تو کاروبار چلا مگر اس کے بعد سے مشین بالکل بند پڑی ہے۔ گھر میں بہت پریشانی ہے۔ آپ کے وظیفے کی برکت سے میرے شوہر کو بینک سے لون ملا اور انہوں نے جگہ کرائے پر لے کر مشین سیٹ کر لی مگر ابھی تک

□ زاہدہ۔ مہجرات۔

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! میری بہن جس کی عمر 40 سال ہے وہ شادی شدہ ہے رات میں سو کر جب صبح اٹھتی ہے تو بستر سے اٹھا نہیں جاتا۔ اس کا وزن زیادہ ہے اور روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے۔ پیٹ اور کولہے کا حصہ بہت زیادہ موٹا ہے۔ میری بہن بے چاری بہت پریشان ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو لکھ کر بھیجوں۔ اس کے جسم میں جربی بہت ہے۔ میری بہن کی سانس بھی بہت زیادہ تیز ہے لیکن میری بہن اپنی جسمانی بیماری کی وجہ سے بہت مشکل محسوس کر رہی ہے۔ باباجی! آپ میری بہن کے لیے دُعا کریں اور دوا بھی ضرور بتائیں تاکہ میری بہن کو شفا ہو جائے۔

☆ بیٹی زاہدہ! اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ جسم میں درد وزن بڑھنے کی وجہ سے ہے۔ مناسب ہوگا غذا متوازن لے اور ایسا شفافی کا بہت زرد کرو۔ انشاء اللہ مکمل افاقہ ہوگا۔ آئندہ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھنا تاکہ تفصیل بتائی جاسکے۔

□ نعمان۔ پنڈی۔

○ باباجی! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں گے۔ میرے بہت سے مسائل ہیں جو میں بیان نہیں کر سکتا لیکن ان میں دو بہت اہم مسائل ہیں جو آپ سے

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجے کے لیے ہمارا نیا پتہ لوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتہ: II-C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کراشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7۔ کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 021-35893121

حفظ و امان میں رکھے اور آپ اسی طرح لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں۔

☆ بیٹے شاہد! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ بیٹے.....! اگر تم واقعی میں اس بچی سے مخلص ہو تو اپنے والدین کو اس کے گھر بھیج دو یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔

□ شمیمہ جمیل۔ کراچی

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ڈر و دشرف بہت پڑھو۔ تمہارے شوہر درست کہتے ہیں مگر بیٹی! والدین بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ تم ان سے ملنے ضرور جایا کرو اور کھڑے کھڑے جایا کرو۔ شوہر کو ساتھ مت لے جاؤ۔ بیٹی! والدین کی خبر گیری کرنا تمہارا فرض ہے۔ بھائی یا بھادج کے رویے کی وجہ سے جانا ترک مت کرو تا کہ زندگی میں تمہیں ہمیشہ اطمینان قلب رہے۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 71-71 بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ راجہ۔ روہڑی

☆ بیٹی راجہ! بڑا دکھ اور افسوس ہوتا ہے جب مسلمان گھروں کے افراد اٹلے سیدھے عملیات کروانے والوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ ایمان کی شدید کمزوری ہے اور یاد رکھو اللہ کے ہاں بھی اس کی معافی نہیں۔ پریشانی خوشی بیماری صحت سب خدا کی طرف سے ہے۔ خوشی میں شاکر بننا اور پریشانی میں صابر بننا ہی ایک مومن کا فرض ہے۔ اللہ سے خوب معافی مانگو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات نکالو اور ہر نماز کے بعد الحمد شریف چاروں نکل اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دم کیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کرو۔

□ ساجدہ۔ سیالکوٹ

☆ بیٹی ساجدہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ

کام شروع نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ جاتی ہے۔ میں بہت پریشانی میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ شوہر الگ پریشان ہیں۔ گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ برائے مہربانی آپ استخارہ نکال کر بتائیں کہ شوہر کا یہ کام ٹھیک ہے اور کسی نے کچھ کروایا تو نہیں ہے؟ کیونکہ ہمارے گھر میں بہت سکون اور محبت تھی مگر دو تین سال سے پتا نہیں کیا ہو گیا؟ برائے مہربانی جو لائی کے شارے میں مجھے جواب دے دیں کہ گھر اور کاروبار میں برکت ہو اور قرض جیسی لعنت سے نجات مل جائے۔ میرے شوہر بہت پریشان ہیں۔ بچے الگ خاموش رہتے ہیں۔ میرے شوہر کے کاروبار میں برکت کے لیے خصوصی دُعا کروائیں۔

☆ بیٹی صوفیہ! اللہ تمہارے مالی مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ وظیفہ جاری رکھو اور مدت پوری ہونے پر وظیفہ ترک مت کیا کرو بلکہ جاری رکھتے ہوئے مجھے مطلع کیا کرو۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ شاہد۔ جب

○ پیارے بابا جان! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ میرا نام زین ہے اور میرا شہر گوادر ہے۔ بابا جان! عرصہ دراز سے میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں لیکن بابا جان! وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ جب بھی بولتا ہوں تو گھر کے اندر بھاگ جاتی ہے۔ بابا جان! ”بچی کہانیاں“ میں آپ کا کالم پڑھا تو سوچا کہ اس سلسلے میں آپ سے راہنمائی حاصل کی جائے۔ بابا جان! پلیز میری مدد فرمائیں اور استخارہ کر کے مجھے بتائیں کہ یہ کام میرے لیے نقصان دہ ہے یا فائدہ مند؟ اُس کے بعد میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا اور بابا جان! اللہ آپ کو اپنی

ضرور خیرات کیا کرو۔ جہاں تک بچی کا تعلق ہے تو تم لوگ معاملات میں خاموشی رکھو۔ کوئی فیصلہ بھی جلد بازی میں مت کرنا۔ مجھے 21 روز بعد صورت حال سے آگاہ کرو۔

□ سیما۔ حیدرآباد۔

☆ بیٹی سیما! نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ مانندہ پڑھو اور دُعا کرو۔ یہی عمل بعد نمازِ عشاء کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ ضرور حالات میں مثبت تبدیلی آئے گی۔

□ سین۔ کونست

☆ بیٹی سین! اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وظیفہ کرنے سے تبدیلی تو آئی ہے اور یہی مثبت تبدیلی ہے۔ انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔ والدہ کی صحت اور تندرستی کے لیے دُعا گو رہو۔ بے شک ماں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وظیفہ مزید ایک ماہ جاری رکھو۔

□ منصور احمد۔ میرپور خاص

☆ بیٹے منصور! تمہیں براہ راست بھی جواب دیا ہے اور کالم کے ذریعے بھی جواب دے رہا ہوں۔ یقیناً تمہارے حالات بہت تکلیف دہ ہیں۔ ماں باپ کے سامنے اولاد دم توڑ دے، صرف اس لیے کہ علاج نہ ہو سکے کہ پیمانہ ہو، بہت تکلیف دہ بات ہے۔ جہاں لوگ روزانہ ہزاروں روپے ضائع کر دیتے ہیں وہاں ایسے بھی لوگ ہیں جو اولاد کا علاج ہی نہیں کروا سکتے۔ بہر حال بیٹے! دنیا میں ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ تم اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ بیٹے! میں جو بھی ہو سکا وہ ضرور کروں گا۔

□ راحت۔ ساہیوال۔

☆ بیٹی راحت! حالات اتنے سہل نہیں جتنے تمہیں نظر آ رہے ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تفصیل کے لیے جواب لکھنا ضرور ارسال کرنا۔

فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں ہے مگر بیٹی! کچھ باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ میرے اندازے کے مطابق بیٹی! تمہارے گھر پر اثرات ہیں جو تم لوگوں کو کافی پریشان کر سکتے ہیں اور تمہاری خوشیوں میں رکاوٹ بھی ڈال سکتے ہیں لہذا بہتر یہی ہوگا کہ جلد از جلد دونوں مسئلوں کے لیے مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ جب تک تعویذ تیار نہیں ہوتے روز بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ جن ضرور پڑھو۔ خط جوابی لگانے کے ہمراہ لکھو۔

□ رافعہ۔ حیدرآباد

☆ بیٹی رافعہ! تم نے ایک خط میں کئی مسئلے لکھ دیئے ہیں۔ بہر حال بہنوں سے کبھی شادی کے لیے بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ آحزاب پڑھیں۔ رزق میں برکت کے لیے سورۃ واقعہ پڑھنا بہت بابرکت ہے۔ جہاں تک بھائی کا تعلق ہے تو بھادج سے کبھی نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار آیت الکرسی پڑھ کر تصور میں شوہر پر دم کر دیا کرے۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ فریدہ۔ لہ

☆ بیٹی فریدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ منزل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بیٹی! تمہارے خواب نشاندہی کرتے ہیں کہ کوئی بہت قریبی شخص تم لوگوں کو پریشان کر کے خوش ہوتا ہے۔ خوب صدقہ خیرات کیا کرو۔ چلتے پھرتے گھر کے سارے افراد یازِ حمن کا ورد کریں۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ نضا بتول۔ کراچی

☆ بیٹی نضا! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ دل میں وہم مت لاؤ۔ کچھ نہ کچھ رقم اپنے اوپر سے

سات با دام ضرور کھایا کرو۔ مدت 41 روز ہے۔

□ علقن۔ دادو۔

○ باباجی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے وہ یہ کہ میری بس ایک بیٹی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں بڑھا لکھا نہیں ہوں اور یہ خط میں کسی دوسرے سے لکھوا رہا ہوں جب سنا کہ آپ ”سچی کہانیاں“ میں لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں تو سوچا میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو بتا دوں۔ میری شادی کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ ہم پر احسان کر کے تعویذ دیں کہ بیٹا ہو جائے اور ہم کو یہ بھی بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے حاصل کریں؟ ہم کو تو آپ کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔ بس آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں اور ایک تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے بس آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو ہمیشہ دُعا میں دیتا رہوں گا۔

☆ بیٹے علقن.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تم مجھے جوانی لفافے پر واضح پتا لکھ کر خط ارسال کرو تا کہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔ خط میں اپنا نام صحیح والدہ اور بیوی کا بھی مکمل نام لکھو۔

□ روزینہ۔ حیدرآباد۔

○ پیارے باباجی! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی دے۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پتے میں پتھری ہے۔ ہومیوپیتھک علاج کروا رہی ہوں۔ میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آپ کوئی ایسا ورد یا وظیفہ دیں جس کو پڑھنے سے بغیر آپریشن کے پتھری ریزہ ریزہ ہو کر پتے سے نکل جائے۔ وظیفہ وغیرہ کتنے دن پڑھنا ہے اور کتنی مرتبہ سارا تفصیل سے لکھ دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ باباجی! میری بڑی بہن

□ م۔ کراچی۔

○ باباجی! السلام علیکم! میرا نام ”م“ سے شروع ہوتا ہے۔ میری والدہ کا نام ڈا ہے اور میری عمر 18 سال ہے۔ باباجی! دو سال ہوئے مجھے نزلے کی شکایت ہے۔ میں نے ناک کی ہڈی کا آپریشن بھی کروایا اور اب ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ الرجی ہوگئی ہے اور نزلہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ باباجی! مہربانی فرما کر مجھے حل بتائے میں بہت پریشان ہوں۔ باباجی! میں نے نزلے کی وجہ سے پڑھائی بھی چھوڑ دی ہے اور صرف قرآن پاک ابھی پڑھ رہی ہوں۔ پلیز باباجی! مجھے جولائی کے شمارے میں جواب دیں۔

☆ بیٹی.....! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ڈرود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ رات کو سونے سے قبل ایک بڑے برتن میں کھولتا ہوا پانی لو اور اس میں خوب سارا نمک ملا کر بھاپ لو۔ یہ عمل 7-8 منٹ روز کرو۔ نہار منہ ادرک کے لمبے لمبے ٹکڑے نمک کے ساتھ توے پر بھون لو اور یہ 3-4 ٹکڑے بسم اللہ پڑھ کر کھا لو۔ انشاء اللہ افاتہ ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ ریاض خان۔ پشاور۔

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ جیسے اچھے لوگوں کا سایہ اللہ پاک ہمارے سر پر بہت دیر تک رکھے۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھائی میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے کوئی آسان وظیفہ دیں کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکوں۔ پیارے بابا! میرے لیے دُعا کرنا۔

☆ بیٹے ریاض.....! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ڈرود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح رُبِ زِدْنِیْ عَلْمًا کی پڑھو اور دُعا کرو۔ نہار منہ مجھے

□ راحیلہ ڈاکر۔ پشاور۔

o باباجی! آداب! باباجی! میں اپنے دیور کی شادی اپنی بہن سے کرنا چاہتی ہوں۔ استخارہ کر کے بتائیں کہ یہ رشتہ کیسا رہے گا اور اُن کی ازدواجی زندگی کیسی گزرے گی اور اُن کی شادی کا میری زندگی پر کوئی منفی اثر تو نہیں پڑے گا؟

☆ بیٹی راحیلہ.....! استخارہ حق میں ہے۔ تمہاری زندگی پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔ جب تک تم یہ نہیں سوچو گی کہ تم نے اپنی بہن پر احسان کیا ہے اور اُس کو اُس کا بدلہ دینا چاہیے۔ کسی سے کوئی امید مت رکھنا۔ سب خیر رہے گی۔

□ نسرین۔ سی۔

o محترم باباجی! السلام علیکم! سدا خوش رہیں! میرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً ایک سال پہلے میری شادی ہوئی تھی لیکن شوہر پتا نہیں کس مزاج کا ہے کہ میں اُسے سمجھ نہیں سکی۔ میں تو اُس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہوں اور یہ مجھ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا، نہ ہی خود سے کوئی بات کرتا ہے۔ میں کروں تو جواب دے گا ورنہ نہیں۔ جیب خرچ کے نام پر ایک روپیا نہیں دیتا۔ میری ضرورت میری امی پوری کرتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں یہ بھی مجھ سے محبت کرے میری ہر بات مانے اور میرے بغیر ایک منٹ نہ رہے۔ اب میں پانچ مہینے سے اپنے سیکے میں ہوں لیکن یہ فون تک نہیں کرتا۔ ملنا تو بہت دور کی بات ہے، بہن طعنہ دیتی ہے کہ پتا نہیں کب اپنے گھر جائے گی؟ بابا جی! میں بہت بے زار ہوں، خودکشی حرام نہ ہوتی تو اب تک کر چکی ہوتی۔ پیارے باباجی! کوئی ایسا عمل بتائیں کہ یہ میرے بغیر نہ سکے اور اپنی غلطی تسلیم کر کے مجھے لے جائے۔

☆ بیٹی نسرین.....! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح

کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ وہ بھی آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ اُس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں کہ بغیر آپریشن کے پتے سے پتھری نکل جائے۔ ساری عمر آپ کو ڈو عائیں دیں گے۔

☆ بیٹی روزینہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ڈروڈ شریف بہت پڑھو۔ دن میں جس وقت سہولت ہو، ہزار بار یا ساسلمی پڑھ کر پانی کی بڑی بوتل پر دم کرو اور پھر یہ پانی دن بھر چتی رہو۔ دن بھر میں تمہارے کم از کم دس گلاس پانی کے ہونا چاہئیں۔ یہ عمل 14 دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ بہن سے کہو وہ بھی یہی عمل کرے۔

□ ایلا خان۔ بلوچستان۔

o محترم باباجی! السلام علیکم! میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔ باباجی! جس طرح آپ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں، اِس کا اجر اللہ آپ کو دونوں جہاں میں دے۔ باباجی! ہم بھی آج ایک مسئلے لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ وہ مسئلہ میرے کزن کا ہے۔ باباجی! کچھ عرصے پہلے اُس نے کاروبار شروع کیا جو بہت اچھا چل رہا تھا مگر اب بالکل نہیں چل رہا۔ وہ بہت پریشان ہے کیونکہ اُس کا سارا سرمایہ اِس کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ باباجی! آپ ہمیں ایسا وظیفہ دیں جس کے کرنے سے کاروبار بہت ترقی کرے۔ ہم آپ کو تمام عمر ڈو عائیں دیں گے۔ آپ نے اس سلسلے میں ایک بہن ساجدہ کو جو وظیفہ دیا تھا میں وہ وظیفہ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ وظیفہ کرنے کی بھی اجازت دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی، شکریہ۔ اللہ حافظ! اگر کوئی غلطی ہوگی تو تو معاف فرمائیں۔

☆ بیٹی ایلا.....! وظیفہ کی اجازت ہے، بس خیال رہے نماز قضا نہ ہو۔ وظیفہ مکمل ہونے پر کچھ رقم ضرور خیرات کر دینا۔

ہو جائے۔

☆ بیٹی نصرت! اب تو یہ کا وقت گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو بہت موقع دیتا ہے مگر بندہ بہت نافرمان ہے۔ تمہارے گناہ بہت بڑے ہیں انسان ہونے کے ناتے میں تمہیں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ تو یہ کرتی رہو شاید وہ پاک ذات معاف کر دے۔ تمہارے پھوڑوں میں جو کیڑے بڑگئے ہیں، اُن سے نصن مت کھاؤ۔ وہ عذاب الہی ہے۔ کاش بیٹی.....! تم نے اپنے برائی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک لیے ہوتے۔ کاش.....! یہ جان لیا ہوتا کہ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اصل زندگی تو بعد میں شروع ہوگی۔ بہر حال میں تمہارے لیے صرف یہی دعا کر سکتا ہوں کہ اللہ تم پر اپنا رحم فرمائے۔

□ اسرار شد۔ بھوال۔

○ بابا جان! میرا مسئلہ حل کر دیں، میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔ میری شادی کو 8 سال ہو چکے ہیں اور اب تک اولاد سے محروم ہوں۔ لوگوں کے رویے اب مجھے بہت دکھ دیتے ہیں۔ آپ نے میری جیٹھانی کو تعویذ دیا تھا، اُن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اب پھر انہوں نے آپ سے تعویذ منگوایا۔ باباجی! پلیز مجھے بھی تعویذ تیار کر دیں تاکہ میری بھی اولاد ہو سکے۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ مجھے طریقہ کار سب بتا ہے مگر میری جیٹھانی نے کہا، آپ ہر ایک کو تعویذ نہیں دیتے لہذا پہلے اجازت لے لو۔ باباجی! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں، میری بھی مشکل حل کر دیں تاکہ میں اپنے سسرال میں خوش و خرم رہ سکوں۔

☆ بسمہ اسما.....! اللہ سے مدد مانگو، وہ ضرور تمہاری دعا قبول فرمائے گا۔ میں تعویذ تیار کر دوں گا، بس خیال رکھنا، تعویذ استعمال کرنے کا بھی خاص طریقہ ہے۔ اس پر عمل لازمی ہے۔ انشاء اللہ، کلام

سورۃ التاس کی پڑھ کر اپنے اور دم کر لیا کرو۔ شوہر سے ضرورت کے تحت بات کرو مگر اپنے فرائض خوش اسلوبی سے پورے کرو۔ تمہیں خود اپنے سسرال چلے جانا چاہیے۔ اپنے شوہر کو بلوا لو اور اپنے گھر چلی جاؤ۔ ساتھ رہو گی، خیال کرو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا ورنہ شوہر کو تمہارے بغیر رہنے کی عادت ہو جائے گی۔ بیٹی.....! بھعداری سے چلو، گھر بنانا بہت مشکل ہے اور ٹوٹنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ نصرت جہاں۔ کراچی۔

○ باباجی! بہت عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہی ہوں۔ باباجی! مسئلہ ہی کچھ بہت سنگین ہے۔ میں نے آج تک کوئی بھی اچھا کام نہیں کیا۔ دنیا کا ہر فیچ اور گناہ کا کام کیا۔ اس وقت میری عمر 45 سال ہے۔ تین مہینے قبل میرے جسم پر جگہ جگہ پھوڑے بننا شروع ہو گئے جن میں سے پیپ رستی رہتی ہے۔ میں نے فیصل آباد سے لے کر اسلام آباد تک تمام ڈاکٹروں کو دکھا دیا مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ علاج کروانے سے تکلیف 100 گنا بڑھ جاتی ہے۔ باباجی! میں جانتی ہوں، یہ میرے اعمال کا صلہ ہے مجھے دنیا کے لیے عبرت بنا دیا گیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرے گناہ بہت بڑے ہیں مگر باباجی! میں دل سے شرمندہ ہوں اور تائب ہونا چاہتی ہوں۔ لوگ مجھ سے کتراتے ہیں، بچے مجھے دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ میرے کھانے پینے کے برتن الگ کر دیئے گئے ہیں۔ گھر سے باہر کچا کمرانا کر دے دیا ہے جس میں میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں میری مدد کریں۔ کسی طرح اللہ مجھے معاف کر دے مجھے لوگوں کی اُن کے رویوں کی کوئی پروا نہیں، بس میری سزا معاف

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پہل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کمائیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے سچی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

مجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

□ راحیل۔ پنڈی

o باباجی! میں اکثر آپ سے رابطے میں رہتا ہوں۔ مسئلہ وہی ہے میری بیوی کی نافرمانی کا۔ اب تو دو بچے بھی ہو چکے ہیں مگر وہ کسی طور بھی نباہ کرنے کو تیار نہیں۔ آپ مجھے جیسے سمجھاتے رہے، میں ویسے ہی چلتا رہا، ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی مگر بے فائدہ۔ وہ اب بھی اپنی ضد پر قائم ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا اور بچے بھی تم ہی رکھو۔ باباجی! اب بتائیں ان حالات میں میں کیا کروں؟ گھر والوں کے سامنے بہت شرمندگی ہوتی ہے اور اب تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جن بچوں کی خاطر یہ سب برداشت کر رہا ہوں وہی ان حالات میں بہت سہجے ہوئے رہتے ہیں۔ ان کے چہرے پہلے ہیں اور بچوں والی کوئی شرارت ان میں نہیں۔ باباجی! میں نے ہمیشہ آپ سے مدد چاہی، آپ نے جیسے کہا، ویسے ہی کیا، اب بتائیے، کیا کروں کہ اب تو میرے اعصاب بھی جواب دے رہے ہیں۔

☆ بیٹے راحیل! تم نے اپنی جانب سے مکمل کوشش کرنی، اب مناسب یہی ہے کہ اپنی بیوی کو فارغ کر دو۔ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے، اس کو تباہ مت کرو، پرسکون ذہن کے ساتھ بچوں کی تربیت کرو۔ دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں جو کسی کی اولاد کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتے ہیں۔ تم نے ہر طرح سمجھا کر دیکھ لیا، نرمی سے بھی اور سختی سے بھی لہذا اب تم پر کوئی بوجھ نہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ دو لوگ اکثر ساتھ نہیں چل پاتے تو عزت سے الگ ہو جانا ہی بہتر ہے۔ اس کا حق مہر ادا کر دو۔ جو زیور اس کو دے چکے ہو، واپس مت لو۔ عزت کے ساتھ معاملے کو نٹا دو، بس اب یہی بہتر ہے۔ یا فقہار کا بہت ورد کیا کرو۔ اللہ ہر اپنا کرم ضرور فرمائے گا۔

الہی کی برکت سے ضرور کرم ہوگا۔ خط میں مکمل کوائف ارسال کرنا۔

□ نوشین ظفر۔ شاہدرہ۔

o باباجی! میں بہت بد نصیب عورت ہوں۔ پہلی شادی بھی اپنی مرضی سے کی اور ایک بچے کے بعد طلاق ہو گئی۔ گھر میں بھائی بھادج کا رویہ بہت خراب تھا اس لیے میں نے دوبارہ اپنی مرضی سے دوسری شادی کر لی۔ میرے دوسرے شوہر کے پہلے سے دو بچے تھے اور ان کی پہلی بیوی ان کی کزن بھی تھیں۔ شروع میں تو سب ٹھیک رہا لیکن اب ان کا رویہ مجھ سے بہت خراب ہو رہا ہے۔ میرے بیٹے کو تو بالکل بھی برداشت نہیں کرتے۔ میرے دو بچے ان سے بھی ہیں، ان کو بھی وہ پیار نہیں ملتا جو ان کا حق ہے۔ ساری توجہ پہلی اولاد کی طرف ہے۔ میں کچھ بولتی ہوں تو لڑنے مرنے لگتے ہیں، بہت برا بھلا کہتے ہیں۔ باباجی! میں بہت غریب گھر سے ہوں، پلٹ کر واپس بھی نہیں جاسکتی۔ اب تو تین بچوں کا ساتھ ہے۔ باباجی! میں چاہتی ہوں، میرے شوہر ہم لوگوں سے محبت کریں اور کم از کم ایک گھر میرے نام کر دیں۔ وہ بہت پیسے والے ہیں، مجھے کم از کم ایک آسرا ہی ہو جائے۔ باباجی! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں، میرا مسئلہ بھی حل کر دیں، میں اور میرے بچے بھی آپ کو ڈعا میں دیں گے۔

☆ بیٹی نوشین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بعض اوقات انسان ایک کے بعد ایک غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ بہر حال جو ہوا، سو ہوا، اب تم نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ یسین پڑھو اور دُعا کرو۔ خیال رہے، جہاں جہاں لفظ ”یسین“ آئے، وہاں رک کر 7 بار سورۃ فاتحہ پڑھو پھر دُعا کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔

سال ہے۔ 3 بہنیں ہیں اور بوزھی والدہ۔ مجھ سے چھوٹے بھائی کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ لاش بھی نہیں ملی۔ میری ماں اس تم میں رورور کر اندھی ہو گئی۔ باباجان! کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ ہمارے حالات اس قابل تو ہوں کہ پیٹ بھر کر کھا سکیں، تن ڈھانپ سکیں۔ اللہ آپ کو اس کا اُجردے گا۔

☆ بیٹے غالب! اللہ تم کو حوصلہ دے۔ بے شک دنیا میں بہت اچھے اچھے لوگ بھی ہیں اور انہی کے دَم سے دنیا چل بھی رہی ہے۔ میری وہ بیٹی بھی ہمیشہ سب کے کام آتی ہے۔ دُعا کرو کہ وہ خود خیریت سے ہو کیونکہ بہت عرصے سے میرا رابطہ بھی نہیں ہے۔ بیٹے.....! بہنوں سے کہو بعد نماز فجر ایک بار سورۃ آل عمران ضرور پڑھیں۔ اللہ سے دُعا کریں وہ ضرور غیب سے کوئی سبب پیدا کرے گا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ زینب۔ جھگ۔

☆ بیٹی زینب! تمہارا مسئلہ قابل اشاعت نہیں۔ بہ کثرت تو یہ استغفار پڑھو اور بہتر ہوگا مجھ سے تعویذ منگولو۔ کلامِ الہی کی موجودگی میں شیطان قریب نہیں آتا۔
□ غالب کمال۔ لاہور۔

o باباجان! مجھے میرے ایک دوست نے آپ کا پتا دیا۔ آپ کے کہنے پر ایک بہن صاحبہ نے اُس کی بہت مدد کی اور اب وہ اپنا چھوٹا سا کاروبار کر رہا ہے۔ باباجان! کیا وہ بہن صاحبہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتیں؟ میں بھی بہت پریشان ہوں ایسا نہیں ہے کہ محنت نہیں کرتا، محنت بہت کرتا ہوں مگر باباجان! آپ جانتے ہیں کہ مہنگائی نے کمر توڑی ہے پھر حق دار کو حق بھی نہیں ملتا۔ انتہائی غریب گھر کا ہوں لہذا کہیں کوئی سنوائی نہیں۔ میری عمر اس وقت 35

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

II C-88 فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل، انٹرنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیئر-7، کراچی



معروف شعراء کے مجموعہ کا نام پر سیر حاصل تبصرے

وقت کی دستک

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

کیا وہ (اقبال) بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کے نبی پر قرآن حکیم، اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا تھا؟ علامہ نے اس سوال کا جواب کچھ اس طرح دیا ”جناب، وہ (اللہ) تو قادر مطلق ہے مجھ جیسے عاصی بندے پر بھی بسا اوقات کوئی شعر یا مصرع بنا دیتا نازل ہو جاتا ہے۔“

تاہم ایک یہ استثنائی کیفیت ہے۔ عام حالات میں (معیاری) شاعری بچوں کا کھیل نہیں۔ حضرت امیر مینائی نے درست کہا تھا

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مہرہ ترکی صورت
تو گویا شعر (خصوصاً غزل کے شعر) کی تخلیق،

آپ اور آرد کے سبندھ سے ہوتی ہے۔ اب یہ شاعر کے خیال کی پرواز اور زبان و بیان پر اس کی گرفت پر منحصر ہے کہ وہ کس مہارت سے اپنے شعر کو الفاظ کا جامہ اور معانی کی روح عطا کر کے اہل بصیرت کے سامنے پیش کرتا ہے۔

پاکستان کے ایک نامور شاعر اور بیوروکر ایٹ سید ہاشم رضا نے اپنی خود نوشت ”Our Destination“ میں ایک جگہ لکھا ہے ”شاعری اور

”شاعری ادب کے ماتھے کا جھومر ہے۔ یہ ادب کا مقصد بھی ہے اور حتمی انجام بھی۔ یہ انسانی ذہن کی اعلیٰ و ارفع سوچ کی مظہر ہے۔ یہ حسن اور لطافت کے حصول کا نام ہے۔ نثر نگار اس مقام سے دامن بجاتا ہے جہاں سے شاعر باسانی گزر جاتا ہے۔“ شاعری کی اہمیت اور نثر پر اس کی فوقیت کا سکہ بٹھانے والے یہ زور دار الفاظ نامور انگریز ادیب سر سٹ ہاہم کے ہیں۔ میں خود بھی اسی ”مسلک“ کا پیرو کار ہوں۔

میں ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتا جو کہتے ہیں کہ شاعری تو چلتے پھرتے بھی ہو جاتی ہے، نثر کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے بیٹھنا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک چلتے پھرتے ہو جانے والی شاعری بس ”چلتی ہوئی“ ہوتی ہے۔

قاری اسامح پر اس کا کوئی دیرپا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر سے بھی کبھار کوئی شعر / مصرع بیباختہ بھی سرزد ہو جاتا ہے جیسا کہ علامہ اقبال سے منسوب ایک واقعے سے پتا چلتا ہے۔ علامہ کے ایک استاد اور گرم فرما پروفیسر آرٹلڈ نے ایک بار ان سے طنز آمیز تجزیہ کے انداز میں سوال کیا کہ

میں اپنی خاموشی میں بولتی ہوں
 مؤخر الذکر شعر پڑھ کر میرے ذہن میں
 کارلائل کا یہ مشہور قول گونجنے لگا: Silence
 is more eloquent than
 words (خاموشی الفاظ سے زیادہ خوش گنتا ہے۔)
 ”وقت کی دستک“ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ شاعرہ
 وقت کی پکار پر گوش برآواز ہے۔ اُس کی شاعری میں
 نہ صرف جدید نظریات ملتے ہیں بلکہ اُس کا اسلوب بھی
 انفرادیت اور بر جستگی سے مملو ہے۔ غزل ایک نازک
 اور قدرے چلبلی صنف سخن ہے۔ اُس کا سخن وہی ادا کر
 سکتا ہے جسے اپنی بات مؤثر انداز میں کہنے کا ڈھنگ
 آتا ہے۔ اس میں ذرا سی بے احتیاطی یا ج رومی غزل
 کو عامیانا سطح پر گرا دیتی ہے۔

ڈاکٹر زہت نے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے
 کہ اُن کا کلام کہیں بھی یکسانیت، فرسودگی اور سلیخت کا
 شکار نہ ہو۔ انہوں نے سیاست، سماجیات، روز و شب،
 معرکہ حق و باطل، معاشی ناہمواری، شہرت کی ہوس،
 مسجداؤں کی سفاکی جیسے تنگ (لیکن راج الوقت)
 موضوعات کو بھی غزل کی رومان پرور نفا کے تناظر
 میں برتا ہے (میں متعلقہ موضوعات کے شعری
 حوالوں سے اس مضمون کو پوچھ نہیں کرنا چاہتا
)۔ ڈاکٹر زہت عباسی اپنے کلام کی اس خوبی کا پورا
 ادراک رکھتی ہیں۔ کہتی ہیں

نئے خیال، نئے فلسفوں کی بات کرو
 نئی حیات نئی منزلوں کی بات کرو
 ابھی تلاش ہے مجھ کو جہان تازہ کی
 نئی صدی میں نئے راستوں کی بات کرو
 نئی دنیا کا نقشہ دیکھتی ہوں
 پھر اس نقشے میں خود کو ڈھونڈتی ہوں
 یہ بھی اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جدید
 موضوعات کے ساتھ ساتھ کوئی ذی فہم شاعر غزل کے
 قدیم اور روایتی مضامین سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ
 بقول غالب ع نبتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے
 بغیر۔ لیکن ڈاکٹر زہت عباسی نے اُن باہمال
 موضوعات کو بھی اپنی فکر کی تازگی سے حیات نو جستجی
 ہے۔ یوں بھی بقول صابر ظفر

غربت میں ہمسائیگی کا رشتہ ہے۔“ واقعی، شاعری میں
 دولت نہیں لیکن دولت میں شاعری بھی تو نہیں۔ اس
 لحاظ سے دونوں میں ایک ”عمومی“ کا رشتہ بھی ہے۔
 فرق یہ ہے کہ دولت والا مزید دولت کی خاطر
 کڑھتا رہتا ہے جبکہ شاعر اپنی دولت استغنی پر قناعت
 کرتے ہوئے بے نیازی سے کہتا ہے ہم خاک
 نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے (جگر)۔

ڈاکٹر زہت عباسی قافلہ سخن وراں کے ایک
 رکن کی حیثیت سے اپنی منزل کی جانب سبک رومی
 سے گامزن ہیں۔ ”وقت کی دستک“ اُن کا
 دوسرا مجموعہ کلام ہے جس میں غزل کا غلبہ ہے۔ ابھی
 اُن کا فن اور سن اس مرحلے پر تو نہیں پہنچے کہ وہ
 زمانے کو اپنی ٹھوکر پر ماریں البتہ اُن کی خود اعتمادی
 اُن سے کھلوانی ہے

سچ بھی کہنے سے اب نہیں ڈرتی
 اتنی بیباک ہو گئی ہوں نہیں
 شاعری ڈاکٹر زہت عباسی کی علمی کاوشوں کا
 محض ایک پہلو ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے
 تحقیق، تدریس، تنقید اور نثر نگاری پر بھی بھرپور توجہ
 مرکوز کر رکھی ہے۔

”اردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب و
 لہجہ“ یعنی اُن کا مبسوط مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ وہ نظریات
 خاموش طبع اور کسی حد تک ”مجلس گریز“ ہیں۔ چنانچہ
 مشاعروں، مباحثوں اور ادبی جوہالوں میں شرکت
 سے حتی المقدور پرہیز کرتی ہیں اگرچہ انتہائی خلیق،
 موضوع اور منسک امر آج ہیں۔ ایسے لوگ فضولیات
 میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے ٹھوس اور مثبت
 کاموں میں منہمک رہتے ہیں اور جلوت میں بھی
 خلوت کے مزے لوٹتے ہیں۔ ڈاکٹر زہت کے حسب
 ذیل اشعار سے اُن کے مزاج اور ذہنی رحمان کا بخوبی

اندازہ ہو جاتا ہے

تھے جلوتوں کے ہجوم مجھ میں
 میں خلوتوں کے خمار میں تھی
 ہے خموشی ہی مسئلے کا حل
 بات اُلجھے گی اب وضاحت سے
 مری اک چپ ہی میری گفتگو ہے

گھری ہوئی ہے طوائف تماشا بیوں میں
بدقسمتی سے آج بھی ملکی سیاست ہوس ناکی کا
شکار ہے۔ نزہت عباسی نے ٹھیک کہا
اجالوں کی جگہ ظلمت نے لے لی
سیاست کی سیہ کاری ہے اب بھی
پڑیں منظر بدلتا رہتا ہے
آج کے دور کی سیاست بس!
تھیں سیاست کی بھی عجب چالیں
کھیل سب سازشوں کی زد میں تھا
جہاں سیاست کا یہ حال ہو وہاں سیاست داں
بھی اپنے ہاتھ دکھاتے ہیں۔ ہمارے رہنماؤں کے
کرتوتوں کا ایک یہ رنگ بھی ملاحظہ کیجئے
شعبدے ہیں جو اب سیاست کے
قوم کو دان کر دیے تم نے
تم ہمیشہ رہزن پر ہی لگاؤ تہمت بس!
راہ میں جو رہبر ہی ہم کو لوٹ جائے تو
دوسرے شعر میں حمایت علی شاعر کے اس

مشہور شعر کا عکس نظر آتا ہے
رہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میر کارواں یارو، میر کارواں یارو!
شاعر نے بگاڑ کے بنیادی عوامل کی بھی ٹھیک
ٹھیک نشاندہی کر دی ہے
ہم کو متاع قوم کے لئے کا غم نہیں
ہم نے شکست و فتح کے اسباب کھو دیے
بدقسمتی سے علم و ادب اور تعلیم و تربیت کا شعبہ
بھی بگاڑ سے نہ بچ سکا۔ نزہت کہتی ہیں اور بالکل
درست کہتی ہیں
علم، ہنر اور فن تو اب متروک ہوئے
کھوئے سکے چلتے ہیں بازاروں میں
شاعری کی کامیابی کا راز اس میں نہیں کہ لکھتے
وقت شاعر کے جذبات کیا تھے بلکہ اس میں ہے کہ
پڑھتے وقت قاری کے احساسات کیا ہیں۔ جب یہ
دونوں ایک wavelength پر آجاتے ہیں تو
شاعری ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور
معاشرے میں صحت مند اقدار کے فروغ کا ذریعہ بن
جاتی ہے۔ شاید اسی لیے امریکہ کے ایک آنجنابی صدر

لکھنے والا جو اسے اپنے لہو سے لکھے
کوئی مضمون بھی باہال نہیں ہو سکتا
اس مجموعے میں ایک غزل مسلسل محبت اور ایک بجر
کے موضوع پر شامل ہے۔ متفرق موضوعات پر ڈاکٹر
نزہت کے چند اشعار کا اعادہ بے جا نہ ہوگا
میں سوئے دل کی تپش سے بھی شاد
عجب سی لذت شرار میں بھی
لاکھ روشن کرد تم اپنی وفاؤں کے چراغ
میرا ایقان مگر ڈوب گیا ہے مجھ میں
وسعت کون و مکال کی کوئی حد بھی ہے نہیں
مجم حیرت ہے تو پھر دید کی گنجائش ہے
بے دھیانی بھی ہے دھیان میں کیا
سے حقیقت بھی کچھ گمان میں کیا
ساری دنیا کے خزانے بھی میسر ہوں جسے
ہاتھ بھی اُس کا کشادہ ہو ضروری تو نہیں

”وقت کی دستک“ کی مناسبت سے
ڈاکٹر نزہت عباسی نے وطن عزیز (خصوصاً کراچی)
میں امن عامہ کی بگڑتی ہوئی صورت حال کو بھی اپنے
مخصوص دل گداز پیرائے میں اُجاگر کیا ہے۔ یہ اشعار
ملاحظہ ہوں

سارے شہر پر چھائی ہے اک خوف کی فضا
جو امن کی ہوا میں تھیں مسموم کیوں ہوئیں
سانحہ آج پھر ہوا کیا ہے
شہر کی یہ عجب فضا کیا ہے
بچے خوف سے گھر سے باہر نہ نکلیں
دھول اُڑتی ہے گلیوں میں چو باروں میں
ایک پوری نظم میں ’سانحہ ہلدیہ ناؤن
‘(۱۱ ستمبر ۲۰۱۲ء) میں کام آنے والے محنت کشوں کی
مرگ ناگہانی کا نوحہ اور اُن کے پسامندگان کی بے
چارگی کا نقشہ پُر سوز انداز میں کھینچا گیا ہے۔ مثلاً یہ
شعر دیکھیے

چلتے بیچتے انگارے ہیں اشک نہیں ہیں آنکھوں میں
غم کی تمازت جھلساتی ہے خواب کے منظر راہ ہوئے
ہمارے ملک کی سیاست کیا ہے، ایک سیاہی ہے۔ اب
سے نصف صدی قبل (غالباً) شورش کا شیریں نے کہا تھا
مرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو

غزل

میں سوئی تو زخمِ نہاں بولنے لگا
سانا میرے گھر میں کہاں بولنے لگا

دی بارشوں نے آتشِ خاموش کو زباں
چلنے لگی ہے آگِ دھواں بولنے لگا

اک عمر بازگشتِ صدا اپنی ہی سنی
میں چپ ہوئی تو سارا جہاں بولنے لگا

مجھ کو بتا رہا ہے سفر کی صعوبتیں
رستے کو مل گئی ہے زباں بولنے لگا

اک دو قدم بھی ساتھ مرے جو گیا نہیں
وہ ہمسفر ہے آج نکاں بولنے لگا

توڑا تھا اک صدانے جو صدیوں کا وہ سکوت
اک گنِ فکاں سے کون و مکاں بولنے لگا

ڈاکٹر نرہت عباسی

جان ایف کینیڈی نے شاعری اور اقتدار کا موازنہ کرتے ہوئے کہا تھا ”جب اقتدار انسان کو سخت کی طرف دھکیلتا ہے تو شاعری اسے اس کی کمزوریوں سے آگاہ کرتی ہے، جب اقتدار انسان کی سوچ کے دائرے کو محدود کر دیتا ہے تو شاعری اسے اپنے وجود کی لامتناہی وسعتیں یاد دلاتی ہے۔ جب اقتدار انسان کو بدعنوانی پر بائیل کرتا ہے تو شاعری اس کے باطن کو پاک صاف کرتی ہے۔“

ڈاکٹر نرہت نے بھی اپنے ایک شعر میں یہی مضمون باندھا ہے۔ کئی ہیں
انسان کے شعور کی وسعت کا کیا بیاں
اس کی ذہانتوں کا بھلا کیا شمار ہو
مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نرہت عباسی نے اپنے کلام کو محض ذہنی لذت و فرحت کے حصول کا آلہ کار نہیں بنایا بلکہ اصلاحِ احوال کی بے خلوص کوشش بھی کی ہے اور تازہ مشفق کا روپ دھارے بغیر سیدھے سادے لیکن فکر انگیز انداز میں اپنے پیغام کا ابلاغ کیا ہے۔

یہاں ہیں خون کے رشتے اجنبی سے
یہاں سب کے روپے اجنبی سے
زندگی کا ہو کوئی تو مقصد
زیست یوں ہی بسر نہ ہو جائے
ساری دنیا کے خزانے ہی میسر ہوں جسے
ہاتھ بھی اس کا کشادہ ہو ضروری تو نہیں
بھٹک نہ جائے کہیں کاروانِ فکر و عمل
شبِ سیاہ میں بیداریوں کی بات کرو
بہت احساں جتانے سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے
بہت ایثار و قربانی کے جذبے مار دیتے ہیں
”وقت کی دستک“ سنجیدہ، مثبت اور مقصدی

شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ تاہم اس کے چند اشعار نے میری رگِ ظرافت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ضرور کی۔ اولاً میں نے یہ دیکھا کہ ڈاکٹر نرہت عباسی نے جو ایک اُستاد ہیں لاشعوری طور پر سبھی متعدد مقامات پر اپنی ”اُستادی“ کے جوہر دکھائے ہیں۔ مثال کے طور پر، معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار کہتے وقت ڈاکٹر صاحبہ ذہنی طور پر کلاسِ روم میں تھیں

کرتے رہے اور اس کے بعد اس مشکل ترین سوال کا یہ آسان ترین جواب لکھ ڈالا۔
 طول شب فراق جو ناپا گیا غریب
 لیلے کی زلف سے ہوا دو چار ہاتھ تم
 ڈاکٹر نزہت عباسی یقین کامل
 (conviction) اور اعتماد گلی (credence) کی
 شاعرہ ہیں۔ شاعری اگر واقعی و نور جذبات کے فطری
 بہاؤ کا نام ہے (جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے) تو اُس کی
 بہترین مثال ڈاکٹر نزہت عباسی کے یہاں نظر آتی
 ہے۔

یہ کلام الفاظ اور افکار کا ایک مترنم استخراج
 ہے۔ اُن کے ہر شعر سے اُن کے علم، مشاہدات اور
 تجربات کی عکاسی ہوتی ہے۔ انداز بیان اتنا سلیس،
 واضح اور رواں ہے کہ اس میں تعقید و تکلف کا شائبہ
 بھی نظر نہیں آتا۔ یہ کلام کسی ماورائے ادراک دنیا
 (Surreal world) کے لیے نہیں۔

یہ اسی جہان خراب کا آئینہ ہے۔ چنانچہ اسے
 پڑھتے وقت ایک غیر مرئی اپنائیت کا احساس ہوتا
 ہے۔ آج کل شاعری کے جو دھڑا دھڑ مجموعے بازار
 میں آرہے ہیں میں اُن کا بھی خیر مقدم کرتا ہوں کہ وہ
 بہر حال فرط اس و ظلم کے رشتے کو قائم رکھے ہوئے
 ہیں۔ تاہم جب کوئی کلام اپنی تخلیق اور پیشکش میں
 منفرد ہوتا ہے تو وہ خود اپنی ستائش سے مترا ہو جاتا
 ہے۔

اردو ادب میں شعراء نے اپنے منہ میاں مٹھو
 بننے کی روایت کو ”تعلی“ سے تعبیر کر کے جائز قرار دیا
 ہے۔ ڈاکٹر نزہت اس کے برعکس اپنی سر نفسی کا
 اظہار کرتے ہوئے بہت ہی ہلکے
 قول فیصل نہیں تردید کی گنجائش ہے
 میری تحریر میں تنقید کی گنجائش ہے
 جب کوئی فنکار یہ روش اختیار کر لیتا ہے تو اُس کا فن
 روز بروز گھبرتا جاتا ہے۔

میں میدان شعر و ادب میں ڈاکٹر نزہت
 عباسی کی مزید کامیابیوں اور کامرانیوں کے لیے دعا
 گوہوں۔

☆☆.....☆☆

کیا جواب لکھیں گے ہاتھ ہیں قلم لیکن
 زندگی کے پرچے کا ہر سوال دیکھیں گے
 اک زمانے کی آزمائش ہے
 ایک لمحے کے امتحان میں کیا
 میں اسے حرف حرف پڑھتی ہوں
 وقت تعلیم ہو گیا مجھ میں
 یا پھر امتحانی پرچے کے انداز میں پوچھے گئے یہ سوال
 کہ: مختصر الفاظ میں بیان کیجیے

آنکھیں ہماری خواب سے محروم کیوں ہوئیں
 آباد بستیاں تھیں یہ معدوم کیوں ہوئیں
 وہ بھی شریک جرم محبت رہا، مگر
 ساری سزائیں پھر مرا مقوم کیوں ہوئیں
 یہ شعر دیکھیے جس میں کلم کلم کھلا مجھ خاکسار پر چوٹ کی گئی
 ہے

فرق کچھ نہیں پڑتا ایک جیسے ناموں سے
 آدمی کو جانا ہے ہم نے اُس کے کاموں سے
 گویا مجھے یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ میں
 ”دلقلم خود بخود“ جو پاکستان کے ایک سابق
 (امریکی برائڈ) وزیر اعظم (ڈاکٹر معین قریشی) کا ہم
 نام ہوں تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ آدمی کی شناخت اُس
 کی حیثیت اور کارناموں سے ہوتی ہے۔ پس کہاں وہ
 ہستی ذی وقار اور کہاں میں بے ہنر و بے اختیار۔ فرق
 صاف ظاہر ہے!

زیر نظر کتاب کے ایک شعر سے میرے ذہن
 میں بہت عرصے قبل پڑھا ہوا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ پہلے
 شعر ملاحظہ فرمائیے۔ نزہت کہتی ہیں

اک سنافت ہے جیسے صدیوں کی
 کتنی لمبی ہے تیرے ہجر کی رات
 واقعہ یوں ہے کہ ریاضی کے ایک استاد جو اتفاق سے
 اردو کے شاعر بھی تھے اور غریب کھلے کرتے تھے ایک
 روز کلاس میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ کسی شریر
 طالب علم نے تختہ سیاہ پر اکیبر الہ آبادی کا یہ شعر لکھ رکھا

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
 طول شب فراق کو تو ناپ دیکھیے
 غریب صاحب شعر پڑھنے کے بعد چند لمحوں تک فکر

سفر کہانی

مختصر ترین پراک پاکستانی سفر

مسجد اقصیٰ

وسیع وعریض مسجد اقصیٰ اپنی مثال آپ ہے
یہاں ایک ایسا مقام بھی ہے جو مسلمانوں، یہودیوں
اور عیسائیوں کے لیے مقدس حیثیت رکھتا ہے۔

شیراز خان

پاکستانی پاسپورٹ دیکھنا چاہا مگر چونکہ اس کی معیاد ختم ہو چکی تھی اس لیے میں اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ میرا کینیڈین پاسپورٹ لیتے ہوئے انہوں نے مجھے انتظار گاہ کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ مجھے پہلے ہی ایسی صورت حال کی توقع تھی چنانچہ میں اپنے ساتھ اسرائیل پر سیاحتی گائیڈ لے آیا تھا جو میں نے وہاں پڑھنی شروع کر دی۔

تیس منٹ کے بعد ایک دوسرے کسٹم افسر کی جانب سے مجھے ایک کمرے میں بلایا گیا۔ انہوں نے مجھ سے اسرائیل آنے کا مقصد پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ میں نے کسی دوسرے ملک جانے کے بجائے اسرائیل آنے کا انتخاب کیوں کیا؟ وہ آہستگی اور احتیاط سے میرے جوابات کا اپنے کمپیوٹر میں اندراج کرتا رہا۔ کینیڈا منتقل ہونے کے بعد میرے پیشے کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ کرنے کے بعد انہوں نے مجھے ایک سفید کاغذ پر اپنا مکمل نام اور ای میل ایڈریس لکھنے کو کہا اور پھر اسی انتظار گاہ میں

میرا ہمیشہ سے یہ عزم تھا کہ کینیڈا کی شہریت اور پاسپورٹ ملنے کے بعد سب سے پہلے جس میں ملک میں جاؤں گا وہ اسرائیل ہوگا اپنے دوستوں سے اس سرزمین کے بارے میں ڈھیر ساری کہانیاں سننے کے بعد میرے جذبات کی کوئی انتہا نہیں تھی مگر میں بہت خوفزدہ بھی تھا کیونکہ ایسے لوگوں کے بارے میں بھی سن رکھا تھا جنہیں پاکستانی یا مسلم ہونے کی وجہ سے اکثر اسرائیلی کسٹمز حکام نے ملک میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔

۱۷ فروری ۲۰۱۶ء کو میں نے ڈھیر ساری دعاؤں اور مشوروں کے ساتھ اسرائیل جانے کے لیے برٹش ایئرز ویز کی پرواز پکڑی۔ میں مقامی وقت کے مطابق صبح پانچ بجے تل ابیب کے گورین ایئر پورٹ پہنچا۔ اسرائیلی کسٹمز پہنچنے پر ایک افسر بے جان آواز میں مجھ سے گفتیش کرنے لگا۔ کیا میں اسرائیل میں کسی کو جانتا ہوں؟ کیا مجھے عربی آتی ہے؟ کیا میں بھی مشرق وسطیٰ آیا ہوں؟..... اس نے میرا

جلدی سے والد کو فون کر کے اطلاع دی کہ میں بلاآ خر
یروشلم روانہ ہو رہا ہوں۔

تل ایب سے پینتالیس منٹ کی مسافت پر
موجود یروشلم یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے لیے
ایک مقدس شہر کی حیثیت رکھتا ہے یہ شہر مسلم، یہودی،
عیسائی اور آرمینیائی علاقوں میں بنا ہوا ہے۔ میں
دوپہر کو اولڈسٹی میں واقع اپنے ہاسٹل میں پہنچا وقت
ضائع کیے بغیر میں نے اپنا ٹیک کمرے میں چھوڑا اور
سب سے پہلے مسجد اقصیٰ جانے کا فیصلہ کیا۔ جفا
گیٹ (جو کہ اس قلعہ بند شہر کا ایک دروازہ ہے)
سے مسجد اقصیٰ کی طرف جانے والے راستے میں
خوبصورت روایتی بازاروں سے گزر ہوتا ہے۔

مسجد اقصیٰ کے دروازے پر اس وقت ڈیوٹی
پر موجود گارڈ نے مجھ سے پاسپورٹ دکھانے کو کہا اور

انتظار کرنے کو کہا

ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد ایک نوجوان
خاتون افسر مجھے ایک اور سوال جواب کے سیشن کے
لیے بلانے آئیں۔ میں ایسے کمرے میں بیٹھا تھا
جہاں یروشلم میں واقع قبۃ الصخرہ کی تصویر لگی تھی اور
اسرائیلی پرچم آویزاں تھا۔ مجھ سے اتنے سوالات
پوچھے گئے کہ خدا کی پناہ۔ وہ سیشن پچیس منٹ تک
جاری رہا۔ آخر میں مجھے بتایا گیا کہ وہ خاتون میری
فراہم کردہ معلومات کی تصدیق کریں گی۔

ایئر پورٹ لینڈ کرنے کے چار گھنٹے کے طویل
انتظار کے بعد ایک خاتون میرا پاسپورٹ تھامے
میرے پاس آئیں، انہوں نے مجھے ایک علیحدہ
کاؤنٹر پرویزا جاری کیا اور مجھے بیچ مشین کی جانب
جانے کی ہدایت دی۔ میں نے اپنا سامان اٹھایا اور



پیردکاروں کو دیکھ کر میرے اندر ایک آسودگی کی کیفیت اتر چکی تھی۔ یروشلم میں تین دن گزارنے کے بعد میں نے اپنے ساتھی مسافر جن کا تعلق ہندوستان سے تھا اور ان سے میری ملاقات ہاسٹل میں ہوئی تھی کے ساتھ بیت اللہم اور ہیر و (خلیل) جانے کا فیصلہ کیا۔

بیت اللہم یروشلم کے جنوب میں تیس منٹ کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ حصہ فلسطینیوں کے زیر اثر ہے اور یہاں چرچ آف نیپولی (حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش) موجود ہونے کی وجہ سے سیاحوں کے درمیان یہ شہر خاصا مقبول ہے۔

بیت اللہم سے ہم الخلیل پہنچے جہاں فلسطینی سول انتظامیہ اور اسرائیلی افواج دونوں کا کنٹرول ہے۔ اس شہر کی سب سے خصوصی بات الحرم الابراہیمی ہے یہ مقام مسلمانوں یہودیوں اور عیسائیوں تینوں ہی کے لیے مقدس حیثیت رکھتا ہے کیونکہ وہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، اور ان کی ازواج مطہرات کے مقبرے موجود ہیں دوسیکورٹی چیک پوسٹوں سے گزر نے کے بعد ہم اس مقام کی مسلم جانب پہنچے یہاں اسلام عیسائیت اور یہودیت تینوں ہی مذاہب کے مقدس پیغمبران مدفون ہیں۔ وہاں میں نے اپنے اندر ایک روحانی تسکین و تازگی کا احساس پایا۔

ہاسٹل میں میری ملاقات لیتھوانیا سے تعلق رکھنے والے ایک کینیڈین سیاح سے ہوئی تھی انہیں بھی اپنا ہم سفر بنا کر ہم نے رام اللہ جانے کا فیصلہ کیا جو مغربی کنارے پر واقع ایک فلسطینی شہر ہے۔ یہ شہر یروشلم سے ۳۵ منٹ کی ڈرائیو پر واقع ہے۔ اس دوران ہمیں کسی بھی چیک پوسٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا میرا ہاسٹل رام اللہ کے اندر موجود مرکزی بس اسٹیشن سے صرف ایک منٹ کے پیدل سفر پر واقع

میرے مسلمان ہونے کی تصدیق کرنے کے لیے مجھ سے سورۃ الفاتحہ پڑھنے کو کہا (غیر مسلمانوں کے لیے یہاں آنے کے لیے مخصوص کھٹے مختص کیے گئے ہیں) میں نے سورۃ پڑھی اور اندر داخل ہو گیا۔

یہ وسیع و عریض مسجد اپنی سادگی میں ہی اتنی شاندار اور اپنی مثال آپ تھی۔ مسجد میں عبادت گزاروں کی ٹھوڑی تعداد دکھائی دی۔ میں نے مسجد کی اندرونی آرائش کو دیکھنے کے بعد وہاں نماز پڑھی۔ مسجد کے سامنے سونے سے آراستہ قبۃ الصخر (ڈوم آف دی راک) ہے جو دنیا کی سب سے حیرت انگیز اور سب سے زیادہ فوٹو گراف کی گئی جگہوں میں ہے مسجد کا گنبد ہلکے نیلے رنگ کے آسمان کے نیچے بالکل واضح اور الگ تھلگ دکھائی دے رہا تھا۔ میں دیر تک اس سنبہرے گنبد کے سحر میں گم ہو کر انتہائی عاجزی سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ وہ مقدس مقام ہے جہاں سے آخری نبی حضرت محمدؐ نے معراج کے لیے آسمانوں کی جانب اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

اس کے بعد دیوار گریم یا مغربی دیوار گیا جو کہ ایک مقدس مقام کی حیثیت رکھتی ہے اور جہاں یہودیوں کو عبادت کرنے کی اجازت ہے۔ وہاں میں نے یہودیوں کو قدیم چونے پتھر کی دیوار کے سامنے رنج و غم کی حال میں دعائیں مانگتے دیکھا۔ اب میں نے چرچ آف سپلشر کا رخ کیا۔

یہ عیسائیوں کے لیے مقدس جگہ ہے وہ مانتے ہیں کہ مقام پر تاریخ کے سب سے اہم واقعات رونما ہوئے جیسے یہی وہ مقام ہے جہاں مسیح مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے تھے، کہا جاتا ہے کہ اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقبرہ موجود ہے۔

دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ مجھ میں ایک سکون سا گیا تھا تینوں جگہوں پر ان مختلف مذاہب کے

کھانے کی چیز ملی جو سب سے زیادہ خوش ذائقہ تھی۔ اس کے بعد میں حماد الشفاء میں سکون بخش ترک حمام سے محظوظ ہوا۔ وہاں سے نکلنے وقت میں خود کو ذہنی طور پر بہت پرسکون محسوس کر رہا تھا۔

نابلس زیتون کے تیل کے سب سے زیادہ صابن بنانے کے حوالے سے خاصا مقبول ہے اسی لیے میں بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر یہ صابن نئے کیسے ہیں؟ دوپہر ہو جانے کی وجہ سے تمام کارخانے بند ہو گئے تھے لیکن میں چھوٹی دکانوں سے کچھ مقامی طور پر بنائے گئے صابن حاصل کرنے میں کامیاب رہا اور انہیں دیکھ کر واقعی یہ اندازہ ہوا کہ یہ کیوں مقبول ہیں۔ اب اس شہر کو خیر آباد کہنے کا وقت آ گیا تھا میں نے بس پکڑی اور رام اللہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں سے یروشلم کے لیے ایک دوسری بس میں سوار ہو گیا اور اس کے بعد پھر تل ابیب پہنچا جہاں میں نے اپنے سفر کا آخری دن گزارا۔

اس ایک دن میں مجھ سے جتنا ہوسکا اس شہر کو دیکھا اور محسوس کیا۔ تل ابیب کے علاقے جفا جو کہ ایک مسلم اکثریتی علاقہ ہے میں نے بہترین ٹیونا پیزا کھایا۔ کچھ تحائف خریدے اور اولڈ جفا کے ساحل سمندر پر خوشگوار گرم دھوپ سینکنے کا موقع حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اس دن جمعہ تھا۔ اسرائیل میں یہ یوم سبت ہوتا ہے یہودیت میں آرام یا تعطیل کا دن۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھا اور شام ہوتے ہی سب کچھ بند ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اگلے دن میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس مقدس سرزمین سے کینیڈا روانہ ہونے کے لیے اپنا سامان سمیٹا لیکن میں اس بات سے کافی خوش تھا کہ اسرائیل دیکھنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہو چکی تھی۔

☆☆.....☆☆

تھا۔ رام اللہ میں ایک رات قیام کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ہم نے اپنا وقت ضائع کیے بغیر اپنے بیگز ہاسٹل میں پھینکے اور شہر کی سیر کو نکل گئے۔

رام اللہ ایک بروقی اور پچھلے سے بھرا فلسطینی شہر ہے اسی شہر میں فلسطینی لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کے سربراہ یاسر عرفات کا مقبرہ ہے ہم چند مقامی بازاروں سے گزر کر ایک میوزیم پر چند لمحوں کے لیے رکے اور شیشہ پیا۔ میں نے جہاں کہیں بھی شیشہ پینا ہے ان تمام کے مقابلے میں وہاں کے مشہور بلدنا کینے کا شیشہ اب تک کا بہترین شیشہ ثابت ہوا۔ ہم خوش قسمت تھے کہ وہاں چند دلچسپ مقامی افراد ہمارے دوست بن گئے تھے۔ آپ شاید یہ سوچ بھی نہیں سکتے ہوں گے کہ وہاں ایک کم و بیش عام سی زندگی گزار رہے ہیں۔ اسرائیل میں کسی دوسری جگہ کے مقابلے میں مجھے سب سے زیادہ لگژری گاڑیاں مغربی کنارے کے اس شہر رام اللہ ہی میں دیکھنے کو ملیں مگر میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ رام اللہ سے پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر مہاجرین کے کیمپس قائم ہیں جہاں بڑی تعداد میں فلسطینی انتہائی غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اگلے دن میں فلسطینی شہر نابلس گیا۔ مقامی بس کے ذریعے وہاں پہنچنے میں مجھے ایک گھنٹہ سے تھوڑا زیادہ وقت لگا۔ رام اللہ اور نابلس دونوں شہر ماضی میں اسرائیلی اور فلسطینی افواج کے درمیان جھڑپوں کے دوران متنازعہ علاقے رہے ہیں کچھ گھنٹوں کے قیام کے دوران مجھے وہاں چھل چھل اور عمارتوں سے بھرا شہر دیکھنے کو ملا۔ تھوڑی دیر کے لیے خود کو نابلس کے بازاروں میں گم کرنے کے بعد میں نے مشہور میٹھی سوغات کنازہ کھائی۔ کنازہ میٹھی چاشنی میں جذب پیچیریشری ہے اور عرب ممالک میں خاصی مقبول ہے۔ اسرائیل پہنچنے کے بعد یہ واحد

دیس کہانی

اس سلسلے میں مختلف ممالک کے بارے میں دلچسپ معلومات وغیرہ پیش کی جائیں گی

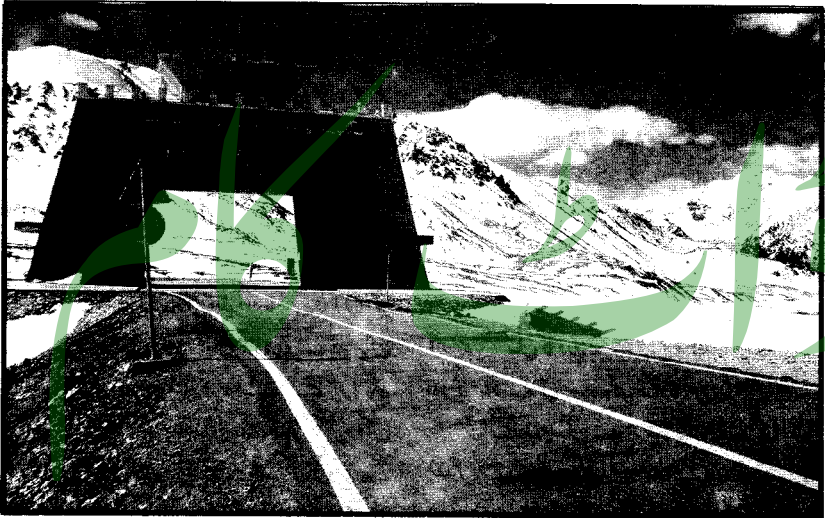
سچی کہانیاں، ایک دنیا

دیس دیس گھومیے.....!

زین شہی

تعارف کرایا جائے گا۔ اس ماہ ہم ایک ایسے ملک کا
تعارف کروانے جارہے ہیں جو دنیا کے قدیم ترین
ممالک میں سے ایک ہے اور دنیا بھر میں اس کے

دیس دیس گھومنے والا ہمارا یہ نیا سلسلہ آپ کی
خدمت میں حاضر ہے۔ اس سلسلے میں دنیا بھر کے
خوبصورت، ممالک، شہر اور تفریحی جگہوں کا آپ سے



یہ جو منظر آپ کے سامنے موجود ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں پاکستان اور چین کی سرحدیں ملتی ہیں۔
معیشت کے اعتبار سے بھی اس جگہ کی بہت اہمیت ہے۔ CPEC کا آغاز بھی اسی جگہ سے ہوا

جانی جاتی تھی مگر پھر ماؤ کی قیادت میں اپنے طرز عمل کو مکمل طور پر بدل کر چینی قوم آج ایک کامیاب ترین قوم ہے۔ جن کا منشور کام کام اور صرف کام ہے۔ چین پاکستان کے شمال میں واقع ایشیائی ملکوں میں شامل ہے اس کا شمار طاقت ور ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ کانڈا پرنٹنگ پریس اور بارود اُن کی ابتدائی ایجادات میں سے ہیں۔ چین میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں اور چینی کرسی اُن کی سرکاری کرسی ہے۔ چینی لوگ بہت سیدھے سادھے مگر سختی ہوتے ہیں اور دنیا کے امیر ترین لوگ بھی اس سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔

چرچے ہیں۔ جس ملک کا میں حوالہ دے رہا ہوں وہ اور کوئی نہیں بلکہ عوامی جمہوریہ چین ہے۔ ”پاک چین دوستی وان سونے“ پر ہم پاکستانی برسوں سے عمل پیرا ہیں اور چینی دوستوں نے بھی اس دوستی کی لاج رکھتے ہوئے پاکستان میں بڑے بڑے منصوبوں کی شروعات کی ہے۔ صرف پاکستان میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں چین اپنی مصنوعات کی وجہ سے مشہور ہے۔ دنیا میں چین ان چند ممالک میں سے ہے جو دنیا کی بڑی طاقتوں کا بھرپور مقابلہ اپنی طاقت ور ترین اکنامی سے کرتا ہے۔ چین کی ثقافت بہت قدیم ہے بلکہ یہ کہنا درست



یہ منظر گوادر پورٹ کا ہے جو آج سے کچھ عرصہ پہلے تک بالکل ویران ہوا کرتا تھا آج وہ پاک چین دوستی کی وجہ سے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے اعتبار سے بھی ایک بہت اہم جگہ بن چکی ہے

اس ماہ ہمارے اس نئے سلسلے ”چینی کہانیاں ایک دنیا“ میں چین کی بات کی گئی ہے۔ امید ہے آپ لوگوں کو یہ نیا سلسلہ پسند آیا ہوگا۔ انشاء اللہ آئندہ ماہ ایک نئی جگہ نے شہر اور ملک کے ساتھ حاضر ہوں گے آپ کی رائے کا ہمیں انتظار ہے گا۔

☆☆.....☆☆

ہوگا کہ اس کا شمار دنیا کی پرانی ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد چین کو تقسیم کر دیا گیا۔ ایک کا نام عوامی جمہوریہ چین ہے اور دوسرے کا جمہوریہ چین ہے۔ چین کی تہذیب ان چند تہذیبوں میں سے ہے جو بیرونی مداخلت سے ہمیشہ محفوظ رہی۔ ایک عرصے تک چینی قوم انیم جی کے نام سے

ان عرصوں کی کہانیاں روایتیں جن کے کام نے زمانے پر اپنے اثرات مرتب کیے

شبانہ اعظمی

اردو کے بلند پایہ شاعر کیفی اعظمی کی منیٰ اپنے بابا کے بارے میں کیا کہتی ہیں

ع۔خ۔خان

تربیت یافتہ شبانہ نے 1974 میں ریلیز ہونے والی انگریز سے بولی ووڈ میں اپنا کیریئر اسٹارٹ کیا اور یوں ہندی پر ایک غیر روایتی ہیروئن نے جنم لیا ابتدا میں اگرچہ معمولی فیس فنجرز کی وجہ سے فلم بین متاثر نہ ہو سکے لیکن پھر دھیرے دھیرے شبانہ نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے ایک خاص حلقے کو متاثر کرنا شروع کیا اور جلد ہی پیرل سینما کے ساتھ ساتھ روایتی کمرشل سینما کی کامیاب ہیروئن کہلانے لگی۔ St Xavier کالج سے تعلیم یافتہ ذہین اور فطین شبانہ کی تربیت چونکہ سوشلسٹ افکار اور نظریات کے زیر سایہ ہوئی لہذا فلم لائن میں بھی شبانہ نے وہی راہ اپنائی جس کی کران کے ترقی پسند والدین توقع رکھتے تھے۔ فلم کے بڑے پردے کو شبانہ نے آرٹ کی تحریک کو پروان چڑھانے اور فروغ دینے کے لیے چنا اور اپنے مقاصد میں بڑی حد تک کامیاب رہی۔ سوشلزم سے متاثر ہو کر اور عام آدمی خصوصاً عورتوں کے سماجی استحصال کے خلاف شبانہ کے کرداروں میں ان مسائل پر جرات مندانہ اظہار ملتا ہے۔ باڈی لینگویج کا جو استعمال اس اداکارہ کی طرف سے کیا گیا ہے وہ شاذ و نادر ہی دیگر اداکاروں

اردو کے بلند پایہ شاعر کیفی اعظمی (انتر حسین رضوی) کے گھر 18 ستمبر 1950 کو جنم لینے والی لڑکی ”شبانہ اعظمی“ کے حوالے سے پہچانی گئیں۔ شبانہ کی والدہ شوکت اعظمی بھی کیفی اعظمی کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی سرگرم رکن تھیں اور جہاں کیفی اعظمی ادبی حلقوں میں انقلابی شاعر کی حیثیت سے مانے جاتے تھے حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی ان کی بیگم شوکت انڈین پینلز تھیٹر ایسوسی ایشن (آئی ٹی اے) کے پلیٹ فارم سے ترقی پسند تحریک کے ڈرامے ایچ کرنے کے حوالے سے مشہور تھیں۔ شوکت بیگم نے تھیٹر کی ایکٹنگ کے حوالے سے ایک معتبر نام کمایا اور اسی کا اثر تھا کہ جب ان کی لاڈلی بیٹی منیٰ نے عالم شباب میں قدم رکھا تو ایکٹنگ کی طرف رجوع کیا۔ اپنے شاعر باپ کی ”منیٰ“ کیفی صاحب کے لیے آخری دم تک منیٰ رہی لیکن ہندی سینما کے شائقین اس دلنشین اداکارہ کو شبانہ اعظمی کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ شبانہ نے پیرل سینما کو اعتبار بخشنے کے لیے طویل جدوجہد کی اور کبھی کمرشل سینما کے چارم سے متاثر ہو کر خود کو آرٹ موویز سے دور کرنے کا نہیں سوچا۔ فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ انڈیا (پونا) سے

رہے اور آف بیٹ فلموں کے ساتھ ساتھ وہ کمرشل فلموں سے بھی ناٹھ جوڑے رکھنے میں کامیاب رہیں ہالی ووڈ اور برطانیہ میں بننے والی انگلش فلموں اور Madame Sousatzka اور Immaculated Conception اور شری آرتھر جوئے میں انٹری دے کر شانہ نے انٹرنیشنل فیم اور بین الاقوامی ایکٹرس کا اعزاز بھی حاصل کر لیا اور یہ سفر ابھی جاری و ساری ہے۔ شانہ کی لائف کیریئر اچھی بری خبروں اور تنازعہ حوالوں سے بھر پور ہے۔ نہ صرف سینما اسکرین پر بلکہ عام زندگی میں بھی وہ اپنے والد کے نظریات کے پرچار کے حوالے سے سرگرم لائف گزار رہی ہیں۔ نئی سماجی اور سیاسی آرگنائزیشنز سے وابستگی کے علاوہ شانہ پارلیمانی ممبر کی حیثیت سے بھارت میں بیٹے والے لاکھوں مسلمانوں کے حقوق کے لیے لڑتی رہی ہیں۔ خصوصاً ۹۳ء میں ہونے والے ممبئی مسلم کش فسادات اور

کے کام میں نظر آتا ہے خصوصاً شانہ نے اپنی آنکھوں سے منفرد کام لیا ہے جہاں وہ ایکسپریمنٹ کے ساتھ مکالمے ادا کر رہی ہوتی ہے تو ایک زبان وہ بھی ہوتی ہے جو اس اداکارہ کی آنکھوں میں بولتی ہے۔ شانہ م بیگن نے شانہ اعظمی کو ایسے یادگار کردار دیے جو ان کے کیریئر کو ایک معتبر حوالہ بنتے ہیں لیکن جہاں شیا م کی نشا نیت اور ستیہ جیت رے کی شطرنج کے کھلاڑی جیسی آف بیٹ فلموں میں کردار نبھائے وہیں کمرشل سینما پر بھی ان کی بعض فارمولہ ٹائپ فلموں مثلاً امر اکبر انٹونی، پردیش وغیرہ نے کامیابی حاصل کی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شانہ صرف آرٹ فلموں تک محدود نہیں رہیں۔ ارنجھ اور معصوم میں اپنی اداکاری کے انٹ نقش چھوڑنے والی اس ایکٹرس کے کیریئر کو اسپرٹ، کھڈر، پار اور منڈی جیسی بہترین فلموں نے مزید وقار عطا کیا۔ معروف فلمی شاعر جاوید اختر سے لو میرج کے بعد شانہ کا کیریئر اسی رفتار سے رواں دواں



آگے چل کر ہمیں آرٹ کے میدان میں ہی کچھ نہ کچھ کرنا ہے میری ایجوکیشن سینٹر زیویر کالج سے مکمل ہوئی اور یہاں گزارے چند سالوں نے میری زندگی کی راہ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا اس کے بعد میں نے یونوائٹڈ کالج سے ایکٹنگ کورس مکمل کیا اور اداکاری کے شعبے میں قدم رکھ دیا۔ میں اپنے کیریئر کو ایک عزت دار حوالہ بخشے کے حوالے سے شام بیگل، سٹیج جیت رائے، مرنیاں سین، سعید مرزا، موم گھوش، سانی برانچ پائی، اپرنا سین، ہیش بھٹ جیسے ڈائریکٹرز کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور وہ کردار دیے جو میری پہچان بنے۔ پریئل سنیما سے وابستگی کی ایک وجہ میرا بیک گراؤنڈ اور مقصدی فلموں کی طرف میرا رجحان تھا۔ جس کے باعث میری شناخت آرٹ فلموں اور آف بیٹ فلموں کے حوالے سے ہوئی لیکن کمرشل سنیما کی اہمیت اور افادیت سے بھی انکار ممکن نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ آرٹ فلموں سے زیادہ کمرشل سنیما معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے اس لیے کہ جو عام چیز آدی کو متاثر کرتی ہے اور جس کی طرف زیادہ لوگوں کا رجحان ہوگا وہی اثر انداز ہوگی۔ بد قسمتی سے آرٹ فلموں کی تحریک نے ایک خاص حلقے کو متاثر تو کیا ہے لیکن کمرشل سنیما کو جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا یا جو کام سنیما جیسے میڈیم سے لیا جاسکتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں کیا جاسکا آرٹ فلمیں ایک فن کے طور پر دیکھی جاتی ہیں اور ان کے لیے وہ ذوق و شوق شائقین نے بھی نہیں دکھایا جو وہ شاہ رخ یا دوسرے اشاریہ فلمیں دیکھنے کے لیے دکھاتے ہیں ایک دوسری وجہ جس کے باعث پیرل سنیما اپنا وجود تسلیم نہیں کر سکا ہے شام بیگل اور دیگر ڈائریکٹرز جنہوں نے اپنی بڑی بڑی فلمیں دی ہی ٹر آرٹ فلموں کی تشہیر پر کسی دھیان نہیں دیا یہ حقیقت ہے کہ ان فلموں کا بجٹ محدود ہوتا ہے اور پھر ایسی فلموں کا سرکٹ بھی لمبیٹے ہے لہذا اہم محدود وسائل میں رہتے ہوئے ساری پلاننگ کرتے ہیں اس کے باوجود پبلسٹی کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ پیرل سنیما سے وابستہ لوگ بھی اس

۲۰۰۳ء میں گجرات کے ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کے جانی اور مالی نقصان پر آواز اٹھا کر شہانہ نے مسلمانوں کی ہمدردیاں سمیٹ لیں شام بیگل نے شہانہ کے بارے میں کہا تھا ”یہ عورت گھڑی کی سوئی کی طرح ہے جو مسلسل گردش میں رہتی ہے۔“ شہانہ اعظمی کی مصروف زندگی اور کیریئر کے حوالے سے یہ بات قطعی درست معلوم ہوتی ہے۔ ہندی سنیما کو اپنی لائف کی تین دہائیاں دینے والی اس پر وقار اداکارہ نے آرٹ کی ترویج خصوصاً پیرل سنیما کو ایک باوقار مقام دینے کی طویل جدوجہد کی ہے یہ کہانی جو کہ خود شہانہ کی زبانی ہے ان لوگوں کے لیے ضرور دلچسپی کی حامل ہو سکتی ہے کہی اعظمی اور ان کے خاندان سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں اور جو آرٹ فلموں میں گہری دلچسپی کے حوالے سے کہی اعظمی کی صاحبزادی منی کے خیالات و افکار سے آگاہی چاہتے ہیں:

میری پیدائش اے ماحول میں ہوئی جہاں چاروں طرف کارل مارکس کے نظریات کے حامی لوگ موجود تھے میرے والد کہی اعظمی اور والدہ شوکت اعظمی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور اپنے ہم خیال ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے گروہ کے ساتھ عملی جدوجہد کر رہے تھے۔ والدین سے ملنے والی تحریک اور تربیت کا اثر ہی شاید میری شخصیت میں آیا اور میں بھی ان کے افکار پر سوچنے لگی۔ مجھے یقین ہے کہ میری پیدائش ایک عام ٹری کی طرح ہوئی ہوگی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے خیالات اور نظریات میں تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ میں اپنی والدہ کے تھیرڈ رامنوں سے بے حد متاثر تھی اور مجھے بہت اچھا لگتا تھا جب وہ اپنے سب کے سامنے جرات کے ساتھ اپنے نظریات کا اظہار کرتی تھیں اور لوگ ان کے مکالمے سن کر تالیاں بجاتے تھے میرا تعلق ایک ایسی فیملی سے ہے جہاں ہر طرف آرٹ سے پیار اور عقیدت رکھنے والے لوگ تھے اسی لیے ہمارے خاندان کا کوئی ممبر تجارت یا کسی اور پیشے کی طرف نہیں یا گیا بلکہ ہماری ٹھنی میں یہ بات شامل رہی ہے کہ

اور ہر بار ان کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آیا تو میری آنکھیں اٹکلبار ہوئیں۔ ابا کی پیدائش اعظم گڑھ کی تھی جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے ہم عصروں میں ان کا نام لیا جاتا وہ اعلیٰ تعلیم کی خواہش کے باوجود 1942 میں زور پکڑنے والی کوئٹہ انڈیا تحریک کی وجہ سے اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے جس کی خلسہ تمام عمر ان کو رہی لیکن جب بھی علمی و ادبی حلقوں میں جاتے اپنے نظریات کے بل بوتے پر ہی لوگوں پر علمی قابلیت کی دھاک بٹھا دیتے۔ وہ مارکس کے نظریات کے حامی

بارے میں سوچنے لگے ہیں اور یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ آف بیٹ یا آرٹ فلموں کو بھی تشہیر کی ضرورت ہے انڈسٹری کی بقا کے لیے ہمیں دونوں طرز کے سینما کو فروغ دینا چاہیے اور اس سلسلے میں حکومت کو بھی سپورٹ کرنا ہوگا کیونکہ جہاں آرٹ کا رشتہ کمرشل سینما سے ٹوٹ جائے وہاں فلم انڈسٹری کے وجود کو بھی خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ بولی ووڈ فلم میکرز میں شیز کی اور ٹیس نہیں ہے یا وہ اس حقیقت کو بھٹلا سکتے ہیں۔



مٹی کی اپنے والد اور والدہ کے ساتھ ایک یادگار تصویر

تھے اور بکے سوشلسٹ تھے۔ سیاست اور سماجی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انقلابی شاعری کرتے کرتے فلمی شاعری کی طرف آئے اور یہاں بھی انہیں بڑا معتبر مقام ملا۔ ان کے تین مجموعہ کلام 'آخر شب'، 'جھنکار اور آوارہ سجدہ' کے نام سے شائع ہوئے۔ ابا نے اسکرپٹ رائٹنگ کی طرف نانو بھائی

میں اپنے ابو کو بے حد مس کرتی ہوں اور ان کے جانے کے بعد احساس ہوا ہے کہ ابا کی شفقت کا سایہ جب تک ہمارے سروں پر تھا ہمیں اس کی اہمیت کا احساس ہی نہیں تھا لیکن کڑی دھوپ میں آنے کے بعد سائے کے چھن جانے کا احساس ہوتا ہے ان کے انتقال کے بعد میں نے ان کی مووی ٹیم کئی بار دیکھی

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ایڈفرس لنکس ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
 ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
 ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔
 اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

اعظمی چھوٹی اسکرین اور فلز میں کام کر چکی ہیں لیکن ان دنوں اداکاری سے نانہ توڑ کر صرف گھر گھر ہستی سنبھالے ہوئے ہیں، ان کی ہر فراموشی مجھے یاد ہیں خصوصاً راجہ صاحب میں ان کی ایکننگ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ شاید کچھ لوگوں کے لیے یہ سربرائزنگ ہو کہ کمرشل فلموں کی دو بڑی کامیاب ہیردین فرح اور تبو کی ماں رضوانہ بیگم میری کزن سسٹر ہیں اور اس رشتے سے میں تبو کی آئی ہوئی لیکن درحقیقت میں اسے اپنی بیٹی کی طرح ٹریٹ کرتی ہوں اور جب بھی اس نے مجھے ایکننگ کے حوالے سے کچھ نہیں مانگی ہیں اسے گائیڈ کر کے مجھے خوشی ہوئی ہے فیملی ممبرز کا تعارف کراتے ہوئے میں جاوید اختر صاحب کو کیسے بھلا سکتی ہوں جنہیں آپ سب مجھ سے زیادہ جانتے ہیں جاوید کی پہلی وائف نبی سے بھی میرے تعلقات بہت اچھے ہیں اور ان کے دونوں بچے فرحان اور زویا مجھے ماں کا درجہ دیتے ہیں جس کے لیے میں ان کی شکر گزار ہوں۔ فرحان کی پیاری سی بیٹی مجھے دادی کہہ کر گلے لگ جاتی ہے تب مجھ میں متا کا احساس جاگتا ہے اور میں ٹھوڑی دیر کے لیے جذباتی ہو کر سونے پر مجبور ہو جاتی ہوں کہ اتنے پیار بھرے خاندان کے ہوتے ہوئے مجھے خدا سے اور کچھ مانگنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟

جب میں بہت چھوٹی سی تھی تو سوچا کرتی تھی کہ میرے والد آخر کام کیا کرتے ہیں۔ نہ تو وہ کوئی کاروبار کرتے تھے اور نہ ہی دوسرے لوگوں کی طرح آفس جاتے تھے۔ ہر وقت کرتا پا جامہ پہنے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ اس بات پر شروع شروع میں تو مجھے بہت ندامت سی محسوس ہوتی لیکن پھر جب میں نو سال کی عمر کو پہنچی تو ان ساری باتوں کی عادی ہو گئی تب میں اپنی فرہنگ سے جموٹ بولا کرتی تھی کہ میرے والد کچھ بزنس کرتے ہیں لیکن ان کے بزنس کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے شرم محسوس ہوتی تھی کہ آخر میں انہیں کیا بتاؤں کہ میرے والد ایک شاعر ہیں اور اسی پر ان کی گزر بسر ہے۔ یہ بات میں صرف جانتی تھی کہ وہ ہم سب کی کفالت اچھے طریقے

وکیل کی خواہش پر رجوع کیا اور ان کے لیے پہلی فلم یہودی کی بیٹی ۵۶ء کا اسکرپٹ لکھا۔ کئی فلموں کے گانے اور اسکرپٹس لکھنے کے بعد انہیں فلمی شاعر کی حیثیت سے شہرت گردوت کی 'گاندھ کے پھول، سے ملی جس کے گانے اس زمانے میں بے حد مقبول ہوئے تھے۔ اس کے بعد چیتن آنند کی نیشنلسٹ وار پر بنائی گئی مووی حقیقت 46ء اور کمال امر وہوی کی 'باہیزہ، 71ء سے بام عروج ملا۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی فلم گرم ہوا، بہت پسند ہے جو عصمت چغتائی کے ناول پر بنائی گئی ہے اس فلم کے مکالمے، گیت، اور اسکرین پلے ابا نے لکھے تھے۔ بطور مکالمہ نگار، ان کی فلم من حسن ۶۷ء اور شکیب کمر جی کی بار پچی 72 جس کے گانے انہوں نے لکھے مجھے بے حد پسند ہیں رسن کمار نے ان کی شخصیت اور زندگی پر ایک ڈاکومنٹری بنائی تھی جس میں ان کا کلام پیش کیا گیا ہے یہ فلم ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اس کے علاوہ "سیم" کا میں ضرور ذکر کرنا چاہوں گی جو ان کے خیالوں کی ایک تصویر تھی جسے انہوں نے فلم کے بڑے کیبنوس پر خود اپنے ہاتھوں سے پینٹ کیا۔ سیم بنا کر وہ بے حد ریلیکس محسوس کرنے لگے تھے اور اس کے بعد ان کے چہرے پر طمانیت کا ایسا احساس رہتا تھا کہ گویا انہوں نے اپنی زندگی بھر کا نچوڑ اس فلم ہی پیش کر دیا۔ ہو میری والدہ شوکت اعظمی میں انہیں بہت باہمت خاتون قرار دیتی ہوں جنہوں نے اپنی پوری زندگی تحریک کے نام کر دی انہوں نے اپنی ساری توانائیاں افکار و نظریات مجھ میں منتقل کر دیے اب میرے اندر جو عورت سماجی ناہمواریوں کے خلاف صف آرا ہے وہ انہیں کا نیا روپ ہے۔ خاندان کے دیگر لوگوں میں میرا بھائی بابا اعظمی اور بھائی تنویر اعظمی کے نام بھی میں اپنی ذات سے الگ نہیں کر سکتی۔ بھائی اور بھائی نے مجھے جو پیار اور اعتماد دیا میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی، ابا کے بعد مجھے لگتا ہے کہ بابا ہی ان کے نام کی مشعل اور تحریک کو لے کر آگے بڑھے گا اور یقیناً ان کا نام اور تحریک زندہ رہے گی۔ جب تک کہ اس معاشرے میں کمزوروں کا استحصال جاری رہے گا۔ بھائی تنویر

میں گھر کر جاتی ہے۔ کاغذ کے پھول کے گانے پر ہٹ ہوئے جس وقت نے..... اور دیکھی زمانے کی پار..... قابل ذکر ہیں لیکن مجھے یہ دونوں گانے پسند نہیں آئے یہاں تک کہ جب میں چھوٹی سی تھی اور لوگوں کو یہ گانے سنکھاتے دیکھتی تھی تو حیرت کرتی تھی کہ آخر ان گیتوں میں ایسی کیا بات ہے کیونکہ میرے نزدیک اس فلم کا سب سے بہترین گیت ایک دو تین چار اور پانچ چھ اور سات آٹھ نو اور ایک جگہ سب رچتے تھے جھگڑے تھے پرانی صفر..... ایک نے دس کو بانٹنے دیکھا..... سب نے صفر کو ٹوکا..... نو نے آٹھ سے آٹھ لائی۔ آٹھ نے سو سو بات بنائی اور پھر دو کو الگ الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس گانے کی سچویشن نے تھی کہ ایک نیچر اپنے بچوں کو پڑھا رہی ہے اور کھیل کھیل میں انہیں ایک پیغام دینا جانتی ہے دراصل وہ اپنی کہانی بیان کر رہی ہے مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میرا فورٹ یہ سوگ کیوں لوگوں کی توجہ حاصل نہیں کر سکا اب اسے کئی یادگار گیتوں میں سے ایک تم جو اتنا مسکرا رہے ہو..... فلم اترتھ میں راج کرن اور مجھ پر فلما یا گیا تھا یہ گانا میرے لیے اس کے علاوہ کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا کہ اس کے لیریکس میرے والد نے دیئے میری یہی کیفیت ہے اس گانے کے لیے ہوتی جس کے بول دل کو چھو لیں چاہے وہ کسی شاعر نے لکھا ہو اس گانے کو اسکرین پر پیش بھٹ نے اس قدر خوبصورتی سے پیش کیا کہ ڈائریکٹر کی تخلیقی صلاحیتوں کو بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے ہمیش بھٹ جی نے اس گانے کی نقیسات محسوس کرتے ہوئے بالکل اسی انداز میں اسکرین پر پیش کیا جن جذبات کا اظہار شاعر نے کیا۔ اس گانے پر ہمیش صاحب نے بہت محنت کی تھی اور اس کا اندازہ اسکرین پر گانا دیکھ کر بخوبی ہو جاتا ہے۔ اپنے والد کے لکھے گانوں کی جو چیز مجھے لمبائی ہے وہ ان گیتوں کی سادگی ہے مثلاً اترتھ کا ایک اور گانا:

کوئی یہ کیسے بتائے کہ وہ تمہا کیوں ہے
وہ جو اپنا تھا وہی اور کسی کا کیوں ہے
بھی دنیا ہے تو پھر ایسی یہ دنیا کیوں ہے

سے کرتے تھے اور کبھی کسی چیز کی کمی کا احساس اپنی اولادوں کو نہیں ہونے دیا لیکن لوگ تو شاعری کو بیکار ہی چیز تصور کرتے ہیں ان کی نظر میں شاعر بیروزگار ہوتے ہیں اور یہ کوئی ایسی جاب نہیں ہے کہ جس سے لوگ اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کر سکیں پھر جب انہوں نے فلمی نمونہ نگاری شروع کی اور ان کی تصاویر رسالوں اور ٹریڈ جپوز میں شائع ہوئیں تو میری تمام فرینڈز کے علم میں یہ بات آگئی کہ میرے والد ایک شاعر ہیں اور فلموں کے لیے گانے لکھتے ہیں۔ تب مجھے بھی ان کی باتیں سن کر فخر محسوس ہوا اور میں انہیں بڑے مان سے کہتی کہ کیا تم لوگ نہیں جانتی تھیں کہ میرے والد شاعر اور نمونہ نگار ہیں۔ میں یہ جاننے لگی تھی کہ میرے والد کو کوئی معمولی شخصیت نہیں ہیں میں ان کی تحریر کے فن سے پہلی بار آشنا ہوئی جب انہوں نے گردوت کی فلم کاغذ کے پھول کے لیے ایک گانا وقت نے کیا کیا حسین ستم تحریر کیا اس سلسلے میں ایک میٹنگ ہمارے گھر پر ہوئی تھی جس میں ابراہار علوی نے بابا کو اسکرپٹ کے متعلق بتایا اس میٹنگ میں گردوت بھی موجود تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس میٹنگ میں ہماری پوری فیملی موجود تھی جس میں میری امی، میرا بھائی (بابا) بھی شامل تھے۔ کاغذ کے پھول کے گیتوں کی تیاری میری بابا کی یادداشتوں میں محفوظ ہے لیکن اب اپنے کام کے بارے میں کسی سے ڈسکس نہیں کرتے تھے وہ خاموشی سے لکھتے اور پروڈیوسرز کے حوالے کر دیتے تھے ہمیں ان کی تخلیقات کے بارے میں اسی وقت علم ہوتا جب ان کا لکھا ہوا گانا کمپوز ہو کر مارکیٹ میں آ جاتا تھا ایک گانا چند گھنٹوں میں ریکارڈ ہوتا اس کے بعد اس کی آڈیو مارکیٹ میں آئی اور لوگ ریکارڈ خرید کر سننے کے لیے گھر لے جاتے لیکن اب اپنے گھر میں انجینی ہی رہنے کے قابل تھے۔ ان کے لکھے لاتعداد گیت ایسے ہیں جو مجھے پسند ہیں اور جو میری یادداشت میں محفوظ ہیں حالانکہ انہوں نے فلموں کے لیے بہت زیادہ کام نہیں کیا لیکن جس قدر بھی گانے لکھے وہ اپنا تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہے ان کی شاعری کا کمال ہے کہ دل

یہی ہوتا ہے تو آخر یہی ہوتا کیوں ہے وہ جو الفاظ اپنی شاعری میں استعمال کرتے تھے وہ اس قدر عام فہم اور سادہ ہیں کہ با آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں اسی لیے ان کے لکھے بول عام آدمی کے دل کو چھوتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کا انسانی مشاہدہ اس قدر گہرا تھا کہ وہ ایک عورت کے ان جذبات کی بھی صحیح اور سچی عکاسی کرتے محسوس ہوتے ہیں جو اپنے شوہر کی محبت کا دم بھرتی ہے اور اسے کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ ابا نے گرم ہوا کے مکالے اور اسکرین پلے بھی لکھا انیش ورا ما اور من تھن کے مکالے ان کی تحریر کردہ تھے۔ بہر را، نجا کا پورا اسکرپٹ انہوں نے منظوم شکل میں ترتیب دیا تھا یہ ان کا یادگار کام ہے اسکرپٹ اور مکالموں کے اعتبار سے گرم ہوا ایک ایسی فلم ہے جس کے مکالے روح میں گھر کرتے محسوس ہوتے ہیں میری والدہ شوکت اعظمی کا کہنا ہے کہ اس فلم میں باپ بیٹی اور ایک بھائی کے اپنی بہن سے مکالمے احساس دلاتے ہیں کہ جیسے یہ کردار ہماری سوسائٹی کا ہی حصہ ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اور زبان ہماری معاشرت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ابا کے لیے مکالمہ لکھنا شاعری سے زیادہ آسان تھا۔ وہ اس وقت لے حد پرسکون دکھائی دیتے تھے جب کسی فلم کے مکالے لکھ رہے ہوتے تھے میں نے بھی نہیں دیکھا کہ کام حاصل کرنے کے لیے انہیں کوئی جدوجہد کرنا پڑی ہو گا انے ہوں یا اسکرین پلے وہ اپنے کام میں جکتا تھے اور جو لوگ ان کی تحریر کی قدر و قیمت سے آگاہ تھے ان کے پاس چل کر خود آتے تھے ابا کی سب سے اچھی ٹیونگ پروڈیوسر ڈائریکٹر چینین آئندہ سے تھی اور میں نے محسوس کیا کہ ان دونوں نے جب بھی مل کر کام کیا اس کی جو عملی تصویر سامنے آئی وہ شاہکار ہوتی تھی میں نے ان دونوں کو ساتھ کام کرتے اور اپنے پروڈیوسر پر مغز کھپاتے دیکھا ہے۔ چینین آئندہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوتے اور میرے والد کے سامنے کرسی گھسٹ کر بیٹھ جاتے ان کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں منسل چین کرڈش کر رہی ہوتی تھی جس میں ان کی

کار اور آفس کی چابیاں موجود ہوتی تھیں دونوں کئی کئی گھنٹے نشست کرتے اور ان کے درمیان مختلف موضوعات پر گفتگو جاری رہتی۔ ایک ایک گانے پر کئی کئی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی ہوتی تھی کہ چینین آئندہ آخر کیوں ایک شاعر کے پاس اتنا وقت لگا دیتے ہیں جبکہ ایک فلم میکر کی خواہش ہوتی ہے کہ بس کام ہونا چاہیے لیکن بعد میں جب اس کا رزلٹ کامیابی کی صورت میں نکلتا تھا تو سمجھ آنے لگی کہ اچھی شاعری اور میوزک فلم کی کامیابی میں کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ ماضی کی فلمیں دیکھیں ان میں کوئی آئٹم سوئگ نہیں ہوا کرتا تھا اس کے باوجود فلم کے تمام گانے اپنی جگہ اہمیت رکھتے تھے اور سنے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کم مقبول گانوں کو بھی توجہ ملتی تھی دلچسپ بات یہ ہے کہ ابا آج کل فلموں میں دکھائے جانے والے آئٹم سوئگز پر کوئی تنقید نہیں کرتے تھے جب بھی ٹی وی یا سینما پر کوئی فلم دکھ رہے ہوتے تھے تو انہوں نے کبھی بھی شاعری یا مکالموں پر بیزارگی کا اظہار نہیں کیا اس کی وجہ یہ بھی کہ وہ ایک حقیقت پسند انسان تھے۔ وہ بڑی باخ و بہار شخصیت تھے۔ مثلاً ہمیں آج کل کے بے ہنگم گانے گنگنانے کی عادت سی ہو گئی ہے اور میں اکثر ان کے سامنے بے خیالی میں کوئی گانا گنگنانے لگتی تھی جیسے تیرے باپ کو دیکھا باندرا اسٹیشن ہے..... تو وہ صرف مسکرا کر رہ جاتے اگرچہ باہر سے وہ بے حد سخت اور کڑھت محسوس ہوتے تھے لیکن ایک بیٹی کی حیثیت سے میں جانتی ہوں کہ وہ بے حد ڈینٹ اور سوئفٹ سم کے انسان تھے۔ وہ اپنی بات سادہ لفظوں میں بیان کرنے کا ہنر جانتے تھے اور اسی لیے کم بات کیا کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں بھی آپ کو اردو زبان کے سادہ اور آسان الفاظ ملتے ہیں اور وہ دوسرے شاعروں کی طرح مشکل پسندی کی طرف نہیں گئے۔ دوسری جانب چونکہ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ تھے لہذا ان کی شاعری کے اس شعبے میں ہمیں انقلابی اور مقصدی مواد ملتا ہے۔ مثلاً ان کا ایک گیت کتنے بازو کتنے سر..... میں ایک گہرا پیغام دیا گیا ہے یہ گانائیں آزاد ہوں کے لیے

ادوار میں مجھے پیرل اور کمرشل سنیما کے جینس لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ مرنیال سین کے ساتھ کھنڈر، جینسیس، اور ایک دن اجانک سعید مرزا کی البرٹ پنڈو غصہ کیوں آتا ہے؟ گوتم گھوش کی پارسانی، برانج کی پیرش اسپرن کی سٹی (ان کے ساتھ ایک ٹی وی ڈرامہ بھی کیا) اور میٹل بھٹ کی ارتھ، وشواس گھات، وغیرہ میری ایسی یادگار فلمیں ہیں جنہیں میں اپنے کیریئر کا حاصل قرار دے سکتی ہوں۔ کمرشل سنیما کے حوالے سے مجھے من موہن ڈیسا کی (امرا کبرائتونی، پردوش) پرکاش مہرہ (جوالا کھسی) شیکھر پور (معصوم) پرکاش جھا (مرتبو ڈنڈ) جیسے ڈائریکٹرز کا ساتھ ملا اور اس لسٹ میں مزید کئی نام بھی جوڑے جاسکتے ہیں۔ ویسٹ سائیڈ سنیما کے لیے اسماعیل مرچنٹ (ان کسٹڈی) رولینڈ جوف (سٹی آف جوائے) جون ٹیل سنر (میڈم سواز تھکا) جیسے ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کر کے میں سمجھتی ہوں کہ میں نے سنیما کے حوالے سے اپنے مشاہدے اور علم کو مزید وسعت دی ہے۔ آف بیٹ فلموں سے غیر معروف بہروئن کی حیثیت سے اشارٹ لینے کے بعد جس فلم کو میں اپنی کامیابی کی پہلی میٹری قرار دوں گی وہ سی بی ڈکسٹ کی فقیرا ہے جس کی کامیابی نے مجھے درحقیقت مین اسٹریم ہندی سنیما اشارے کے طور پر شناخت دی۔ اس دوران ٹھیٹر سے اپنا رشتہ بنائے رکھا اور آئی پی ٹی اے کے تحت سفید کنڈلی، جیسے کھیلوں میں ایکٹ کیا جو میرے کریئر پر چند یادگار ڈراموں میں سے ایک ہے۔ ٹھیٹر سے تعلق کے نتیجے میں جاوید اختر سے ملاقات اور دوستی ہوئی اور ہمارے درمیان قربت بڑھی۔ جاوید اختر شاعری کے ساتھ ساتھ ٹھیٹر میں بھی حصہ لیا کرتے تھے اور ایک اچھے جذباتی اداکار کے طور پر جانے جاتے تھے لیکن پھر ایکٹنگ شاید ان کے لیے کمفرٹبل نہیں رہی البتہ ٹھیٹر سے تعلق اور ناتواہ ختم نہیں کر سکے اور میں سمجھتی ہوں کہ کوئی بھی شخص جو ٹھیٹر پر کام کر چکا ہو، اس ماحول سے مانوس رہ چکا ہو، اس کے لیے کافی مشکل ہوتا ہے کہ وہ اس سے اپنا نات توڑ سکے۔ اس فیلڈ کا چارم اور کشش اسے اپنی جانب ضرور

انہوں لکھا تھا۔ ابانے اس گانے میں پیغام دیا ہے گن لے دکن دھیان سے ہارے گا وہ بازی جب کھیلے ہم جی جان سے۔ اسی طرح ان کے کئی گیت ہیں جن میں وہ رومانوی شاعر سے زیادہ ایک باغی شاعر نظر آئے لیکن ان کے لہجے میں بھی مایوسی نہیں ہوتی تھی۔ ابان کی شخصیت اور کردار کے بارے میں مجھ سے زیادہ ان کی شاعری میں گواہی ملتی ہے۔ ان کی ایک نظم کا بند جس میں ان کی پوری شخصیت جھلکتی محسوس ہوتی ہے:

جو میری طرح جیا کرتے ہیں کب مرتے ہیں تھک گیا ہوں مجھے سو لینے دور دوتے کیوں ہو سو کے بھی جاتے رہتے ہیں جانا ز سنو میری آواز سنو..... پیار کا راگ سنو فلم لائن جوائن کرنے سے پہلے میں پونا انیشیویٹ میں تربیت کے دوران بننے والی دو شارٹ فلموں دی ڈمبر اونٹک، اور ٹی جی (73ء) میں کام کر چکی تھی ان فلموں سے مجھے بے حد اعتماد ملا تھا خصوصاً کیرے کا سامنا کرتے ہوئے نئے فنکاروں کو جھک ہوتی ہے اس حوالے سے کم از کم میں کیرا نشس نہیں تھی، جب پہلی بار خواجہ احمد عباس کی فلم فاصلہ کے سیٹ پر شوٹنگ کے لیے پہنچی تو کیرا انٹکنگ اپور فلم کی باریکیوں سے آگاہ تھی۔ یہ ایک میڈیو کر فلم تھی جو میں نے سب سے پہلے جوائن کی لیکن شام بینگل جی کی انکور، پہلے ریلیز ہوئی کیونکہ شام برق رفتاری سے کام کرنے کے عادی رہے ہیں جبکہ خواجہ عباس وقت کی محدودیت کو نہیں مانتے تھے یہ میرے لیے اچھا ہی ہوا کہ انکور میری پہلی سائنگ فلم فاصلہ سے پہلے ریلیز ہوئی کیونکہ فاصلہ میری توقعات پر پوری ہیں اتری۔ اس کے علاوہ مجھے انکور کے تھیم نے بھی متاثر کیا تھا یہی وجہ ہے کہ میں نے اس فلم میں جی لاکر کام کیا جس کا رزلٹ اسکرین پر لوگوں نے دیکھا اور خاص طور پر شام بینگل میری پرفارمنس سے اتنے مطمئن ہوئے کہ اس کے بعد مجھے اپنی دیگر فلموں کی کاسٹنگ میں نظر انداز نہیں کر سکے میں نے ان کے ساتھ نشانت، جنون، منڈی، مسن اور انتر ند جیسی یادگار فلمیں کیں میری خوش قسمتی کہ کیریئر کے مختلف

پہنچایا ہے اور فلم کے بڑے پردے سے جو کام لیا جاسکتا تھا وہ صرف پیسہ کمانے کی لالچ کے باعث نہ لیا جاسکا کوئی بھی پروڈیوسر بڑی مشکل سے ایک چھوٹے بجٹ کی آرٹ فلم پر پیسے لگانے کے لیے تیار ہوتا ہے جبکہ کروڑوں کی لاگت سے بننے والی فلموں پر جن کے بجٹ کی واہسی منگلو کو ہوتی ہے پروڈیوسر فوراً سرمایہ کاری کے لیے تیار رہتے ہیں بس ڈائریکٹر اور کاسٹ اچھی ہونی چاہیے موضوعات اور کہانیوں سے کمرشل سنیما کے میکرز کو کیا سروکار۔ میں نے جن فلموں میں کام کیا ان کی کہانیاں اور موضوعات ہمارے معاشرے کی محزومیوں کی عکاسی کرتے ہیں اور یہ کردار ہر اس انسان کے اندر سانس لیتے ہیں جو معاشرے کا حصہ ہیں اور جو ساری غلطیوں کے باوجود اس سوسائٹی کو قبول کرنے پر آمادہ ہے۔

میری پہلی فلم انکور میں رجبل Accents شامل تھا۔ اس فلم میں لکھی کا کردار ان عورتوں کی ترجمانی کرتا ہے جو زمینداروں کے مظالم اور ہوس کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ شام بیگل کی فلم شانت میں بھی اسی قسم کے ٹاپک کو ڈسکس کیا گیا جس میں ایک بچہ کی وائف کا چار زمیندار گینگ وار کر دیتے ہیں شام کے ساتھ میری ایک اور خوبصورت فلم جنون بھی ہے جس میں ایک شادی شدہ مرد کے برٹش گرل سے تعلقات کو ڈسکس کیا گیا ہے یہ کہانی پارٹیشن سے پہلے کی ہے جنون ایک سچے واقعہ ہے یعنی قحطی 1857ء میں ایک مسلمان پنہان سرفراز خان (نصیر الدین شاہ) اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک جرم پر حملہ کرتا ہے جہاں عبادت کی غرض سے موجود تھ لیپ ڈورا اپنی ماں اور نانی کے ساتھ فرار ہو کر ایک ہندو کے گھر میں پناہ لیتی ہے مگر جاوید خان (ششی کپور) انہیں ڈھونڈ نکالتا ہے اور تھ سے شادی کی خواہش ظاہر کرتا ہے جب اسے غدر کے سپاہیوں کی ٹھکست کی خبر ملتی ہے تو وہ مخالف فوج کے ساتھ مل جاتا ہے اور بالآخر مارا جاتا ہے اس کے مرنے کے کئی سال بعد تھ کا برطانیہ میں انتقال ہو جاتا ہے۔ کھنڈر دیہات سے تعلق رکھنے والے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے دیپو کی کہانی ہے جو اپنے دوستوں

کھینچ لاتے ہیں۔ میرا تھیٹر سے تعلق اس وجہ سے برقرار ہے کہ یہ پرفارمنگ آرٹ کی واحد فیلڈ ہے جسے ابھی تک کمرشل ازم کا عفریت نکل نہیں سکا ہے، تھیٹر کے حوالے سے جو مقدمہ کی کام ہوا ہے وہ ایک تحریک کی حیثیت رکھتا ہے جس کے معاشرے پر گہرے اثرات ہیں۔ ہم نے اپنی اقدار کی قربانی دے کر جو ترقی حاصل کی ہے میرے اور میرے ہم خیال لوگوں کے نزدیک یہ تباہی کا راستہ ہے جو ہمارے کلچر اور سوسائٹی کو زوال کی طرف لے جا رہا ہے۔ ہم لوگوں کو بیداری دینے کے بجائے میٹھی گوٹی دے رہے ہیں تاکہ وہ گہری نیند سوتے رہیں۔ ہماری تحریک ان سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کرتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے شعبے میں بچوں کے لیے کچھ کام نہیں ہو رہا ہے تو میں نے نہ صرف سنیما انڈسٹری بلکہ پرفارمنگ آرٹ کے دیگر شعبوں کی سرکردہ شخصیات سے اس سلسلے میں بات کی اور اس بار پر زور دیا کہ بچوں کے لیے الگ سنیما ہونا چاہیے جسے ہم صرف چلڈرن سنیما قرار دے سکیں اور جو صرف بچوں کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی ذہنی و معاشرتی تربیت کر سکے۔ جب میں نے چلڈرن فلم سوسائٹی کی چیئر پرسن کا جارج سنہیالا تو میرے سامنے یہی ناسک تھا کہ بچوں کو بھی تفریح کا حق دیا جائے اور اس سلسلے میں بولی ووڈ فلم میکرز کو اپنا کسٹری بیوشن دینا چاہیے اس حوالے سے مذکورہ تنظیم نے کئی پروپوزیشنس کو ایسوسی ایشن کیا میری فلم ”کڑی“ خاص طور پر بچوں کے لیے بنائی گئی ایک ایسی تفریحی فلم ہے جس نے انڈین سنیما کو نئی راہ دکھائی ہے اور فلم میکرز کو باور کرایا کہ بچوں کا سنیما بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے بچوں کے لیے بنائی گئی فلموں کی کامیابیاں میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں۔ آرٹ فلموں میں مین اسٹریم سنیما کے درجے پر نہیں رکھا جاتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ موضوعات میں اور آرٹ کی درست اور حقیقی شکل پیش کرنے کے حوالے سے پیرل سنیما نے انڈسٹری کی بقا میں اہم کردار ادا کیا ہے پیرل سنیما ہی دراصل سنیما کا اصل تصور ہے جسے کمرشل فلموں نے بڑی حد تک نقصان

لہجے میں سماج کے نام نہاد ہمدردوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ سمن کی کہانی ایک مڈل کلاس فیملی سے متعلق ہے اس فلم میں میرا کردار اوم پوری (رامولا) کی وائف کا ہے جس کا گام گورماہ ہے یہ فیملی بڑی مشکلوں سے گزر بسر کرتی ہے اور پورے گھرانے کی کفالت اکیلے رامولا پر ہوتی ہے جو کھڈی پر کپڑا بننے کا کام کرتا ہے۔ اچانک ایک کردار مندیرا (نینا گپتا) ان کی زندگیوں میں تبدیلی لانے کا سبب بن جاتی ہے جو ان کا کپڑا مہنگے داموں خرید کر اسے نمائشوں میں لے جانا چاہتی ہے لیکن گورماہ اس صورت حال سے مندیرا سے رقت محسوس کرنے لگتی ہے اور اپنے شوہر کو اس کا کام کرنے سے روکتی ہے۔ میاں پوری کے ازدواجی تعلقات کی ایک مختلف تصویر اس فلم میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خاندان کے معاشی مسائل سے زیادہ اہمیت اپنائیت کی ہے جو عورت کے لیے سب سے مقدم ہے۔ گورماہ کا کردار جو کہ کسی بھی مڈل کلاس فیملی کا ہو سکتا ہے اس قدر جذباتی دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کو خود سے دور جاتا دیکھ کر خاصی اٹریو ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اپنے شوہر کو آگ لگانے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ پستون جی ڈائریکٹر دے مہتا کی ایک معیاری فلم ہے اس فلم میں پارسی کمیونٹی کے معاشرتی مسائل کو ڈسکس کیا گیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ پارسی کمیونٹی کے رہن بہن، عقیدے اور معاشرت کی بڑی خوبصورت جھلک اس فلم میں پیش کی گئی ہے۔ پستون جی بھارت میں موجود سوا لاکھ سے زائد پارسیوں کی معاشرت اور رویوں کی ترجمانی کرتی ہے نصیر الدین شاہ اس نے اس فلم میں فیوج شاہ کا کردار نبھایا جو اس فلم کا نیرٹیو بھی ہے۔ انوپم کھیرے نے پستون جی کا کردار ادا کیا ہے یہ دونوں کیریکٹر ایک لڑکی جیرو سے مشترکہ محبت کرتے ہیں لیکن فیوج اپنی محبت کا اقرار کرنے سے ہچکچاتا ہے اور جیرو سے اظہار محبت کی خواہش دل میں لیے ہی دوسرے شہر چلا جاتا ہے اور پھر کئی سال بعد ممبئی واپس آ کر جیرو کو تلاش کرتا ہے لیکن تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ جیرو کا کردار بھی میرے چند یادگار اور

کو گاؤں آنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ تباہ حال مناظر کی تصویر کشی کر کے دنیا کے سامنے پیش کر سکیں دیو کے فونو گرافر دوست سماش کو ایک تباہ شدہ مکان کے کھنڈر میں ایک لڑکی چیمینی ملتی ہے جو اپنی تباہی ماں کے ساتھ وہاں رہتی ہے۔ چیمینی کی مہنگی اس کے ایک کزن سے ملے ہوئی ہے جس سے وہ مل نہیں سکتے سماش ایک پلان بناتا ہے وہ چیمینی کو حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ محبت اور ہوس کے جذباتوں کے بیچ اس خوبصورت فلم چیمینی کا کردار میرے چند یادگار کرداروں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح شیام کی فلم منڈی بھی ہمارے معاشرے پر ایک گہری چوٹ ہے اس فلم میں بڑی خوبصورتی سے کھونٹوں میں بٹنے والی عورتوں کی معاشرت اور سماج پر ان کے اثرات ڈسکس کئے گئے ہیں۔ میں نے اس فلم میں رک منی بانی کا کیریکٹر نبھایا جو ایک چمکے چلائی ہے کوشے کی تمام عورتوں میں زینت (سمیٹا ہائل) اس کی سب سے زیادہ چہیتی ہے جو بانی کی عمرانی میں کلاسیکل سنگیت کی تربیت لیتی ہے سماج کے ٹھیکے داروں کو کوشے کا وجود آنکھوں میں کھنکنے لگتا ہے تو وہ اسے ہٹانے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن اس اٹو پر خود ان میں پھوٹ پڑ جاتی ہے کیونکہ ایک حلقہ جس میں مسٹر اگر وال جیسے لوگ موجود ہوتے ہیں یہ کہتا ہے کہ طوائفیں اور دھندہ کرنے والی عورتیں بھی معاشرے کا حصہ ہیں جبکہ گیت (گھمبوش کھربندا) جیسے لوگ اسے سوسائٹی کے لیے ناسور سمجھتے ہیں۔ جب یہ مجبور عورتیں نعل مکانی کر کے نئی جگہ جاتی ہیں تو اسی علاقے کے لوگ اپنی جنسی ضرورتوں کی تسکین کے لیے ان کے پیچھے پیچھے نعل مکانی کرنے لگتے ہیں اور اس طرح ایک نئی جیسی آباد ہونے لگتی ہے۔ یہ کہانی میٹاشاٹ کے ایک اصول کو پورا کرتی ہے جہاں منڈی ہوگی وہاں مال اترے گا اور پھر وہاں بیوپاری اور گاہک بھی آئیں گے۔ دھندہ کرنے والی عورتوں کو اگر متبادل روزگار نہیں دیا جاتا تو وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کیا کریں؟ وہ دوسروں کے نفس کی غلام نہ بنیں تو پھر کیا کریں؟ اس فلم میں شیام جی نے بڑے دھیمے

اسکول جوائن کرنے کی آفر دیتا ہے اور پھر دونوں ایک دوسرے کے قریب آنے لگتے ہیں۔ پراچ اس حوالے سے بیدار رہی کہ اس کی پہلی ہی فلم کو تین ایوارڈز ملے حالانکہ یہ فلم ایوارڈ جیتنے کے پانچ سال بعد 1984ء میں ریلیز ہوئی لیکن 79ء میں ہی چونکہ اسے سنسر شپ کیٹل چکا تھا لہذا یہ فلم ایوارڈز کی نامزدگیوں میں شامل کر لی گئی۔ سپرٹس آف بیٹ فلم ہونے کے باوجود باکس آفس پر اچھا برنس کرنے میں کامیاب رہی اور اس حوصلہ افزائی نے پراچ کو مزید ہمت دی کہ وہ پیرل سینما سے اپنا رشتہ جوڑے رکھنے پر آمادہ ہوئی۔ بولڈ موضوعات کے حوالے سے میری چند یادگار فلموں میں لکھنؤ کی معاشرت اور ہندو مسلم فسادات کے پس منظر میں بنائی گئی مظفر علی الرحمن اور ڈائریکٹر گوتم گھوش کی پارٹنری قابل تذکرہ ہیں۔ پار میں فیوڈل ازم کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور مزارعوں پر ہونے والے مظالم کی تصویر کشی کی گئی ہے کہانی کے مطابق ایک غریب جوڑے ک دگاؤن کے زمیندار کی جانب سے گاؤن چھوڑنے کا حکم ملتا ہے جس کے بعد دونوں کلکتہ چلیجاتے ہیں جہاں ان دونوں میاں بیوی کو لوگوں کو دریا کے پار پہنچانے کا کام مل جاتا ہے۔ حاملہ ہونے کا باوجود بیوی شوہر کا ساتھ دیتی ہے کیونکہ ان کے پاس دریا کے علاوہ کوئی گھر نہیں ہوتا اسی پانی کے گھر پر دریا پار کرتے ہوئے حادثاتی طور پر بچہ ماں کے پیٹ ہی میں مر جاتا ہے جس پر وہ تکلیف محسوس کرتی ہے لیکن اس سے زیادہ کہ بناک ایک ماں کے لیے اپنے بچے کی موت ہوتی ہے جسے اس نے جنم نہ دیا ہو۔ اس فلم کا ایک سین تو خاصا حذابانی ہے جب میں اپنے شوہر (نصیر الدین شاہ) سے کہتی ہوں کہ ذرا سنو وہ میرے پیٹ میں چھک رہا ہے۔

میری کئی فلمیں ایسی ہیں جو کسی وجہ سے نہ بن سکیں لیکن مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ وہ اسکرپٹس ہم نے کھودیں۔ ایسے کئی موضوعات جنہیں کبھی نہیں چھیڑا گیا اور ان میں ایشیائی میرے لکھے گئے کردار، جو لوگوں تک نہ پہنچ سکے مثلاً میری ایک فلم واٹر، پر سنسر بورڈ نے اعتراض کرتے ہوئے اس کا

مشکل کرداروں میں سے ایک ہے کیونکہ اس فلم کے لیے مجھے اپنی ٹون تبدیل کرنا پڑنی ہے اور یہ تجربہ میرے لیے خاصا منفرد ثابت ہوا۔ کلپنا جی لاجپتی کے ساتھ میری پہلی فلم ایک پل بھی ایک خوبصورت کہانی پڑنی ہے اس سے قبل وہ شام جی کی اسٹنٹ تھی اور چند ڈاکومنٹری بنا چکی تھی لیکن پھر فلم ڈائریکٹ کرنے کا یہ اسے پہلا چانس ملا تھا۔ اس فلم میں دکھایا گیا ہے کہ ایک عورت جیسی ضرورت پورا کرنے کے لیے کس طرح شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیتی ہے ایک پل میں جو ماحول دکھایا گیا ہے وہ آسام کا ہے جہاں ایک لڑکی کی ارنج میرج چائے کے کاشکار نصیر الدین شاہ سے ہو جاتی ہے لیکن شوہر کی غیر موجودگی میں وہ لڑکی اپنے شوہر کے باغات کے ایک ملازم سے انوالو ہو جاتی ہے اور جنسی ملاپ کے نتیجے میں حاملہ بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو ضائع کر دے لہذا وہ اسے جنم دینے کا ارادہ کر لیتی ہے لیکن اپنے شوہر کو بھی اندھیرے میں نہیں رکھتی۔ کلاس میں شوہر اس پویش کو قبول کر لیتا ہے اور بیوی کو اس کے ناجائز بچے سمیت اپنانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ کلپنا نے اس فلم کے ڈرامائی مناظر کو خوب نبھایا اور انہیں اور ہونے سے بچایا خصوصاً جب بیوی شوہر کو بتاتی ہے کہ وہ اس بچے کا باپ نہیں ہے۔ یہ جذباتی اور ڈرامائی سین کلپنا نے بے حد سکون کے ساتھ پچھرا کر لیا اور بلاوجہ بیوی بیک گراؤنڈ کے استعمال سے سین کا تاثر خراب نہیں کیا۔ اسی طرح ایک اور نئی لیڈی ڈائریکٹریٹری پراچ پانی کے ساتھ مجھے پہلی بار پیرش کرنے کا تجربہ ہوا اور اپنی پہلی فلم میں ہی پراچ نے خود کو منوالیا۔ یہ کہانی ایک بلائینڈ اسکول ٹیچر سے متعلق ہے جس میں نصیر الدین شاہ نے اسکول پر چلنے والے کارول پلے کیا ہے۔ وہ دوسروں کا سہارا قبول نہیں کرتا اور بے حد خوددار انسان نے لیکن کویتا اس کی زندگی میں آ کر اسے اتنا تبدیل کر دیتی ہے کہ وہ لڑکی اس کی عادت بن جاتی ہے۔ کویتا اپنے پہلے شوہر کے انتقال کے بعد تازہ زندگی گزار رہی ہوتی ہے لیکن اچانک اسے پر مارل جاتا ہے جو اسے بلائینڈ



اسکرپٹ بین کر دیا حالانکہ اس فلم میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی کے زادگستاہ کے ساتھ چینل فور کے لیے ایک مووی دی اسٹوری ٹیلر ایک فلم ہے جس میں مجھے بخاران کا رول نبھانا تھا لیکن یہ پروجیکٹ فنانشل کراسز کی وجہ سے شروع نہ ہو سکا اس کے علاوہ کئی ایسے پروجیکٹس ہیں جنہیں نہ کرنے کا مجھے افسوس رہے گا لیکن میں نے جس قدر فلمیں اور کردار اسکرین پر پر فارم کر لیے ہیں کیریئر کے اس مقام پر آ کر کم از کم جتنے یہ اطمینان ضرور ہے کہ میں نے بھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا مجھے یقین ہے کہ ابا کی روح خوش ہوگی کہ ان کی منی نے بھی ان کے نظریات کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔

اپنے حوالے سے منظر عام پر آنے والے اسکینڈلز پر وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو حقائق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں جہاں تک کنٹروورسز کا تعلق ہے تو وہ میرے مخالف ہو جاتے ہیں۔ میں یہ اعتراض کرتے ہوئے ذرا نہیں ہچکچاتی کہ شیکھر کپور اور ہمیں گیلانی سے میری دوستی رہی ہے۔ جب مجھے احساس ہوا کہ یہ دونوں میرے صرف اچھے دوست ہیں تو میں نے ان سے شادی کا فیصلہ تبدیل کر لیا اور تب مجھے جاوید اختر صاحب نے یہ احساس دلایا کہ وہ میرے لیے زیادہ مخلص ہیں۔ شیکھر کپور سے میری منگنی پر خاندان کی جانب سے کسی نے مزاحمت نہیں کی تھی اور سب کچھ طے تھا لیکن اچانک شیکھر کی ماں نے اعتراض کر دیا چونکہ وہ پنجاب سے تعلق رکھتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ ان کی بہو پنجابی ہو جبکہ میں پنجابی تھی اور نہ ان کی ہم مذہب چننا شیکھر سے میری منگنی ٹوٹ گئی۔ جاوید سے میری شادی پرمیڈیا اور خصوصاً ٹریڈ کے لوگوں کو خاصی حیرت ہوئی کیونکہ جاوید پہلے سے شادی شد اور دو بچوں کے باپ تھے۔ ہماری شادی کی خبریں بھی میڈین بھر پہلے ہی سے میڈیا اور پریس والوں کو مل گئی تھیں حالانکہ ہم دونوں اسے خفیہ رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ کہتے ہیں تاکہ گھر کا بھیدی لٹکا ڈھالے تو ہمارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوا۔ گھر کی ایک بھیدی نے تمام

ٹریڈ کو خبر کر دی کہ جاوید اور شانہ شادی کرنے والے ہیں۔ اس نیوز نے ہی اور ان کی فیملی کو بے حد متاثر کیا لیکن میں اس حوالے سے خود کو قصور وار ہرگز نہیں سمجھتاؤں گی۔ اس لیے کہ دوسری شادی کا فیصلہ جاوید کا تھا ہی کے دونوں بچے مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں اور وہ مجھے ماں کا درجہ دیتے ہیں۔ جاوید سے میری شادی ایک شاعر کے لیے میرے جذبات کا نتیجہ ہے اور میں انہیں صرف اسی وجہ سے پسند کرتی ہوں کہ وہ ایک شاعر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مجھے جاوید سے زیادہ ان کی شاعری سے عشق ہوا لیکن اب ہم دونوں ایک دوسرے کی عادت بن چکے ہیں۔

ان دنوں میری مصروفیات ہیومن رائٹس فورمز تک محدود ہیں۔ اس کے علاوہ ٹھیٹر سے میں اپنا رشتہ بنانے رکھنا چاہتی ہوں میں آرٹ لورز اور دنیا بھر میں پیرل سنیما کے مباحوں کو ٹریپوٹ دینا چاہوں گی جن کی وجہ سے آرٹ فلموں اور متوازی سنیما کا وجود قائم ہے۔

☆☆.....☆☆

دی سنگل ٹین

CHARLES DICKENS

ترجمہ: نجیب عمر

تہائی مجھے اٹینٹ کرتی ہے اور میرے غورو فکر کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ پیرنگ کے دہانے کے قریب کوئی اور بھی یہاں ہے۔ جس کی بنا پر میں اسے دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے دوبارہ دیکھا۔

ہیلو!..... نیچے (اگر مجھے سن سکتے ہو)۔

پٹریوں کے درمیان آگے بڑھتے پوری طرح گھوم کر نظریں اوپر اٹھائیں اور ٹھیک اپنے اوپر اس نے مجھے دیکھا۔

”کوئی راستہ ہے کہ میں نیچے آ کر تم سے بات کر سکوں“

بغیر کوئی جواب دیئے وہ میری جانب اوپر دیکھتا رہا اور میں اسے نیچے۔ اس سے مل کے میں اپنا سوال دہراتا اسی لمحے ایک زبردست گڑگڑاہٹ سے زمین اور فضا تھرا گئی۔ ایک غبار سا میری جانب اٹھا اور میں پیچھے ہوتا گیا اور نہ میں نیچے کھینچ لیا جاتا۔ ایک تیز رفتار ٹرین کے بخارات مجھ تک پہنچ رہے تھے اور پھر چاروں طرف پھیل گئے۔ منظر صاف ہوا تو میں نے اسے ڈنڈے پر جھنڈا لپیٹنے دیکھا جس سے اس نے جاتی ٹرین کو سنبھل دیا تھا۔

”ہیلو..... نیچے وہاں۔“

اس نے برادری کوئی اسے پکار رہا ہے۔ وہ اپنے ڈبے نما کمرے کے دروازے پر چھوٹا سا سرخ، سبز رنگ کا جھنڈا لپیٹ لکھا ہے۔ مجھے اس نے ڈنڈے پر لپیٹ رکھا ہے۔ وہاں زمین کی ہیئت اور سناٹے کی بنا پر کوئی آواز کی سمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا چونکہ میں سرنگ کے چھت نما کٹاؤ کے سرے پر کھڑا ہوں اور اس کا نیچے سے مجھے دیکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ میں نے کئی زاویے بدل کر اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن یہ غیر معمولی بات ہے کہ مجھے دیکھے بنا اسے میری موجودگی کا ادراک ہے۔ وہ اپنے چھوٹے قد اور دھند کے باوجود مجھے محسوس کر رہا ہے۔ وہ سرنگ کے سامنے کھائی میں ہے اور میں بلندی پر۔

ڈوبے سورج کی تیز شعاعیں میرے سامنے اسے دیکھنے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر پھیلا کر سائیہ کرنا پڑا تاکہ میں اسے کسی حد تک دیکھ سکوں۔

میں ایک تہائی پسند شخص ہوں اور شام کی چہل قدمی عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ میں ٹہکتا ہوا اکثر اس سطح مرتفع پر آ جاتا ہوں جس کے نیچے سرنگ سے برآمد ہوتے ٹرین کو سنبھلی جاتے دیکھنا مجھے بھلا لگتا ہے۔

کانی نیچے آ کر میں اس کے قریب تھا۔ وہ انہی پٹریوں کے درمیان کھڑا تھا جس پر سے ابھی ابھی ٹرین گزری تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرا منتظر ہو۔ اس کا باہاں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے اور بائیں کہنی سینے پر پھیلے دائیں بازو پر ٹکا ہوا۔ اس کا رویہ ایسا، جیسے وہ میری توقع کر رہا ہو۔ میں ایک لمحے کو متعجب ہو کر رکا۔

میں دوبارہ نشیب کی سمت چل پڑا اور پٹریوں کے قریب پہنچ کر اس کے رو پر دو ہوا۔ وہ ایک نجف، سیاہی مائل زردی جیسی رنگت، گھنی داڑھی، اور گھنٹوں غالباً بھاری۔ اس کی ڈیوٹی کی جگہ مکمل تنہائی اور ہولناکی کی علامت تھی۔ شاید میں نے ایسی نم آلود جگہ دیکھی ہو۔ دونوں جانب پہاڑ کو تراشا گیا تھا جس کے چتر بھیکے ہوئے تھے۔ وہ گولائی میں پھیلنے ہوئے اوپر چلے گئے تھے لیکن دونوں سرے ملتے نہیں تھے۔ ان کے درمیان آسمان پٹی کی طرح نظر آ رہا تھا جسے آپ

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ قدرے توقف کے بعد اور اس دوران میں گہری نظروں سے مجھے جانچتا نظر آیا۔ اس جھنڈا لپیٹے ڈنڈے سے ایک جانب میری سطح پر اشارہ کیا وہاں سے کوئی دوسو گز کا فاصلہ ہوگا۔

ٹھیک ہے، میں نے کہا اور اس جانب چل پڑا جبکہ وہ مجھ پر ٹکا ہوا رہا۔ ایک اوپر کھابڑا، دائیں، بائیں مڑتے نیچے کی جانب جاتے راستے پر چلتا گیا۔

جہاں میں کھڑا تھا کٹنا بہت گہرا تھا، معمول کے خلاف تیزی سے گہرائی میں جاتا ہوا۔ یہ ایک مرطوب چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا جو گیلا ہو رہا تھا۔ میں نے نیچے اترتے دیکھا۔

اس بنا پر راستہ میرے لیے طویل ہو گیا۔ اس کی بتائی ہوئی جگہ تک پہنچنے پہنچنے میرا سانس پھول گیا۔ اگرچہ نیچے اترا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔



باہر کی دنیا کی واحد کھڑکی کہہ سکتے ہیں ورنہ زمین دوز
سنگلاخ قید خانہ۔

نہیں جانتے؟“
جب میں نے اس کی ساکت نگاہوں کا جائزہ
لیا تو میرے ذہن میں ایک وحشت ناک خیال آیا کہ
یہ انسان نہیں کوئی روح ہے۔ جیسے میں نے سوچنا
شروع کیا مجھے لگا یہ دوسروں پر اثر ڈالنے کی قدرت
رکھتا ہو۔

قریب ترین منظر، دوسری جانب، سرخ روشنی
مقدور بھرتا رہی سے لڑتی ہوئی۔ یہی روشنی سرنگ کے
دہانہ کو کسی قدر واضح کرتی ہوئی۔ سرنگ کے ماحول
میں ایک وحشت ناک مایوسی چھائی ہوئی جہاں فراخی
کا احساس بڑی مشکل سے ہوتا۔ شاید بہت تھوڑی
سورج کی روشنی کا دہاں سے گزر ہوتا۔ اس وجہ سے
دہاں ایک ایسی بورچی ہوئی جو موت کا پتا دیتی ہو۔
اس قدر سرد ہوا دہاں سے گزری جس نے مجھے بھی بخ
کردیا۔ جیسے میں طبعی دنیا سے کسی اور دنیا میں
آ گیا ہوں۔

اپنی باری پر میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور ہاتھ
بڑھانے سے پہلے میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے
متعلق ایک نظر نہ آنے والے خوف کو پالیا۔ اس سے
مجھے ہمت ملی اور میری وحشت کم ہوئی۔
”آپ مجھے دیکھیے“ بڑی مشکل سے ایک
مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے میں نے کہا ”غالبا
آپ مجھ سے خوفزدہ ہیں۔“
”مجھے شک ہے“ وہ گویا ہوا ”شاید میں نے
آپ کو پہلے دیکھا ہوا ہے۔“
”کہاں؟“

اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرتا
میں اس کے مقابل آ گیا۔ میں اسے چھوکر دیکھنا
چاہتا تھا۔ وہ اپنی نگاہیں میری آنکھوں پر جمائے ایک
قدم پیچھے ہو کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔

اس نے سرخ روشنی کی جانب اشارہ کیا جسے وہ
دیکھ رہا تھا۔
”دہاں“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
مجھ پر نگاہیں جمائے بے آواز لہجے میں بولا
”ہاں“

”یہ ایک ویران سا پوسٹ ہے جہاں آپ کی
ڈیوٹی ہے“ میں نے کہا۔ میں نے اپنی بلند قامتی سے
نیچے کی جانب دیکھا تو میرے لیے اس کے چہرے
سے لگا ہیں ہٹانا مشکل ہو گیا۔ میں نے قیاس کیا کہ کوئی
بھولا بھٹکا ہی شاید اس کی طرف آتا ہوگا۔ لیکن وہ
نا پسند نہیں کرتا ہے۔ اس نے میرے اندر دیکھا لیا ہوگا
کہ زندگی کی دلچسپیاں بہت تھوڑی ہیں اور زندگی کے
پیشتر بنگاموں سے آزاد ہو چکا ہوں۔ اس مقصد کے
لیے میں نے اس سے بات کی لیکن مجھے یقین نہیں تھا
کہ وہ میری طرح سوچتا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں
آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح گفتگو کا آغاز کیا جائے
اس کی شخصیت میں بھی کوئی ایسی چیز تھی جس نے مجھے
وحشت میں مبتلا کر دیا۔

”میرے بھائی، میں دہاں کیا کرنے جاؤں گا
اور اگر ایسا ہے تو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں دہاں
کبھی گیا ہی نہیں“
”میں سمجھتا ہوں“ اس نے کہا ”مجھے یقین ہے
، میں قسم کھا سکتا ہوں۔“
اس کا انداز واضح تھا جسے میرا۔

سرنگ کے دہانے پر سرخ روشنی پر اس نے
ایک عجیب سی نگاہ ڈالی اور غور سے دیکھتا رہا جیسے اسے
دہاں کوئی متوجہ چیز نہ مل رہی ہو، اس کے بعد میری
جانب دیکھا۔

اس نے میرے ریمارکس کا صاف اور برملا
جواب دیا اور واضح ترین الفاظ میں کہا۔ کیا اس کے
پاس کام کا بوجھ زیادہ ہے۔ لگتا ایسا ہی ہے اس کی
ذمے داریاں کافی ہیں لیکن چونکہ رہتا اور پابندی
وقت اس کے کام کی نوعیت کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس کا
کام بھاری اور محنت طلب ہے۔ وہ تنہا ہے بغیر کسی
معاون اور مددگار کے۔ سٹیل دینا، روشنی آراستہ کرنا
اور فولادی دستے سے بار بار کاٹنا بدلنا۔ یہ سب خود

”یہ سرخ روشنی تمہارے اختیار میں ہے، کیا
ایسا نہیں؟“ اس نے دیکھے لہجے میں جواب دیا ”کیا تم

اسے اپنے تئیں کرنا پڑتا ہے۔
میں سمجھتا ہوں، بے شمار طویل اور تنہا وقفوں
کے درمیان اسے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہی کہہ
سکتا ہے کہ زندگی کی اس روٹین نے دراصل اس کی
زندگی کو ایک طرز عطا کر دیا تھا جس کا وہ عادی ہو چکا
ہے اس نشیب کی ٹھنڈی تہائی نے اسے ایک نئی زبان
سے آشنا کیا جسے وہ صرف منظر سے دیکھتا تھا۔ جس کی
ادائیگی کا خاص لہجہ اور تلفظ تھا جسے اس نے اپنے ناپختہ
خیالات سے خود ایجاد کیا تھا۔ اس نے کسی حد تک کسور
، اعشاریہ اور ٹھوڑا سا الجبرا پر بھی کام کیا تھا لیکن ایک
کمزور طالب علم کی طرح اعداد پر اس کی گرفت مضبوط
نہیں تھی۔

اس کے فرائض منصبی کے لیے ضروری تھا کہ وہ
اس مرطوب راہداری میں ہمیشہ رہے اور ان پتھر پٹی
دیواروں کے درمیان سے نکل کر اوپر چلتے سورج کی
روسی میں نہ جائے۔ وقت اور حالات اسے کیوں مجبور
کرتے ہیں۔ جو میں گھنٹوں میں اسے چند گھنٹے تو ایسے
سلتے ہوں گے جب وہ اس تھا کا دینے والی روٹین سے
الگ ہو سکتا ہو۔ روشن اور خوشگوار موسم میں وہ ٹھن
سے پر اس نشیب سے نکل تو سکتا ہے لیکن وہ تو سارا
وقت اس برقی گھنٹی کی پکار کا جواب دینے کے لیے خود
کو مستعد رکھتا ہے اور ایسے وقت اس کی پریشانی بڑھ
جاتی ہے۔ اسے اس سے بھی کم آسودگی حاصل ہوتی
ہوگی جتنا میں قیاس کر سکتا ہوں۔

وہ مجھے ایک بکس نما کمرے میں لے گیا۔ ایک
طرف آگ روشن تھی۔ ایک ڈیک جس پر ایک رجسٹر
رکھا تھا۔ غالباً وہ اس میں اندراج کرتا ہوگا۔ ایک ٹیلی
گرافی کا آلہ جس پر سونیاں تکی تھیں۔ اور ایک چھوٹی
سی برقی گھنٹی جس کا امیجی اس نے ذکر کیا تھا۔
میرے یقین کرنے پر کہ وہ ان ریمارکس سے
درگزر کرے گا جو میں نے دیے تھے کیوں کہ اس کا
حوصلہ زیادہ تھا جیسی کہ اس کی تربیت کی گئی ہو۔ وہ اس
پوسٹ کی ضروریات سے زیادہ تعلیم یافتہ تھا۔ میں نے
ٹھوس کیا کہ اس میں تھوڑی سی ناموزونیت ہے لیکن
وہ اتنی سمجھ ضرور رکھتا ہے جو بڑے بڑے جسموں

وہ اپنے تئیں کرنا پڑتا ہے۔
میں سمجھتا ہوں، بے شمار طویل اور تنہا وقفوں
کے درمیان اسے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہی کہہ
سکتا ہے کہ زندگی کی اس روٹین نے دراصل اس کی
زندگی کو ایک طرز عطا کر دیا تھا جس کا وہ عادی ہو چکا
ہے اس نشیب کی ٹھنڈی تہائی نے اسے ایک نئی زبان
سے آشنا کیا جسے وہ صرف منظر سے دیکھتا تھا۔ جس کی
ادائیگی کا خاص لہجہ اور تلفظ تھا جسے اس نے اپنے ناپختہ
خیالات سے خود ایجاد کیا تھا۔ اس نے کسی حد تک کسور
، اعشاریہ اور ٹھوڑا سا الجبرا پر بھی کام کیا تھا لیکن ایک
کمزور طالب علم کی طرح اعداد پر اس کی گرفت مضبوط
نہیں تھی۔
اس کے فرائض منصبی کے لیے ضروری تھا کہ وہ
اس مرطوب راہداری میں ہمیشہ رہے اور ان پتھر پٹی
دیواروں کے درمیان سے نکل کر اوپر چلتے سورج کی
روسی میں نہ جائے۔ وقت اور حالات اسے کیوں مجبور
کرتے ہیں۔ جو میں گھنٹوں میں اسے چند گھنٹے تو ایسے
سلتے ہوں گے جب وہ اس تھا کا دینے والی روٹین سے
الگ ہو سکتا ہو۔ روشن اور خوشگوار موسم میں وہ ٹھن
سے پر اس نشیب سے نکل تو سکتا ہے لیکن وہ تو سارا
وقت اس برقی گھنٹی کی پکار کا جواب دینے کے لیے خود
کو مستعد رکھتا ہے اور ایسے وقت اس کی پریشانی بڑھ
جاتی ہے۔ اسے اس سے بھی کم آسودگی حاصل ہوتی
ہوگی جتنا میں قیاس کر سکتا ہوں۔
وہ مجھے ایک بکس نما کمرے میں لے گیا۔ ایک
طرف آگ روشن تھی۔ ایک ڈیک جس پر ایک رجسٹر
رکھا تھا۔ غالباً وہ اس میں اندراج کرتا ہوگا۔ ایک ٹیلی
گرافی کا آلہ جس پر سونیاں تکی تھیں۔ اور ایک چھوٹی
سی برقی گھنٹی جس کا امیجی اس نے ذکر کیا تھا۔
میرے یقین کرنے پر کہ وہ ان ریمارکس سے
درگزر کرے گا جو میں نے دیے تھے کیوں کہ اس کا
حوصلہ زیادہ تھا جیسی کہ اس کی تربیت کی گئی ہو۔ وہ اس
پوسٹ کی ضروریات سے زیادہ تعلیم یافتہ تھا۔ میں نے
ٹھوس کیا کہ اس میں تھوڑی سی ناموزونیت ہے لیکن
وہ اتنی سمجھ ضرور رکھتا ہے جو بڑے بڑے جسموں

”صرف توجہ کے لیے نہیں جناب، میں ان خاص الفاظ کی بات کر رہا ہوں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے انہی الفاظ سے پکارا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کیوں کہ میں نے آپ کو نیچے دیکھا اور پکارا تھا۔

”کوئی اور وجہ تو نہیں، جناب۔“

”کیا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہونے کا امکان ہے؟“

”کیا آپ کو قطعی احساس نہیں کہ کسی غیر مرئی طریقے سے آپ کو یہ الفاظ بتائے گئے ہوں۔“

”نہیں، قطعی نہیں۔“

اس نے مجھے شبہ بھیر کہا اور میرے لیے اوپر جانے کا راستہ روشن کر دیا۔ میں پڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتا گیا لیکن اس خوف کے ساتھ کہ میرے پیچھے کوئی ٹرین نہ آ رہی ہو جی کہ میں نے راستہ پایا۔

چڑھتا اترنے کی نسبت آسان نہیں ہوتا تاہم گرنے یا ٹپکنے کا خدشہ کم ہو جاتا ہے۔ پھر میں بغیر کسی ایڈوچر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

پابندی وقت کے ساتھ دوسری شب میں وہاں تھا۔ میں نے دائیں بائیں مڑتے راستے پر پہلا قدم رکھا۔ دور کہیں گھڑی نے گیارہ بجائے۔ وہ شیب میں میرا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ میں سفید روشنی جمل رہی تھی۔

”آج میں نے پکارا نہیں“ میں نے کہا۔ جب میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ ”کیا اب میں آپ سے بات کر سکتا ہوں؟“

”ہر طرح سے جناب۔“

”شب بخیر یہ رہا میرا ہاتھ۔“

”شب بخیر جناب، یہ رہا میرا۔“

ہم ساتھ ساتھ چلتے اس باس تک آئے۔ اندر داخل ہو کر آگ کے قریب بیٹھ گئے۔

”میں نے اپنا ذہن بنا لیا ہے جناب۔“ بیٹھے ہی وہ میری جانب جھکا اور سرگوشی سے قدرے بلند آواز میں اس نے ابتدا کی ”کیا آپ دریافت نہیں

میں نے محسوس کیا۔ لیکن وہ وضاحت کرنے کے قابل نہیں رہا، جبکہ ہم دونوں مختلف کیفیت سے گزر رہے تھے۔

جب میں رخصت لینے کے لیے اٹھا تو کہا کہ ”آپ نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آج میں ایک انتہائی قناعت پسند شخص سے ملا ہوں۔“

میں خوفزدہ تھا اور تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ایسا صرف اسے مزید کھولنے کے لیے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ میں ایسا ہی ہوں۔“ اس نے دوبارہ گفتگو کا آغاز مدہم آواز میں کیا جیسا اس نے پہلے کیا تھا۔

”لیکن میں مشکل میں ہوں، جناب واقعتاً مشکل میں، اس کی وضاحت بہت مشکل ہے جناب، اس سلسلے میں کچھ کہنا نہایت ہی دشوار ہے، آپ جب کبھی دوبارہ آئیں گے تو میں آپ کو بتانے کی کوشش کروں گا۔“

”میں خود دوبارہ آنے کا متنی ہوں۔ بتاؤ کب رکھی جائے ملاقات۔“

”میں علی الصبح واپس جاتا ہوں اور جناب کل رات دس بجے واپس آؤں گا۔“

”میں گیارہ بجے تک آ جاؤں گا۔“

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور دروازے تک مجھے چھوڑنے آیا۔ میں آپ کے راستے پر روشنی کیے دیتا ہوں جناب، اس نے اپنے مخصوص دھمے اور عجیب لہجے میں کہا تا کہ آپ اوپر تک آسانی سے چلے جائیں۔ جب آپ راستہ پائیں تو پکارے نہیں اور جب آپ اوپر پہنچ جائیں تب بھی نہ پکاریں۔“

اس کے انداز نے میرے لیے ماحول کو مزید سرد کر دیا۔ تاہم میں نے سوائے ”بہت اچھا“ کہ اور کچھ نہیں کہا۔

جب آپ آئندہ تشریف لائیں تو بھی پکاریں نہیں۔ ایک الوداعی سوال کرنے کی اجازت دیں۔ آج شب آپ نے یہ کیوں کر پکارا ”ہیلو..... نیچے“

”خدا جانے“ میں نے کہا ”میں تو متوجہ کرنے کے لیے بس پکار دیا“

سرنگ کی سرخ روشنی میں چاروں طرف اپنے لیمپ کی سرخ روشنی سے بھی دیکھا۔ فولادی سیڑھیوں سے اوپر گھیلری تک گیا۔ پھر نیچے آیا اور واپس یہاں آ گیا۔ اپنے پوسٹ سے دونوں جانب نیلی گراف کیا اور الارم بجھوایا تاکہ معلوم کیا جائے اگر کوئی گزب ہو لیکن دونوں جانب سے یہی پیغام لوٹایا گیا کہ سب خیریت ہے۔

اب میں اپنی ریزہ کی ہڈی پر کسی بخ انگلی کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ سب کچھ، وہ ہوئی اس کی اپنی ذہنی اختراع ہو سکتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ نازک شریانیں کسی بیماری کے سبب آنکھوں کو انفعال کو قابو کر کے تصور کو نظر پر حقیقت کا روپ دے دیتی ہیں جو سر اسر دھوکا ہوتا ہے۔ بعض متاثرہ مریضوں کے ساتھ ایسا دیکھا گیا ہے کہ بیماری کے دکھ اور تکلیف کی بنا پر وہ ایسا محسوس کرتے ہیں جسے تجربے سے ثابت بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک تصوراتی سنج - میں نے بتایا جب ہم اس قدر آہستہ گفتگو کر رہے ہیں۔ اس غیر فطری وادی میں چلنے والی ہوا۔ نیلی گراف کے تاروں کو کلرا کر کسی ساز کی پیمان انگیز آواز بھی بنا سکتی ہے۔ ”یہ سب کچھ ممکن ہے۔“ کچھ دیر ہم بیٹھے سننے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ دوبارہ گفتگو میں در آیا۔ اسے یہاں چلنے والی ہوا اور تاروں کا حال پہلے سے معلوم ہونا چاہیے چونکہ وہ یہاں کی سرما کی سرد ترین اور طویل راتیں گزرا چکا ہے اکیلا یہ سب کچھ محسوس کرتا ہوا لیکن اس نے بڑے ادب سے کہا کہ ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی۔

میں نے اس سے معافی چاہی اور اس نے میرے بازو کو چھوتے ہوئے ان الفاظ کا اضافہ کیا۔ اس ہستی کے ظاہر ہونے کے چھ گھنٹے کے اندر ایک زبردست حادثہ ہوا جسے بھلا یا نہیں جاسکتا اور دس گھنٹے کے اندر لاشیں اور زخمیوں کو سرنگ کے اسی حصے سے لے جایا گیا جہاں وہ کھڑا اشارہ کر رہا تھا۔ ایک ناقابل فہم قسم کی تھر تھر ہٹ مجھ پر طاری ہو گئی۔ میں نے اس کیفیت کو کسی طور برداشت کر لیا۔

کر میں دوسرے کس مشکل میں گرفتار رہا ہوں۔ کل میں نے کسی اور کی جگہ آپ کو دیکھا اور ملاقات بھی رہی یہی میری پریشانی کا باعث ہے۔“

”کیا غلطی ہے؟“

”نہیں وہ کوئی اور ہے۔“

”کون ہے وہ۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”کیا میری طرح؟“

”مجھے خبر نہیں۔ میں نے کبھی اس کا چہرہ نہیں

دیکھا۔ بایاں ہاتھ چہرے پر ہوتا ہے اور دایاں ہاتھ ہلاتا جاتا ہے۔ شدت سے۔ اس طرح۔“

میں اس کے ہاتھ ہلانے کو غور سے دیکھتا رہا۔ ہاتھ ایک مخصوص اشارے کے طور پر تند و تیز طریقے سے نہایت جذباتی انداز میں جیسے کہنا چاہتا ہو خدا کے لیے راستہ صاف کر دو۔“

”چاند سے روشن ایک رات میں“ وہ شخص بولا

”میں یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ایک چمچنی ہوئی پکار

سنی۔ پہلو..... نیچے (کون)۔ میں نے اوپر کی جانب

دیکھنا شروع کیا۔ سرنگ کے قریب سرخ روشنی میں

کوئی کھڑا ہے اور اسی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے جیسا

میں نے آپ کو بتایا۔ آواز کرخت معلوم ہوتی تھی۔

دیکھو..... دیکھو..... پھر آواز آئی، پہلو..... نیچے

(کون) دیکھو..... میں نے اپنا لیمپ اٹھایا، اسے

سرخ روشن کیا اور پکارنے والے کی جانب لپکا۔ کیا

مسئلہ ہے؟ کیا ہوا ہے کہاں؟ وہ سرنگ کے ٹھک

اندھیرے سرے پر کھڑا تھا۔ میں حصار نظر میں لیتے

اس کی جانب بڑھا۔ ٹھک اسی لمحے وہ غائب ہو گیا۔“

”سرنگ کے اندر“ میں بولا۔

”نہیں میں خود سرنگ کے اندر دوڑا، کوئی پانچ

سو گز تقریباً پھر میں رکا اور لیمپ کو اپنے سر کے اوپر

کیے، طے کیے ہوئے فاصلے کا اندازہ کیا۔ دیکھا کہ

چھریلی دیواروں سے پانی برس رہا تھا۔ جس کے دے

دیکھے جاسکتے تھے۔ حتیٰ کہ صحت کی محراب سے بھی

قطرے ٹپک رہے تھے۔ اب اور تیزی سے باہر کی

طرف بھاگا۔ مجھے اس جگہ سے نفرت سی ہونے لگی۔

مجھ پر مترح ہو رہی تھی اور وہ بھوت جا چکا تھا۔
لیکن کچھ بھی نہیں ہوا اور نہ کچھ سامنے آیا۔
اس نے اپنی انگشت شہادت سے دو یا تین
مرتبہ میرے بازو کو چھوا لیکن اس کے انداز میں گرجوٹی
نہیں گئی۔

ٹھیک اسی دن جب ایک ٹرین سرگ سے باہر
نکلے۔ ایک کپارٹمنٹ کی میری جانب کھلتی کھڑکی میں۔
میں نے دیکھا کہ کوئی ہاتھوں اور سر کو عجیب انداز سے
حرکت دیتا مجھے کچھ اشارے کر رہا ہے۔

میں نے اسے ٹھیک اس وقت دیکھا جب
ڈرائیور کو سٹاپ دینا تھا کہ گاڑی روکے۔ اس نے
روکا اور بریک لگا دی دی لیکن گاڑی ڈیڑھ دو سو گز
گھسکتی چلی گئی۔ پہیوں کے گرد کی آواز اور چنگاری۔

میں ٹرین کے پیچھے بھاگا اور کھڑکی گاڑی کے متوازی
دوڑتا گیا۔ میں نے وحشت ناک چیخ دیکار سنی۔ ایک
کپارٹمنٹ میں ایک حسین خاتون دم توڑ گئی اور اس کی
لاش یہاں لائی گئی اور اسی جگہ ہمارے درمیان کی جگہ
پر رکھی گئی۔

غیر ارادی طور پر میں نے اپنی کرسی پیچھے
کھسائی اس جگہ پر میری نگاہ بھی جہاں اس نے اشارہ
کیا تھا۔

”سچ جناب قطعی اور ناقابل تردید سچ، جیسا
میں نے آپ کو بتایا۔ بالکل اسی طرح ہوا۔“

میں مزید کچھ سوچنے اور سوال کرنے کے قابل نہیں
رہا۔ میرا دل سٹپ ہو رہا تھا۔ ہواؤں سے بچتے ٹیلی گراف
کے تار اس نم انگیز تاثر کو دور تک لے جا رہے تھے۔

اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ اب آپ غور
کریں اور فیصلہ کریں کہ میں کسی مشکل اور تکلیف میں
ہوں۔ وہ بھوت ایک ہفتے قبل سے اب ٹھہر ٹھہر کر بار
بار وہاں ظاہر ہوتا ہے۔

”اسی روشنی میں؟“

”ہاں اسی خطرناک روشنی میں“

”وہ کیا کرتا نظر آتا ہے۔“

”وہ دہراتا ہے پہلے کے مقابلے میں ممکن حد

تک زیادہ جوش اور ولولے سے وہی حرکت دہراتا

سلسلہ خیال پھر جاری ہو گیا کہ یہ غیر معمولی قسم کا حسن اتفاق
بھی ہو سکتا لیکن غیر معمولی قسم کا بھی اتفاق اگر مسلسل ہوتو
ناقابل یقین ہو جاتا ہے لہذا اس پر غور کرنے کی ضرورت
تھی خصوصاً اس طرح کے معاملات میں۔

میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے
نقطہ نظر کو تسلیم بھی کرتا ہوں میں نے دل میں سوچا کہ وہ
میرے حسن اتفاق کی تیسوری کو آسانی سے تسلیم نہیں کرے گا
۔ ایک اعلیٰ ذہن رکھنے والا عام آدمی اپنی زندگی میں حسن
اتفاق کے لیے زیادہ گنجائش نہیں رکھتا۔

اس نے پھر التجا کی کہ ابھی اس کی بات مکمل
نہیں ہوئی۔

میں نے اس سے بار بار مداخلت کرنے کی
محذرت چاہی۔

”یہ اس نے پھر اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ کر
اپنے کان دھسے کے اوپر گہری نگاہوں سے دیکھتے
ہوئے کہا۔

”ٹھیک ایک سال قبل۔ اس حادثے کو چھ
سات مہینے گزر چکے تھے اور میں درناک واقعہ اور اس
کے شاک سے نکل آیا تھا۔ ایک روز صبح ابھی دن کا
آغاز ہو رہا تھا۔ میں نے اس بھوت کو دوبارہ دیکھا۔“
وہ ٹھہری ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے، رکا۔

”کیا اس نے نکارا تھا۔“

”نہیں وہ خاموش تھا۔“

”کیا اس نے اپنا ہاتھ بلا یا تھا۔“

”نہیں بلکہ وہ روشنی کے ٹھہبے کے سہارے

کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے اس
طرح۔“

میں نے ایک مرتبہ پھر اسے غور سے دیکھا۔ ا

س کے رویے سے دکھ اور کرب کا احساس ہو رہا تھا۔

ایسے تاثرات، مقبروں کے سنگی دیواروں پر کھدے

انسانی چروں میں پائے جاتے ہیں۔

”کیا تم اس کی طرف گئے تھے؟“

”میں اندر آ کر بیٹھ گیا۔ اپنے خیالات کو کسی

قدر جمع کیا۔ کسی قدر اس لیے کہ اس نے مجھے خوفزدہ

کر دیا تھا۔ میں دوبارہ دروازے پر گیا۔ دن کی روشنی

”ہاں وہ تھا وہاں!“

”دونوں موافقوں پر!“

اس نے تینوں سے جواب دیا ”دونوں مرتبہ!“
 ”کیا آپ میرے ساتھ دروازے تک آ سکتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہ اس وقت وہاں ہے یا نہیں۔“
 اس نے اپنا نچلا ہونٹ دبا یا جیسے وہ اس کے لیے تیار نہ ہو لیکن پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دروازہ کھولا اور بیڑھیوں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ راہداری میں کھڑا رہا۔ وہ خطرناک روشنی بدستور روشن تھی اور سرنگ کا ہولناک دہانہ بھی۔ چٹانوں سے تراشی ہوئی نم سگی دیواریں دونوں جانب ایستادہ اور ان کے اوپر آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔

”کیا تم نے اسے دیکھا؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے دریافت کیا۔ اس کی آنکھوں میں مخصوص چمک نمایاں تھی جیسے کچھ چھو جیتی ہوئی۔ لیکن یہ تاثر زیادہ گہرا نہیں تھا جتنا کہ میں تجسس تھا۔ میں نے اسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں“ اس نے جواب دیا ”وہ وہاں نہیں ہے۔“
 ”تم اب مجھ سے مشفق ہو“ میں نے پوچھا
 ہم دوبارہ اندر آ گئے اور دروازہ بند کر دیا اور انہی کرسیوں پر دوبارہ براجمان ہو گئے۔ اب میں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔

اب ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہا۔ اس نے اپنے خیالات کی پوری طرح وضاحت کر دی اور مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ اب میری پوزیشن قدرے کمزور ہو گئی ہے۔

”آپ نے اب پوری طرح سمجھ لیا ہوگا، جناب!“ اس نے کہا ”وہ کیا چیز ہے جس نے اس قدر خوفناک طریقے سے مجھے پریشان کیا ہوا ہے۔ یہی وہ سوال ہے کہ وہ بھوت کیا چاہتا ہے؟“

میں سمجھتا ہوں کہ شاید پوری بات ابھی میرے ادراک میں نہیں آئی۔ میں نے اسے بتایا

اس کا انتہاء کس کے خلاف ہے؟

زیادہ تر آنکھیں آگ پر جمائے اور گاہے

ہے جس کا مفہوم میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ خدا کے لیے ہٹ جاؤ، راستہ صاف کر دو۔“

وہ پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مجھے کوئی راحت اور سکون نہیں ہوتا۔ کئی منٹوں تک اس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔

ہیلو..... دیکھو..... دیکھو..... وہ کھڑے ہو کر مجھے اشارے کرتا ہے لیکن چہرہ چھپائے ہوئے۔ اسی کے ساتھ میری چھوٹی ٹھنڈی بخا رہتی ہے۔

میں نے بھی ٹھنڈی بجتنے والی بات محسوس کی ہے۔ کیا کل شام بھی جب میں تمہارے ساتھ بیٹھا تھا، یہ ٹھنڈی جی ٹھی اور تم دروازے تک کسی کو دیکھنے گئے تھے۔“

”جی ہاں، دو مرتبہ!“

اب دیکھو میں نے اسے سمجھایا۔ کس طرح تمہارا تصور، تمہارے خیالات تمہیں دھوکا دے رہے ہیں۔ میری آنکھیں ٹھنڈی پر جمی ہوئی تھیں اور میرے کان اس کی آواز سننے کے لیے مستعد اور اگر میں جیتا جاگتا، تمام حیات سے آراستہ انسان ہوں تو میں چہمیں بتاؤں کہ دونوں موافقوں پر ٹھنڈی نہیں جی اور نہ میں نے سنی۔ وہ صرف اس وقت بجتی ہے جب تم سے رابطہ رکھنے والے اسے بجاتے ہیں اور یہ طبیعیات کے قدرتی اصولوں کے تحت بجتی ہے۔ نہ کسی اور وقت کسی اور طرح سے بجتی ہے۔

اس نے اپنے سر کو جھکا دیا اور بتایا کہ اس نے بھوت کی بجائی ہوئی ٹھنڈی کو شناخت کرنے میں کبھی غلطی نہیں کی۔ مجھے اس میں کوئی مغالطہ بھی نہیں کہ میں انسانوں کی بجائی ٹھنڈی اور اس بھوت کی بجائی ٹھنڈی میں امتیاز نہ کر سکوں۔ بھوت جب ٹھنڈی بجاتا ہے تو اس کی تھر تھراہٹ مخصوص قسم کی ہوتی ہے جو کسی اور طبیعی طریقے سے پیدا نہیں کی جاسکتی۔ میں یہ بھی دعویٰ نہیں کرتا کہ آنکھیں ٹھنڈی کو ان خاص موافقوں پر ہلتا ہوا دیکھتی ہیں اور مجھے اس بات پر بھی حیرت نہیں کہ آپ نے نہیں سنا لیکن میں نے سنا ہے۔

”اور جب تم نے باہر جھانکا تو کیا وہ بھوت وہاں موجود تھا؟“

بھی روکا جاسکتا تھا۔ اگر وہ دوسرے حادثے سے قبل صرف مجھے یہ بتانے آیا تھا کہ اس کی تشبیہ بالکل سچی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب وہ مجھے تیسرے کے لیے تیار کر رہا ہے وہ سب کچھ مجھے غیر مبہم طریقے سے بتا کیوں نہیں دیتا۔ میں کیا کروں۔ اسے خداوند مری مدد فرما۔ ایک بے اختیار سگنل مین اس دور دراز تہا پوسٹ پر کیا کر سکتا ہے۔ وہ کسی ایسے شخص کو متنبہ کیوں نہیں کرتا جو اس پر یقین کرے اور سد باب کی طاقت بھی رکھتا ہو۔

جب میں نے اسے اس حال میں دیکھا۔ لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ اس مسکین شخص کے لیے اور عام لوگوں کی حفاظت کے پیش نظر اس وقت مجھے حالات کے مطابق بات کرنا چاہیے تاکہ اس کا ذہن مزید پرانہ نہ ہو۔ لہذا ایسے تمام سوالات جن کا تعلق حقائق سے ہو یا خیالی ہوں انہیں پرے کرتے اس کے سامنے ایک فرض شناس شخص کی ذمے داریاں بتائیں کہ اسے اپنا کام بہترین طریقے سے انجام دینا چاہیے اور اس کے لیے آسانی تھی کہ وہ پہلے ہی سے اپنا فرض سے مکمل آگاہ ہے۔ اگرچہ وہ اس چکر اپنے والی ہستی کے بار بار ظاہر ہونے کو پوری طرح سمجھ نہیں پارہا ہے۔ اس کوشش میں میں اچھا خاصا کامیاب رہا کہ اسے اس کے طرز فکر سے باہر لانے کی کوشش کروں۔ اب وہ پرسکون ہو چکا تھا۔ اس پوسٹ پر اس کی پیشہ ورانہ ذمے داری بھلتی رات کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگتی تھی اور اس سے مزید توجہ کا تقاضا کرتی تھی۔ میں نے اس کے پاس رات بھر نہ سونے کی پیش کش کی جو اس نے اس نے سنی ان سنی کر دی۔ میں اسے راستے پر بلندی کی سمت جا رہا تھا تو الٹ کر سرخ روشنی بر نظر ڈالی۔ اب مجھے بھی اس سرخ روشنی سے نفرت ہوئی تھی۔ اس رات میں چین کی نیند نہیں سوسکا جیسے وہ سرخ روشنی میرے بستر کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔

میں ان دو حادثات کو پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا۔ خصوصاً اس نوجوان لڑکی کی موت کو۔ میرے پاس کسی بھی طرح کوئی جواز نہیں کہ میں ان حادثات کی پردہ

میری طرف دیکھتے وہ غور و فکر میں منہمک رہا۔ اور بولا ”خطرہ ہے کیا؟ اور خطرہ ہے کہاں؟ وہ خطرہ مطلق ہے ان پٹریوں پر، کوئی بڑی تباہی آنے والی ہے۔ تیسری مرتبہ مجھے اس کے ہونے کا یقین ہے چونکہ دوسرے تباہی اس سے قبل ہو چکا ہے لیکن یہ سب میرے لیے ایک ظالمانہ وحشت ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

اس نے جیب سے رومال نکال کر پیشانی پر آنے والے پسینے کے قطرے پونچھ ڈالے۔ اگر میں اپنے پوسٹ سے کسی طرف یا دونوں جانب خطرے کا سگنل بھیجوں تو میں اس کی کوئی توجیہ نہیں دے سکوں گا۔ اس دوران میں وہ اپنی تھیلیوں کو آپس میں رگڑتا رہا۔ اس طرح میں خود کو مشکل میں ڈال لوں گا۔ اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا وہ مجھے پاگل قرار دے سکتے ہیں۔

ہمارے پاس کام اس طرح ہوتا ہے۔
پیغام..... خطرہ..... احتیاط برتی جائے۔
جواب‘ خطرہ کیا ہے؟ اور کہاں!
پیغام‘ میں نہیں جانتا لیکن خدا کے لیے احتیاط بہتر ہے۔

وہ مجھے درخواست کر دیں گے۔
اس کے علاوہ وہ کبھی کیا سکتے ہیں۔
اس کا ذہنی انتشار میرے لیے قابل رحم ہے
ایک حساس آدمی کے لیے اذیت کا باعث۔ اس کی برداشت سے بڑھ کر کیوں کہ وہ ایک ذمے دار اور فرض شناس ملازم ہے۔

”جب وہ پہلی مرتبہ خطرناک سرخ روشنی میں ظاہر ہوا“ وہ بولنا گیا۔ پیشانی پر جمولنے والے بالوں کو اٹھتے ہوئے۔ اپنے ہاتھوں کو اپنی کنپٹیوں پر شدت بے حالی سے دباتے ہوئے ”وہ کیوں مجھے بتائیں دیتا کہ حادثہ کہاں ہونے والا ہے اور اگر یہ ناگزیر ہے تو وہ طریقہ کیوں نہیں بتاتا جس کے ذریعے اس حادثے کو روکا جاسکتا ہو۔

”دوسری مرتبہ جب وہ ظاہر ہوا“ اس نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ بجائے اس کے اس نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ وہ مرنے والی ہے۔ اس خاتون کو گھر پر

غزل

اب آرزوئے عشق کا حاصل نہیں رہا
لیلا جتجو کا وہ محمل نہیں رہا
صحرائے حزن و یاس میں بسکا وہ قافلہ
جس قافلے میں رہبر منزل نہیں رہا

آلام و مشکلات میں گرچہ اسیر تھا
”لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا“
طوفان کی تلاش تھی ساحل تھا رو برو
ساحل کی سمت آئے تو ساحل نہیں رہا
شب ہائے غم میں آنسو بہائے تھے جو کبھی
ان آنسوؤں کا اب کوئی حاصل نہیں رہا

ساحل کو بھی ڈبو کے رہی موج اٹک غم
طوفان اٹک و آہ کا حاصل نہیں رہا
بیابان یہ مشاہدہ چشم شوق ہے
حق کو ملا مقام تو باطل نہیں رہا

بشیر بیتاب

پوشی کروں۔

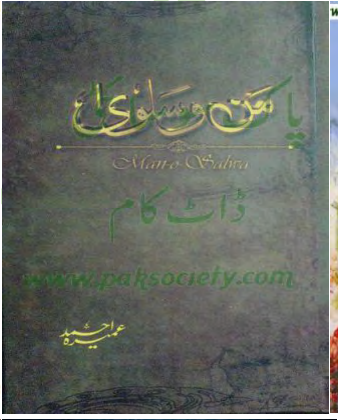
نہیں جو سوچ میرے دماغ میں گردش کر رہی
تھی کہ مجھے جواب میں کیا کرنا چاہیے کیوں کہ اب
میں ان تمام معلومات کا حامل تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ
وہ سکتل میں ذہن، ہوشیار، درد مند اور فرائض کی
ادائیگی میں نہایت مستعد۔ لیکن اس ذہنی کرب میں وہ
کب تک ایسا رہ پائے گا۔ ابھی تک اس کے
کاندھوں پر بڑی بھاری امانت ہے۔ کیا میں اپنی
زندگی خطرے میں ڈال کر اس کا ساتھ دوں کہ وہ اپنی
ڈیوٹی بدرجہ اتم ادا کر سکے۔

میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے احساسات
کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو رہا کیوں کہ میرے
اظہار میں کوئی منافقت موجود تھی کہ مپنی کے ذمے
داروں کو اس نے یہ سب کچھ بتایا۔ اول انہوں نے
تمام معاملات کو زیادہ سیریس نہیں لیا بلکہ اسے درمیانی
راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہذا میں نے اسے کسی
مناسب ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی پیش کش کی
تاکہ تمام تفصیل بتا کر اس کی رائے لی جائے۔ کہ یہ
سب کچھ کیا ہے۔ اس کی ڈیوٹی میں آئندہ مثبت
تبدیلی ہوتی تھی۔ اس نے میرا مشورہ قبول کر لیا۔ اب
اسے ایک یاد دہکنے کی فرصت طلوع صبح کے وقت اور
ایسا ہی شام کو ملے گی۔ میں نے اسی پروگرام کے
مطابق دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔

دوسری شام ایک سہانی شام تھی۔ اس کا لطف
اٹھانے میں گھر سے جلدی نکل پڑا۔ ابھی سورج نشیب
میں نہیں اترتا تھا۔ میں میدانی راستے کو قطع کرتے
ہوئے گھر سے کٹاؤ کے اوپر پہنچ گیا میں نے اپنی چہل
قدی کو مزید ایک گھنٹے طول دینے کا فیصلہ کیا کہ آدھا
گھنٹہ جانے میں اور مزید آدھا گھنٹہ واپس آنے میں
اور پھر وقت ہو جائے گا کہ میں سکتل مین کے باکس
تک جا سکوں۔

میں اپنی چال کو تیز کیے بنا اس پہاڑی کٹاؤ
کے کنارے تک آیا اور میکانگی انداز سے پیچھے نگاہ ڈالی
۔ میں اس سنسنی کو بیان نہیں کر سکتا جس نے مجھے اپنی
گرفت میں لے لیا۔ سرنگ کے دہانے کے قریب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اسے ایک انجن نے دو ٹکڑے کر دیا، جناب! پورے انگلینڈ میں اس کام کو اس سے بہتر جاننے والا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ بہر حال اس نے باہر جانی ریل کی پٹریوں کو کلیئر نہیں کیا۔ یہ دن کی مکمل روشنی میں ہوا۔ اس نے لمبے روشن کیا ہوا تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ جیسے ہی انجن سرنگ سے باہر آیا۔ اس کی پشت انجن کی جانب تھی جس نے اسے کاٹ ڈالا۔ ڈرائیور چلا یا تھا۔ اس نے بتایا یہ سب بتایا کیسے ہو نام محترم کو دوبارہ بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟“

وہ شخص گہرے رنگ کا سیاہی مائل یونیفارم پہنا ہوا تھا۔ اپنی جگہ پر وہ سرنگ کے دہانے کی جانب پیچھے کو ہولیا۔ ”سرنگ کے اندر بیٹھو ٹریک پر چلنے ہوئے“ اس نے بتایا ”جناب! میں نے اسے دہانے پر دیکھا۔ میں اسے واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اپنی اسپینڈ چیک کرنے کا وقت طبعی نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سگنل میں نہایت محتاط ہوا کرتا ہے جبکہ میں نے محسوس کیا کہ وہ سیٹی کی آواز پر دھیان نہیں دے رہا۔ میں نے سیٹی بند کر کے اس کے قریب ہوتے ہوئے اسے پکارا جتنی زور سے پکار سکتا تھا۔

”تم نے کیا کہا؟“

میں نے کہا ”وہاں نیچے، دیکھو..... دیکھو..... خدا کے لیے راستہ گلیسر کر دو۔“

آہ وہ ایک وحشت ناک وقت تھا۔ میں نے اسے پکارنا بند نہیں کیا۔ میں نے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا تاکہ جو ہونے جا رہا ہے اسے دیکھ نہ سکوں اور دوسرا ہاتھ لہراتا رہا آخر تک۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اس بیان کو اس مخصوص وقوع پر آپ جیسے چاہیں چسپاں کریں لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کیا یہ حسن اتفاق ہے کہ جس قسم کی تہنید انجن ڈرائیور نے کی اور جو اشارے کیے۔ نہ صرف الفاظ بلکہ حرکات بھی بھیہنہ وہی تھے جو اس بد نصیب سگنل میں کو دکھائے جاتے رہے اور وہ اس سے پریشان ہوتا رہا لیکن اس کے یا میرے گمان تک میں نہ تھا کہ وہ بے چارہ خود شکار ہونے والا ہے۔

☆☆☆.....☆☆☆

میں نے ایک ہولی دیکھا جس کا باباں آستین آنکھوں کو ڈھانپنے ہوئے اور دائیں ہاتھ کو زور زور سے ہلاتا تھا۔

ایک بے نام خوف جو مجھ پر طاری ہوا تھا ایک لمحے میں زائل ہو گیا۔ جب میں نے اس ہولی کو ایک زندہ شخص کے قالب میں دیکھا اور چند لوگوں کو اس کے قریب جھکھا لگائے پایا جنہیں وہ شخص نفل اتارتے بتا رہا تھا کہ اس نے کیا دیکھا۔ وہ خطرناک سرخ روشنی ابھی جلی نہیں تھی اور اس کے سبب کے ساتھ ایک زمین سے لگی چھوٹی چھوٹی چیز تھی۔ یہ میرے لیے بالکل نئی چیز تھی جسے چند لمحوں اور تڑپال سے بنایا گیا تھا جو ایک بستر سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔

ایک ناگزیر دکھ کا احساس کہ کچھ ہو چکا ہے۔ ایک خود ملتا سستی خوف نے مجھے گھیر لیا کہ اس شخص کے ساتھ کوئی جان لیوا حادثہ ہو چکا ہے جسے میں یہاں کل چھوڑ گیا تھا۔ پچھتاوے کا شدید احساس کہ کیا کسی کو سببج کر اس حادثے کو روکا جا سکتا تھا یا کم از کم اس کی اصلاح کی جا سکتی تھی۔ میں اس اوپر دکھاؤ راستے پر تیزی سے جتنا میں بھاگ سکتا تھا نشیب میں اترتا گیا۔

”کیا معاملہ ہے؟“ میں نے لوگوں سے دریافت کیا۔

”آج صبح سگنل میں مارا گیا، جناب۔“

”وہ شخص تو نہیں جو اس باکس میں رہتا تھا۔“

”جی ہاں، جناب!“

”آپ اسے پہچان لیں گے اگر آپ اسے جانتے ہیں“ اس شخص نے کہا جو دوسروں کا ترجمان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے احترا ماسر سے ٹوٹی اتاری اور تریال کا ایک کونسا رکایا۔ اف میرے خدایا! اس کا چہرہ مکمل تھا۔ آپ اس کرب کا ادراک کر سکتے ہیں کہ گزشتہ شام جس شخص کے ساتھ گزاری اسے اب ایک لاش تسلیم کریں برداشت کرنا پڑتا ہے۔

”یہ کیسے ہوا؟ یہ کیسے ہوا؟“ میں ایک ایک شخص سے یہ سوال پوچھتا رہا۔ اس دوران میں تڑپال دوبارہ ڈھک دیا گیا۔